محبت کے افسانے

خلیل جبران

ناشر: تخلیقات لاہور

اہتمام: لیاقت علی

ٹائٹل:

کمپوزنگ: آئیڈیل لیزر کمپوزنگ' 7120809

سن اشاعت: ۱۰ اپریل ۱۹۹۹ء

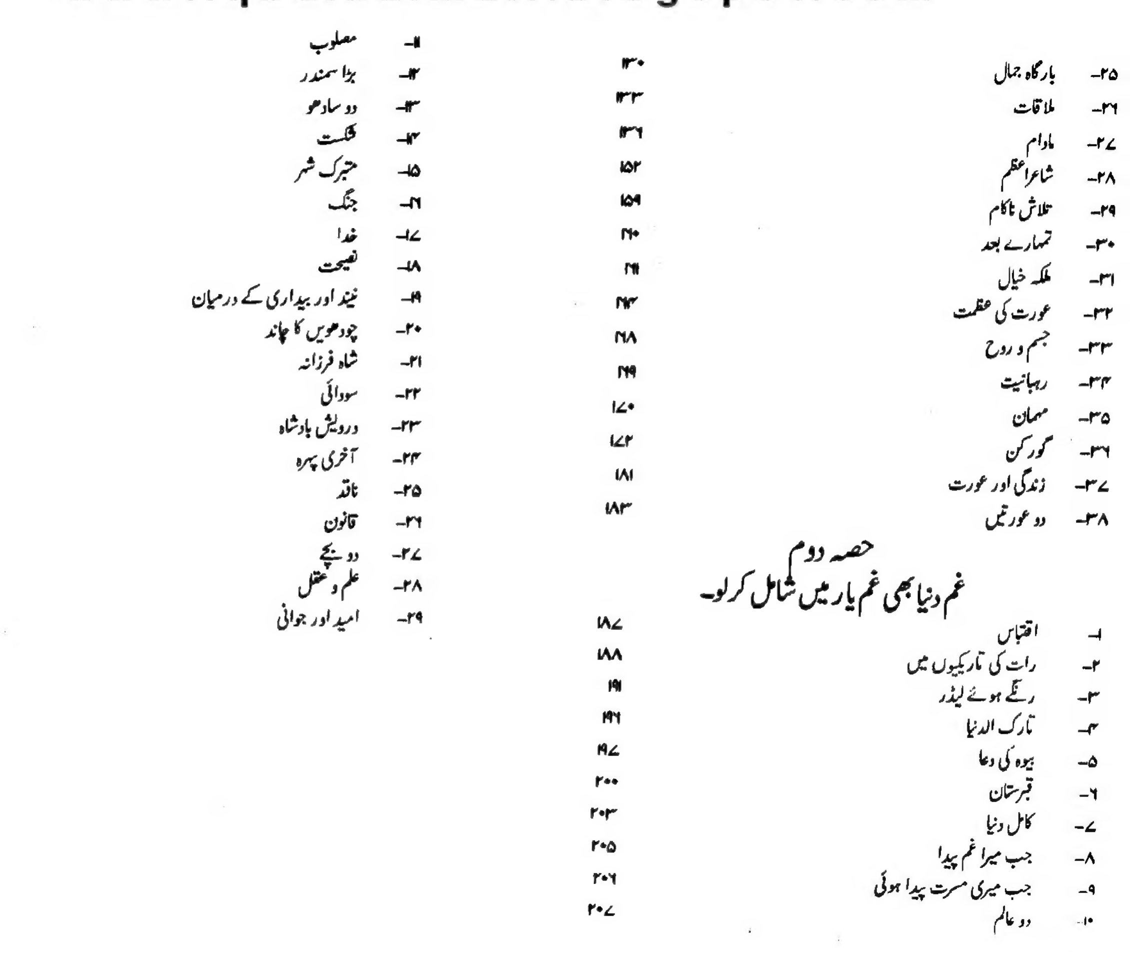
پرنٹرز: حاجی حنیف پرنٹرز' لاہور

قیمت: 120 روپے

فہرست

حصہ اول

۱۔ محبت ۷
۲۔ محبت ۱۲
۳۔ اپنی محبت سے ۱۷
۴۔ محبوبہ ۱۹
۵۔ پریم گیت ۲۲
۶۔ بنام می زیادہ ۲۳
۷۔ جل پریاں ۳۲
۸۔ ریحانہ ۳۵
۹۔ حیات محبت ۴۹
۱۰۔ اے ساحرہ ۵۴
۱۱۔ کنواری کی کہانی ۵۶
۱۲۔ دلہن کی سیج ۵۹
۱۳۔ زہراب ۷۱
۱۴۔ جوانی اور محبت ۷۷
۱۵۔ پردے کے پیچھے ۸۰
۱۶۔ میلے میں ۸۴
۱۷۔ موسیقی ۸۶
۱۸۔ زمانے کی راکھ ۸۹
۱۹۔ پرچھائیں ۱۰۲
۲۰۔ پرچھائیاں ۱۱۵
۲۱۔ دوست ۱۱۸
۲۲۔ جب طوفان گزر گیا ۱۲۰
۲۳۔ اسرار حیات ۱۲۲
۲۴۔ رفیقہ حیات ۱۲۷



۲۵- بارگاہ جمال ۱۳۰
۲۶- ملاقات ۱۳۳
۲۷- مادام ۱۳۶
۲۸- شاعر اعظم ۱۵۲
۲۹- تلاش ناکام ۱۵۹
۳۰- تمہارے بعد ۱۶۰
۳۱- ملکۂ خیال ۱۶۱
۳۲- عورت کی عظمت ۱۶۳
۳۳- جسم و روح ۱۶۸
۳۴- رہبانیت ۱۶۹
۳۵- مہمان ۱۷۰
۳۶- گورکن ۱۷۲
۳۷- زندگی اور عورت ۱۸۱
۳۸- دو عورتیں ۱۸۳

حصہ دوم

غم دنیا بھی غم یار میں شامل کرلو۔

۱- اقتباس ۱۸۷
۲- رات کی تاریکیوں میں ۱۸۸
۳- رنگے ہوئے لیڈر ۱۹۱
۴- تارک الدنیا ۱۹۶
۵- بیوہ کی دعا ۱۹۷
۶- قبرستان ۲۰۰
۷- کامل دنیا ۲۰۳
۸- جب میرا غم پیدا ۲۰۵
۹- جب میری مسرت پیدا ہوئی ۲۰۶
۱۰- دو عالم ۲۰۷
۱۱- مصلوب ۲۰۸
۱۲- بڑا سمندر ۲۱۰
۱۳- دو سادھو ۲۱۲
۱۴- شکست ۲۱۳
۱۵- متبرک شہر ۲۱۵
۱۶- جنگ ۲۱۷
۱۷- خدا ۲۱۸
۱۸- نصیحت ۲۲۰
۱۹- نیند اور بیداری کے درمیان ۲۲۵
۲۰- چودھویں کا چاند ۲۲۸
۲۱- شاہ فرزانہ ۲۲۹
۲۲- سودائی ۲۳۱
۲۳- درویش بادشاہ ۲۳۲
۲۴- آخری پہرہ ۲۳۵
۲۵- ناقد ۲۵۱
۲۶- قانون ۲۵۲
۲۷- دو بچے ۲۵۴
۲۸- علم و عقل ۲۵۷
۲۹- امید اور جوانی ۲۶۰

محبت

میں نے اپنے ہونٹوں کو مقدس آگ میں دھو کر منزہ کیا' کہ محبت کے اسرار منکشف کر سکوں' لیکن جب میں نے کچھ کہنے کے لئے لب کھولے تو الفاظ نہ جانے کہاں کھو گئے ----؟

جب میں محبت سے آشنا ہوا تو الفاظ مدھم سانسوں میں تحلیل ہو گئے اور نغمۂ دل' آغوش سکوت میں سو گیا!

تم مجھ سے محبت کے متعلق جاننا چاہتے ہو----؟ تم وہی ہو نا جنہیں میں محبت کے اسرار و رموز سمجھاتا تھا اور جو میری آواز پر لبیک کہتے تھے! آج تم پھر مجھ سے سمجھے ہوئے حقائق' ایک بار پھر جاننا چاہتے ہو؟

اب کہ محبت نے مجھے اپنے لبادے میں چھپا لیا ہے' میں تمہارے پاس آیا ہوں' براہ کرم مجھے درجات محبت اور آداب محبت سے آگاہ کرو! میں طریق محبت کا متلاشی ہوں' مجھے راہ محبت کی جستجو ہے!

تم میں سے کون ہے جو میرے استفسارات کو ملبوس جواب سے آراستہ کرے؟ مجھے میری ذات کا عرفان بخشے---- اور کون ہے جو مجھے میری "انا" کا شعور ودیعت کرے؟

کون ہے جو میری ذات کو مجھ پہ فاش کرے! اور کون ہے جو میرے نفس کو میرے نفس کی آگہی سے سرفراز کرے؟

تمہیں محبت کا واسطہ' مجھے بتاؤ تو سہی کہ وہ شعلہ سا کیا ہے جو میرے خرمن دل کو جلائے دے رہا ہے اور جس نے میرے ارادے اور توانائیوں کو پگھلا کے رکھ دیا ہے----؟

یہ کومل اور مخفی مگر سخت گیر ہاتھ کس کے ہیں جنہوں نے میرے نفس کو نچوڑ کے رکھ دیا ہے----؟

اور یہ کیسا مشروب ہے جو تلخ آمیز لذت اور حلاوت بھرے کرب سے تیار کیا گیا ہے' اور جو میرے رگ و پے میں نفوذ کر گیا ہے؟

مجھے بتاؤ' یہ کس کے پر ہیں جو شب کی خاموشی میں میرے بستر کے گرد پھڑپھڑاتے ہیں——؟

اور میں جاگ اٹھتا ہوں!

انتظار کرتے ہوئے اس شے کا' جسے میں نہیں جانتا!

ہمہ تن گوش اس آواز پر' جو سماعت سے ماورا ہے!

نظریں جمائے اس وجود پر' جو بصارت سے ماورا ہے!

غور کرتے ہوئے اس شے پر' جو میرے لئے ناقابل فہم ہے!

اور محسوس کرتے ہوئے اس چیز کو' جو ماورائے ادراک ہے!

میری آہ و کراہ میں ایسی لذت غم پوشیدہ ہے جو قہقہوں کی بازگشت سے زیادہ مسرور کن اور عیش و نشاط کے ہنگاموں سے کہیں زیادہ دل فریب ہے!

میں ایک انجانی قوت کے سامنے کیوں سرنگوں ہو گیا ہوں جو مجھے مارتی ہے اور جلاتی ہے—— جلاتی ہے اور مارتی ہے—— حتیٰ کہ عروس سحر گھونگھٹ اٹھا کے مسکرانے لگتی ہے! اور میرے وجود کا گوشہ گوشہ اجالے میں ڈوب جاتا ہے۔ بیداری کی پرچھائیاں میری آتشیں پلکوں پر لرزنے لگتی ہیں اور خوابوں کے سائے میرے حجری بستر پر لہرانے لگتے ہیں——!

○

وہ شے کیا ہے' جسے ہم محبت کہتے ہیں——؟

مجھے بتاؤ تو سہی کہ وہ سربستہ راز کیا ہے' جو زمانے کے پردوں میں پوشیدہ اور ان مرئیات کے سینے میں بند ہے جو ضمیر وجود میں آسودہ ہیں اور یہ شعور کیا ہے——؟ جو بیک وقت علت بھی ہے اور نتیجہ بھی؟——

آغاز بھی ہے اور انجام بھی!——

اور یہ شب بیداری کیا ہے جو حیات و ممات کے خمیر سے ایک خواب کی تخلیق کرتی ہے جو حیات سے عجیب تر اور موت سے عمیق تر ہوتا ہے؟

مجھے بتاؤ تو ذرا اے رفیقان من! کہ تم میں کوئی ایسا بھی ہے' جو اس وقت بھی زندگی کے خواب گراں سے بیدار نہیں ہوتا کہ جب محبت اس کے نفس کو اپنے مقدس ہاتھوں کی کومل پوروں سے چھوتی اور اس کی سماعت میں اپنی آواز کا رس گھولتی ہے——؟

تم میں کوئی ہے جو اس وقت بھی اپنے والدین سے جدا نہیں ہوتا کہ جب اسے کوئی دوشیزہ محبت بھرے لہجے میں پکارتی ہے وہ دوشیزہ کہ جس سے اسے والہانہ عشق ہوتا ہے؟

تم میں کوئی ہے جو بیکراں سمندروں کو عبور نہیں کرتا' صحراؤں کی ریت نہیں چھانتا' اور فلک بوس چوٹیوں پر قدم نہیں رکھتا' اس دوشیزہ کے وصال کے آرزو میں' کہ جسے اس کی روح نے پرستش کے لئے منتخب کیا ہو؟

وہ کون سا نوجوان ہے جو اپنی محبوبہ کے لئے' زمین کی نہاتوں تک نہیں جاتا؟ وہ محبوبہ' کہ جس کے لہجے کی حلاوت' سانسوں کی خوشبو' اور کومل ہاتھوں کے لمس سے اس کی روح پر ایک وجدانی سکر طاری ہو گیا ہو——؟

وہ کون سا انسان ہے جو اپنے معبود حقیقی کے سامنے' اس معبود کے سامنے کہ جو سمیع المناجات اور مجیب الدعوات ہے' اپنے نفس کو عود و لوبان کی طرح نہیں سلگاتا؟

○

کل میں ہیکل کے دروازے پر کھڑا' آنے جانے والوں سے محبت کے اسرار و محاسن کے متعلق استفسار کر رہا تھا۔

ایک ادھیڑ عمر شخص میرے قریب سے گزرا۔ اس کا جسم نحیف و ناتواں اور چہرہ مغموم و محزون تھا' کرب آمیز آواز میں اس نے کہا۔

"محبت فطری کمزوری ہے' جو ہمیں آدمؑ سے ورثے میں ملی ہے——"

پھر ایک نوجوان گزرا' جس کا جسم مضبوط اور بازو توانا تھے' مترنم لہجہ میں اس نے کہا:

"محبت ایک ارادہ ہے جو ہمارے حال کو ماضی اور مستقبل سے ہم آہنگ کرتا ہے۔"

پھر ایک عورت گزری' جس کا چہرہ غم کی دھول سے اٹا ہوا' اور سانسیں درد میں بسی ہوئی تھیں' سرد آہ بھرتے ہوئے اس نے کہا۔

محبت زہر ہلاہل ہے' جو جنسی ناگوں کی پھنکار سے اڑتا اور فضا میں منتشر ہو کر' شبنم کے قطروں کے ساتھ مل کر زمین پر گرتا ہے' تشنہ کام روحیں اسے سڑک جاتی ہیں اور کچھ دیر کے لئے ان پر ایک خمار سا طاری ہو جاتا ہے۔ پھر ایک سال کے لئے ان کا نشہ اتر جاتا ہے اور اس کے بعد وہ ہمیشہ کے لئے آغوش فنا میں سو جاتی ہیں——"

پھر ایک گل عذار دوشیزہ گزری' اس نے متبسم لہجہ میں کہا:

"محبت بادۂ کوثر ہے جسے عروسان سحر قوی انسانوں کے دلوں میں انڈیلتی اور انہیں اس قابل بناتی ہیں کہ وہ نجوم شب کے روبرو عزو شرف اور معراج حاصل کریں' اور خورشید سحر کے سامنے مترنم آواز میں حمد و تقدیس کے گیت گائیں!"

اس کے بعد ایک سیاہ پوش اور دراز ریش مرد گزرا' کرخت لہجہ میں اس نے کہا۔

"محبت اندھی جہالت ہے' جو ابتدائے شباب کے ساتھ شروع ہوتی اور نہایت شباب کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے۔"

پھر ایک اور مرد گزرا' جس کا چہرہ روشن اور پیشانی کشادہ تھی' مسرت بھرے لہجے میں اس نے کہا:

"محبت ایک الوہی معرفت ہے—— اشرف و افضل معرفت' جو ہماری بصیرت کو روشن کر دیتی ہے اور کائنات ہمیں اس رنگ میں نظر آنے لگتی ہے جس رنگ میں دیوتا اسے دیکھتے ہیں——"

پھر ایک کور چشم نے اشک بار آنکھوں اور لرزیدہ آواز میں کہا۔

"محبت کہرے کا ایک غلاف ہے جو ہمارے ذہن کو چاروں طرف سے محصور کر لیتی اور شواہد ہستی کو اس سے چھپا دیتی ہے۔ اس کی تاثیر سے ہمارا ذہن اپنے میلانات کی پرچھائیوں کے سوا' جو چٹانوں کے درمیان لرزاں ہوتی ہیں' کچھ دیکھ سکتا ہے اور نہ ان فریادوں کی بازگشت کے سوا کچھ سن سکتا ہے۔ جنہیں وادی کی فضائیں دہراتی ہیں——"

پھر ایک نوجوان کہ جس کے ہاتھوں میں رباب تھا' نغمہ ریز آواز میں اس نے کہا۔

"محبت جادو کی ایک کرن ہے' جو حساس ذات کی گہرائیوں سے پھوٹتی اور اس کے گرد و پیش کو منور کر دیتی ہے۔ اس روشنی میں کائنات ایک شان دار جلوس کی شکل میں دکھائی دیتی ہے جو سرسبز و شاداب باغوں میں سے گزر رہا ہو' اور زندگی ایک حسین خواب معلوم ہوتی ہے جو دو بیداریوں کے درمیان رواں دواں ہو——!"

پھر ایک خمیدہ کمر بوڑھا گزرا' جس نے لرزیدہ آواز میں کہا:

"محبت قبر کے سکون میں ہمارے جسم کی راحت ہے اور ابدیت کی گہرائیوں میں ہمارے نفس کی سلامتی!"

پھر ایک پنجسالہ طفل گزرا' ہنستے ہوئے اس نے کہا:

"محبت میرا باپ ہے' محبت میری ماں ہے' میں اپنے باپ اور اپنی ماں کے سوا کسی محبت کو نہیں جانتا——"

اور اس طرح' جو بھی گزرا' ہر ایک نے اپنی اپنی تمناؤں' حسرتوں اور محرومیوں کو محبت کے رنگ میں پیش کیا اور محبت بدستور اسرار کے غیر مرئی پردوں میں چھپی رہی!

تب میں نے ایک آواز سنی جو معبد کے سینے سے پھوٹ رہی تھی:

"زندگی کے دو حصے ہیں—— ایک انجماد و سکون کا' اور دوسرا سوزش و اضطراب کا۔

اور محبت' سوزش و اضطراب کا دوسرا نام ہے——"

میں اس وقت معبد میں داخل ہوا اور سجدے میں گر کے دعا کرنے لگا۔ اس طرح کہ دل محبت سے سرشار اور روح مسرت سے معمور تھی۔ میں نے کہا۔

اے رب ذوالجلال! مجھے عشق کے دہکتے ہوئے شعلوں میں پھینک دے اور میری روح کو مقدس آگ کا نوالہ بنا دے' آمین!

محبت

نہر کے کنارے، اخروٹ اور بید مشک کے درختوں کی چھاؤں تلے ایک غریب کسان کا لڑکا بیٹھا، بہتے پانی کو نہایت سکون و خاموشی سے دیکھ رہا تھا۔ یہ نوجوان کھیتوں میں پروان چڑھا تھا، جہاں ہر چیز محبت کی کہانی سناتی ہے، جہاں شاخیں آپس میں گلے ملتی ہیں، جہاں نسیم بہار پھولوں سے آنکھ مچولی کھیلتی ہے، جہاں پرندے الفت کے گیت گاتے ہیں، اور جہاں فطرت ——— اپنی تمام نظر فریبیوں کے ساتھ ——— روحانیت کی تلقین کرتی ہے۔

اس بیس سالہ نوجوان نے کل ایک دوشیزہ کو چشمہ کے کنارے، حسین لڑکیوں کے جھرمٹ میں دیکھا اور عاشق ہو گیا، لیکن جب اسے یہ معلوم ہوا کہ وہ بادشاہ کی لڑکی ہے تو اس نے اپنے دل کو ملامت کی اور اپنی روح سے خود اس کی شکایت۔ مگر بے سود! ملامت دل کو محبت سے باز رکھ سکتی ہے، نہ شکایت روح کو حقیقت سے ہٹا سکتی ہے۔ انسان اپنے دل اور روح کے درمیان، اس نرم و نازک شاخ کی مثال ہے، جو شمالی اور جنوبی ہواؤں کی زد میں ہو!

نوجوان نے نگاہ اٹھائی۔ بنفشہ کے پھول، بابونہ کے پھولوں کے ہم پہلو اگے ہوئے تھے، اور بلبل، قمری سے سرگوشیاں کر رہی تھی۔ اسے اپنی تنہائی پر رونا آگیا، محبت کی گھڑیاں اس کی نگاہوں کے سامنے سے پرچھائیوں کی طرح گزر گئیں۔ اس نے کہا ——— الفاظ اور آنسوؤں کے ساتھ اس کے جذبات بھی رواں تھے:

"یہ محبت ہی ہے، جو میرا مذاق اڑاتی ہے! دیکھو! وہ مجھے بے وقوف بنا کر اس جگہ لے آئی ہے، جہاں آرزوئیں عیب سمجھی جاتی ہیں اور تمنائیں ذلت!!!

محبت نے ——— جس کا میں پجاری ہوں ——— میرے دل کو تو شاہی محل میں اچھال پھینکا اور میری زندگی کو ایک غریب کسان کی پست و زبوں جھونپڑی میں دھکیل دیا۔

آہ! اس نے میری روح کو اس پری وش کے حسن کا اسیر کر دیا، جسے لوگ ہر وقت گھیرے رہتے ہیں اور اقتدار اعلیٰ جس کی حفاظت کرتا ہے!!

اے محبت! میں تیرا حلقہ بگوش ہوں، پھر تو مجھ سے کیا چاہتی ہے؟ میں تیرے پیچھے پیچھے آتشیں راستوں پر چلا اور شعلوں نے مجھے لپک لیا، میں نے اپنی آنکھیں کھولیں، لیکن تاریکی کے سوا، مجھے کچھ نظر نہ آیا میں نے اپنی زبان کو جنبش دی، لیکن یاس و ناامیدی کے سوا ایک لفظ میرے منہ سے نہ نکلا۔

اے محبت! "شوق" نے مجھے ایک ایسی "روحانی تشنگی" سے ہمکنار کر دیا ہے، جو محبوب کے بوسہ کے سوا، رفع نہیں ہو سکتی۔

میں کمزور ہوں، اے محبت! اور تو قوی، پھر مجھ سے کیوں جھگڑتی ہے؟ میں بے گناہ ہوں اور تو عادل، پھر مجھے اپنے ظلم و ستم کا نشانہ کیوں بناتی ہے؟ مجھے کیوں ذلیل کرتی ہے؟ جب کہ تیرے سوا، میرا کوئی مددگار نہیں! مجھ سے بے تعلق کیوں ہوتی ہے؟ جب کہ تو ہی میری خلقت کا سبب ہے!! اگر میرا خون تیری مرضی کے خلاف رگوں میں گردش کرے، تو اسے بہا دے!! اگر میرے قدم، تیری راہ کے سوا، ذرا بھی حرکت کریں، تو انہیں کاٹ ڈال! اس جسم کے ساتھ جو تیرا جی چاہے، کر! لیکن میری روح کو ان پرسکون کھیتوں میں، اپنے بازوؤں کے زیر سایہ، لطف اٹھانے دے!!

نہریں اپنے محبوب، سمندر کی طرف رواں ہوتی ہیں، پھول اپنے معشوق، نور کے لئے مسکراتے ہیں، بادل اپنی ارادت مند، وادی میں اترتے ہیں، لیکن میں ——— جس کی پتا سے نہریں واقف ہیں، نہ پھول اور بادل ——— خود کو اپنے غم میں تنہا اور اپنی محبت میں اکیلا پاتا ہوں، "اس" سے دور، جو مجھے اپنے باپ کی فوج کا سپاہی بنانا پسند کرے گی نہ اپنے محل کا خادم!"

نوجوان تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو گیا، گویا نہر کی نغمہ آگیں روانی اور شاخوں کے پتوں کی لطیف سرسراہٹ سے گفتگو کا سلیقہ سیکھنا چاہتا ہے۔ اس نے دوبارہ کہنا شروع کیا:

"اے وہ، کہ میں تیرے نام سے اس قدر مرعوب و خائف ہوں کہ تجھے، تیرا نام لے کر پکار بھی نہیں سکتا! اے شان و شکوہ کے پردوں اور عظمت و جلال کی دیواروں میں

مجھ سے چھیننے والی! اے وہ حورِ بقاء کہ ابدیت کے سوا ـــــ جہاں ہر طرف مساوات ہی مساوات ہے ـــــ میں تجھ سے ملنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا! اے وہ' کہ تلواریں تیری اطاعت کرتی ہیں' گردنیں تیرے سامنے خم ہوتی ہیں اور خزانوں اور عبادت گاہوں کے دروازے تیرے لئے کھلے رہتے ہیں! تو نے میرے دل پر قبضہ کر لیا ہے' جسے محبت نے مقدس کیا تھا' میری روح کو اپنا غلام بنا لیا ہے' جسے اللہ نے شرف و امتیاز بخشا تھا اور میری عقل کو پر چا لیا ہے' جو کل تک ان کھیتوں کی آزاد فضا میں بے فکر تھی' لیکن آج محبت کی زنجیروں میں مقید ہے۔

اے حسین دوشیزہ! جب میں نے تجھے دیکھا' تو اپنی تخلیق کی غایت کو پا لیا' لیکن جب میری نظر تیری بلندی اور اپنی پستی پر گئی' تو مجھے معلوم ہو گیا کہ فطرت کے کچھ راز ہیں' جو انسان کی سمجھ میں نہیں آ سکتے' اور کچھ راستے ہیں' جو روح کو ایک ایسے مقام پر لے جاتے ہیں جہاں محبت انسانی قانون سے بالاتر ہو کر حکومت کرتی ہے۔

اے غزالِ رعنا! جب میں نے تیری مست انکھڑیاں دیکھیں' تو مجھے یقین ہو گیا کہ یہ زندگی ایک جنت ہے اور انسان کا دل اس کا دروازہ! لیکن جب تیری عظمت اور اپنی ذلت کو مارو اور رئبال کی طرح آپس میں گتھم گتھا ہوتے پایا' تو جان لیا کہ یہ زمین میرا وطن نہیں ہو سکتی۔

اے حسن و جوانی کے پیکرِ لطیف! جب میں نے تجھے حسین لڑکیوں کے جھرمٹ میں بیٹھے دیکھا ـــــ جیسے پھولوں میں گلاب! تو گمان کیا کہ میرے خوابوں کی دلہن نے انسانی قالب اختیار کر لیا ہے' لیکن جب مجھے تیرے باپ کی بزرگی اور مرتبہ کا علم ہوا تو میری سمجھ میں آ گیا کہ گلاب کا پھول توڑنے سے پہلے ان کانٹوں سے سابقہ پڑتا ہے' جو انگلیوں کو زخمی کر دیتے ہیں۔ ہاں! میری سمجھ میں آ گیا کہ جو کچھ خواب جمع کرتے ہیں' بیداری اسے منتشر کر دیتی ہے!!"

نوجوان اٹھا اور ان الفاظ میں یاس و ناامیدی کی تصویر کھینچتا ہوا شکستہ دلی اور بے دلی کے ساتھ چشمہ کی طرف روانہ ہوا:

"اے موت! آ' اور مجھے زندگی کی قید سے چھڑا لے!! وہ سرزمین' جہاں کانٹے پھولوں کا گلا گھونٹتے ہوں' رہنے کے قابل نہیں۔

آ' اور مجھے اس زمانے سے نجات دے' جس میں محبت کو عظمت کی کرسی سے اتار کر' اس کی جگہ دنیوی عزت کو بٹھا دیا گیا ہے۔

مجھے آزاد کر' اے موت! وہ محبت بھرے دلوں کی ملاقات کے لئے آغوشِ ابد اس دنیا سے کہیں زیادہ موزوں ہے۔ وہاں میں اپنی محبوبہ کا انتظار کروں گا! اور وہیں ہم دونوں ملیں گے!!"

جب وہ چشمہ پر پہنچا تو شام ہو چکی تھی اور سورج نے اس کھیت سے اپنی سنہری چادر سمیٹنی شروع کر دی تھی۔ حسین شہزادی کے قدموں تلے روندی ہوئی زمین پر بیٹھ کر وہ رونے لگا۔ اس نے اپنا سر سینہ کی طرف جھکا لیا' گویا "قلبِ گریزاں" پر قابو پانا چاہتا ہے۔

اس اثنا میں' بید مشک کے درختوں میں سے ایک دوشیزہ سبزے کو اپنے دامنوں سے نہال کرتی نمودار ہوئی۔ وہ نوجوان کے پہلو آ کھڑی ہوئی اور اپنا نرم و نازک ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا' نوجوان نے گھبرا کر نگاہ اٹھائی ـــــ اس سونے والے کی طرح' جسے سورج کی شعاعوں نے بیدار کر دیا ہو۔ اس نے دیکھا: شہزادی سامنے کھڑی ہے۔ وہ گھٹنوں کے بل کھڑا ہو گیا' جس طرح موسیٰ طور کی چوٹی پر اپنے محبوب کا جلوہ روشن دیکھ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن اس کی زبان نے جواب دے دیا اور اشک آلود آنکھوں نے زبان کا فرض ادا کیا۔

دوشیزہ نے اسے گلے لگایا' ہونٹوں اور آنکھوں کو بوسہ دیا' گرم گرم گالوں کو چوسا اور بانسری سے زیادہ شیریں آواز میں بولی:

"میرے محبوب! میں نے تمہیں خوابوں میں دیکھا ہے تنہائیوں میں تمہارے تصور سے جی بہلایا ہے' تم میری روح کے رفیق ہو' جسے میں نے گم کر دیا تھا' تم میری ذات کے حسین نصف آخر ہو جو اس دنیا میں آنے سے پہلے مجھ سے جدا کر لیا گیا تھا۔

میں چوری چھپے تم سے ملنے آئی ہوں' میرے حبیب! دیکھو' اس وقت تم میری آغوش میں ہو۔ پریشان نہ ہو! میں اپنے باپ کے جاہ و حشم پر لات مار کر آئی ہوں' تاکہ تمہارے ہمراہ کسی دور دراز مقام پر چلی جاؤں اور ہم دونوں زندگی اور موت کے جام ایک ساتھ پئیں۔

اٹھو' میرے پیارے! ہم انسانوں سے دور ------ بہت دور ------ کسی ویرانے میں چلیں۔"

وہ دونوں ------ ایک دوسرے کو چاہنے والے ------ درختوں میں سے ہو کر کہیں چلے گئے' رات کے پردوں نے انہیں روپوش کر دیا تھا' اور وہ بادشاہ کی قوت اور ظلمت کی پرچھائیوں سے بے خوف چلے جا رہے تھے۔

شاہی جاسوسوں کو شہر کے آس پاس دو انسانی ڈھانچے ملے' جن میں سے ایک کے گلے میں ہار تھا۔ قریب ہی ایک پتھر پڑا تھا' جس پر یہ الفاظ کندہ تھے۔

"ہمیں محبت نے ملایا ہے' پھر کون ہے' جو ہمیں جدا کر سکے؟! ہمیں موت نے اپنی پناہ میں لیا ہے' پھر کون ہے جو ہمیں اس کی پناہ سے نکال سکے؟!

اپنی "محبت" سے

کاش! موت کے بھیانک ہاتھ۔ تمہیں مجھ سے علیحدہ نہ کر دیتے۔ تمہارے مقدس وجود کو لے کر وادیِ فنا میں پرواز نہ کر جاتے۔ اور دنیا' وسیع و روشن دنیا کو میری نگاہوں میں تاریک نہ بنا دیتے۔

اس وقت! ہاں اس صورت میں!! نہ تن کا تعلق جان سے بعید ہوتا نہ طالب اپنے مطلوب سے دور!

تب تم اپنی ضیا پاش نگاہوں سے میری طرف دیکھ کر مسکراتیں۔ اپنی محبت بھری آنکھوں سے مجھے حیات نو عطا کرتیں۔

اور میں تمہارے مقدس قدموں کو آنسوؤں سے دھوتی۔ اپنی تشنگی کو اس طرح بجھاتی! اور محبت کے قیمتی آنسوؤں سے اپنی عاقبت "محمود" کرتی۔

دہر کے بڑھتے ہوئے تفکرات مجھے گھن کی طرح ختم کر رہے ہیں۔ کاش! میں اپنا تھکا ہوا سر تمہاری گود میں رکھ سکتی میٹھے میٹھے سانسوں میں کشاکش حیات بھول جاتی۔

تمہارے مقدس لبوں سے شیریں اور تسکین دہ الفاظ سنتی اور اک فردوسی دنیا میں گم ہو جاتی۔ جہاں نہ یہ آلام ہوتے اور نہ تفکرات۔

یاس و الم کے حصار نے مجھے ہر طرف سے محیط کر لیا۔ میں بالکل بے دست و پا ہوں اور یہ ناقابل برداشت بوجھ اٹھانے کے ناقابل۔

کاش! میں تمہارے مقدس سایہ عاطفت میں ہوتی تاکہ نہ ان غموں کا احساس ہوتا اور نہ دکھوں کی کچھ پروا!...... پرسش حال میں خلوص کے نغمے ہوتے اور پیاسی روح کیلئے باران رحمت!

مجھے دنیا میں ہی جنت مل جاتی اور اپنی وجہ ہستی!

تن کو جان مل جاتی اور طالب کو مطلوب..... اور پھر! میں تمہاری رہبری میں سفر

حیات طے کرتی۔ قدم قدم پر یہاں کی لذتوں سے لطف اندوز ہوتی اور مسرتوں سے مسرور۔

اللہ ! اس وقت ہر صفحہ حیات نہ معلوم کیسا افسانوی ہوتا اور حامل عشرت ہائے گوناگوں۔

---------O---------

محبوبہ

اس وقت تو کہاں ہے؟ اے میری حسینہ!

کیا اپنی چھوٹی سی جنت میں ان پھولوں کا رس چوس رہی ہے' جو تجھ سے محبت کرتے ہیں' جس طرح بچہ اپنی ماں کی چھاتیوں سے محبت کرتا ہے؟ یا اپنے خلوت کدہ میں ہے' جہاں تو نے پاکیزگی کے لئے ایک قربان گاہ بنائی ہے اور میری روح اور اس کی باقی ماندہ قوتوں کو اس پر بٹھا دیا ہے؟ یا اپنی کتابوں میں گم ہے جن کے ذریعہ تو حکمت انسانی سے بڑھ کر' کچھ چاہتی ہے' حالانکہ تو دیوتاؤں کی حکمت سے مالا مال ہے؟

تو کہاں ہے؟ اے میری من موہنی! کیا ہیکل میں میرے لئے عبادت کر رہی ہے؟ یا باغ میں اپنے انوکھے تصورات کی چراگاہ کے متعلق فطرت سے سرگوشیاں کر رہی ہے؟ یا غریبوں کی جھونپڑیوں میں اپنی روح کی حلاوت سے دل شکستہ لوگوں کو تشفی دے رہی ہے اور اپنے احسان سے ان کی مٹھیاں بھر رہی ہے؟

تو ہر جگہ ہے' اس لئے کہ تو روح خداوندی کا ایک جزو ہے! تو ہر وقت ہے' اس لئے کہ تو زمانہ سے قوی ہے!

کیا تو ان راتوں کو یاد کر رہی ہے' جن میں ہم ایک جگہ جمع ہوئے تھے۔ تیرے نفس کی شعاعیں' ہالہ کی طرح ہمیں گھیرے ہوئے تھیں اور محبت کے فرشتے' روح کے کارناموں کا راگ گاتے ہوئے' ہمارا طواف کر رہے تھے؟

کیا تو ان دنوں کو یاد کر رہی ہے' جن میں ہم شاخوں کے سائے میں بیٹھے اور وہ ہم پر اس طرح سایہ فگن تھیں گویا ہمیں انسان کی نگاہوں سے چھپانا چاہتی ہیں' جیسے پسلیاں دل کے مقدس اسرار کو چھپائے رہتی ہیں؟

کیا تو ان راستوں اور ڈھلانوں کو یاد کر رہی ہے' جن پر ہم چلتے تھے۔ تیری انگلیاں میری انگلیوں سے اس طرح پیوست ہوتی تھیں' جیسے تیری مینڈھیوں کے بال ایک

دوسرے سے پیوست ہیں اور ہم اپنے سراس طرح جوڑ لیتے تھے' گویا خود کو' خود سے بچانا چاہتے ہیں؟

کیا تو وہ ساعت یاد کر رہی ہے؟ جب میں تجھ سے رخصت ہونے آیا تھا اور تو نے مجھے گلے لگا کر میرا الوداعی بوسہ لیا تھا' جس سے مجھے معلوم ہوا کہ دو چاہنے والوں کے ہونٹ جب آپس میں ملتے ہیں تو ایسے بلند اسرار ظاہر ہوتے ہیں' جنہیں زبان نہیں جانتی------ وہ بوسہ جو دہری آہ کا پیش خیمہ تھا اور وہ آہ' اس روح سے مشابہ' جسے اللہ نے مٹی میں پھونکا اور اس مٹی سے انسان بن گیا! یہی آہ ہماری عظمت نفس کا اعلان کرتی ہوئی ہمیں روحوں کی دنیا میں لے گئی' جہاں وہ اس وقت تک رہے گی جب تک ہم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس سے نہ جا ملیں۔

اس کے بعد تو نے مجھے پھر پیار کیا' پھر پیار کیا' پھر پیار کیا اور اس طرح کہ آنسو تجھے سہارا دے رہے تھے' تو نے کہا:

"اجسام کے مقاصد ناقابل اعتناء ہیں' وہ دنیوی معاملات پر قطع تعلق کر لیتے ہیں اور مادی اغراض پر لڑتے جھگڑتے ہیں' لیکن ارواح سکون و اطمینان کے ساتھ محبت کے سائے میں رہتی ہیں' یہاں تک کہ موت آتی ہے اور انہیں خدا کے حضور لے جاتی ہے!

جا! میرے حبیب! زندگی نے تجھے پکارا ہے' اس کی آواز پر جا!! کیونکہ وہ ایک حسینہ ہے' جو اپنے فرماں برداروں کو' لذت و عشرت کی کوثر کے بھرے ہوئے جام پلاتی ہے! رہی میں' سو میری بالکل فکر نہ کر! کہ تیرا عشق میرے لئے کبھی نہ جدا ہونے والا دولھا ہے اور تیری یاد کبھی نہ ختم ہونے والی مبارک شادی!"

اب تو کہاں ہے؟ اے میری رفیقہ حیات! کیا تو رات کی خاموشی میں اس نسیم کے لئے جاگ رہی ہے جو تیری طرف :ب کبھی جاتی ہے' میرے دل کی دھڑکنیں اور میرے سینہ کے بھید لے کر جاتی ہے؟ یا اپنے محبوب کی تصویر کو دیکھ رہی ہے' جو صاحب تصویر سے بالکل نہیں ملتی' کیونکہ غم نے اس کی پیشانی کو سکیڑ دیا ہے' جو کل تک تیرے قرب کی وجہ سے کشادہ تھی' گریہ و زاری نے ان آنکھوں کو بے نور کر دیا ہے' جو تیرے جمال کے اثر سے سرمہ آلود تھیں اور دل کی آگ نے ان ہونٹوں کو خشک کر دیا ہے' جو تیرے بوسوں سے تر رہتے تھے۔

تو کہاں ہے؟ اے میری محبوبہ! کیا تو سات سمندر پار سے میری پکار اور نالہ و فریاد سن رہی ہے' میری ذلت و بے چارگی کو دیکھ رہی ہے' میرے صبر و تحمل کا اندازہ کر رہی ہے؟ کیا فضا میں وہ روحیں نہیں ہیں جو ایک درد و کرب سے تڑپتے ہوئے جاں بلب کے انفاس لے جاتی ہیں؟ کیا روحوں کے درمیان وہ مخفی رشتے نہیں ہیں' جو قریب المرگ عاشق کا شکوہ اس کی محبوبہ تک پہنچا سکیں؟

تو کہاں ہے؟ میری زندگی! ظلمت نے مجھے اپنی آغوش میں کھینچ لیا ہے اور مایوسی مجھ پر غالب آگئی ہے!!!

فضا میں مسکرا کہ مجھ میں حرکت پیدا ہو! ایتھر میں سانس لے' کہ میں پھر زندہ ہو جاؤں!!

تو کہاں ہے؟ میری محبوبہ! تو کہاں ہے؟؟

آہ! کتنی عظمت مآب ہے محبت اور کتنا بے بضاعت ہوں میں!!

پریم گیت

ایک دفعہ ایک شاعر نے محبت کا ایک گیت لکھا
بڑا ہی پیارا گیت!
اس نے اس گیت کے بہت سے نسخے تیار کرائے' اور انھیں اپنے دوستوں اور اپنی جان پہچان والوں کو ——— مردوں اور عورتوں کو بھجوایا۔ اور اس نوخیز دوشیزہ کو بھی' جسے آج تک وہ صرف ایک ہی بار ملا تھا۔ جو اونچے پہاڑوں کی دوسری جانب رہتی تھی!
اس کے کچھ دن بعد اس نوخیز دوشیزہ کا قاصد اس کا خط لے کر شاعر کے پاس آیا' خط میں اس نے لکھا تھا۔

"میں تمہیں یقین دلاتی ہوں۔ محبت کے اس گیت نے جو تم نے مجھے لکھ کر بھیجا۔ مجھے بے حد متاثر کیا ہے ——— تم اب میرے یہاں آؤ۔ ایک بار میرے ماں باپ سے ملو' اور پھر ہم یقیناً اپنی نسبت کی بات چیت پکی کر لینے کی کوئی نہ کوئی صورت پیدا کر ہی لیں گے!"

شاعر نے اس خط کا جواب اسے یوں لکھ بھیجا ——— "خاتون یہ تو صرف محبت کا ایک گیت تھا۔ شاعر کے دل سے نکلی ہوئی بات ——— وہ گیت' جو مرد' عورت کے لئے گاتا ہے"

اس کے جواب میں اس دوشیزہ نے لکھا۔

"مکار ——— فریبی آج سے اپنی موت کے دن تک' جب تک بھی کہ میں زندہ ہوں' صرف تیری وجہ سے کسی شاعر کو منہ نہ لگاؤں گی ——— میں شاعروں سے ہمیشہ ہی نفرت کرتی رہوں گی!"

بنام مَی زیادہ

یکم نومبر ۱۹۲۰ء

عزیزہ من' مَی!

ہر بار جب نفس آئینہ حیات میں جھانکتا ہے تو اسے اپنے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا ———

اور ہر بار جب نفس ساز حیات کو سننے کی کوشش کرتا ہے تو اسے اپنے نام کے سوا کچھ سنائی نہیں دیتا ———

اور جب بھی وہ زندگی میں کچھ تلاش کرنے کی جدوجہد کرتا ہے تو اپنے وجود کے سوا اسے کچھ ہاتھ نہیں آتا ———

وہ بحر حیات میں غوطہ زن ہوتا ہے تو اس کی تہہ سے بھی اسے اپنی "خودی" کے سوا کچھ نہیں ملتا۔

زندگی کا ہر تجربہ' اور ہر مشاہدہ' اس کے وجود کا ایک حصہ ہے اور زندگی کا ہر راز اس کا اپنا راز ہے۔

گزشتہ سال کی بات ہے کہ میرے نفس نے ایک پرندے کو اسیر کیا کہ جس کا نام "راز" تھا۔ اس نے یہ پرندہ مجھے دکھایا کہ شناخت کروں۔ لیکن میں اسے نہ پہچان سکا —— میرا نفس بضد تھا کہ اس "راز" کو بہرحال منکشف ہونا چاہئے ——— میں اس "طیر راز" کو اپنی ایک دوست کے پاس لے گیا کہ شاید وہ اس کی پہچان کرا سکے ———!

لیکن سنتی ہو مَی' اس نے کیا جواب دیا ———؟ اور پرندے کا کیا نام بتایا ———؟ اس نے کہا۔

"یہ کسی مدھر نغمے کی لے ہے!"

اور یہ جواب ایسا ہی تھا جیسے کوئی ماں اپنے' آغوش میں لٹائے ہوئے لختِ جگر کے متعلق کسی سے پوچھے کہ اس کی آغوش میں کیا ہے؟ تو جواب دینے والا یہ کہے:

"تمہاری گود میں تو لکڑی کا مجسمہ ہے!"

اب تم ہی کہو اپنی دوست کے جواب پر میرے احساسات پر کیا بیتی ہوگی! اس کا جواب اب تک میرے ذہن پر ہتھوڑے کی طرح برس رہا ہے اور میرے قلب کو اپنے نوکیلے پنجوں سے نوچ رہا ہے۔

میں اس قدر مایوس ہوں کہ مجھ پر ہمہ وقت ایک سکوت سا طاری رہتا ہے۔ یاس بھرا سکوت۔ کبھی کبھی مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ تم میرے سامنے بیٹھی ہو اور میں تمہارے رخِ پرنور پر نظریں جمائے مسلسل اور پلکیں جھپکائے بغیر دیکھتا چلا جاتا ہوں۔۔۔ تم خاموش ہو' چہرے پر حیا کی شفق پھیلی ہوئی ہے اور پلکوں کی ریشمی جھالریں جھکی ہوئی ہیں اور تمہارے نین کنول ان میں چھپ سے گئے ہیں۔ ہم اتنے قریب ہیں کہ تمہارے دل کی دھڑکنیں ایک ایک ضرب کے ساتھ میری سماعت میں اترتی چلی جاتی ہیں۔۔۔ ہمارے درمیان خاموشی نغمہ سرا ہے۔ اور اس نغمے میں میری اور تمہاری محبت کی داستان بسی ہوئی ہے۔ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ خاموشی' محبت کا بہترین اظہار ہے۔۔۔؟

اور جب مجھے پتہ چلتا ہے کہ یہ تو محض میرا تصور ہے تو دل پر ایک بار پھر افسردگی سی چھا جاتی ہے۔ لیکن امید زندگی کا سہارا ہے۔ ہر خزاں کے سینے میں بہار کا دل دھڑکتا ہے اور ہر شب کے سینے میں مسکراتی ہوئی صبح چھپی بیٹھی ہے۔ اور ہر ناامیدی کے پردے میں عروسِ امید لپٹی ہوئی ہے!

جبران

اپنے کسی مکتوب میں می زیادہ نے جبران سے پوچھا تھا کہ اس کی زندگی کے شب و روز کیسے گزرتے ہیں۔۔۔؟ وہ کیسے لکھتا ہے؟ کھانے میں اسے کون کون سی اشیاء مرغوب ہیں۔ اس کے علاوہ اس نے یہ استفسار بھی کیا تھا کہ اس کا گھر کیسا ہے' دفتر کی کیا صورت ہے۔۔۔؟ ذیل کے خط میں جبران نے می کے انہی سوالات کے جواب دیئے ہیں۔۔۔!———

۱۹۲۰ء

عزیزہ من' می

کتنے شیریں ہیں تمہارے سوالات اور کتنا مسرور ہوں میں کہ تمہیں ان کے جوابات لکھنے چلا ہوں۔

"امروز من" سگریٹ نوشی کا دن ہے۔ آج تک میں دس لاکھ سگریٹ پھونک چکا ہوں۔ سگریٹ نوشی میری عادت نہیں' میری تفریح ہے۔ یہ میرے لئے ذریعہ مسرت ہے۔ بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ ایک ایک ہفتے تک میں سگریٹ کو ہاتھ تک نہیں لگاتا۔

میں نے ابھی ابھی کہا ہے۔ کہ میں آج تک دس لاکھ سگریٹ پھونک چکا ہوں۔ تو اسکی ذمہ داری تم پر عائد ہوتی ہے' صرف تم پر۔ اور تم ہی میری سگریٹ نوشی کا بنیادی محرک ہو۔۔۔! یہ قصور سراسر تمہارا ہے اور صرف تمہارا!

اور اگر قصور میرا ہوتا' یا خطادار میں ہوتا' تو یقین جانو کہ کب کا ختم ہو چکا ہوتا!

میں ہمیشہ دو لباس بیک وقت پہنتا ہوں۔ آج بھی میرے وجود پر دو لباس ہیں۔ ایک تو عام لباس ہے' سوت سے بنا ہوا اور خیاط کا سلا ہوا لیکن دوسرا لباس گوشت' خون اور ہڈیوں سے بنا ہوا ہے۔

جہاں تک میرے دفتر کا تعلق ہے۔ تو یہ آج بھی چھت اور دیواروں سے محروم

ہے۔ لیکن ریت کے سمندر اور ایتھر کے سمندر آج بھی ایک سے ہی ہیں۔ عمیق، متلاطم اور بے کراں———

اور سفینہ، کہ جس میں میں سوار ہوں، بادبانوں سے خاطر ہے کیا تم میری کشتی حیات کو بادبان عطا کر سکتی ہو؟

میں تمہیں اپنے متعلق کیا بتاؤں اور کیا نہ بتاؤں! تم اس مرد کے بارے میں کچھ جان کے کیا کرو گی کہ جو دو عورتوں کی محبت میں اسیر کر دیا گیا ہو؟ ایک عورت نے اسے خواب سے جگا کے بیداری سے آشنا کیا ہے اور دوسری نے اسے دوبارہ خوابوں کی دنیا میں پہنچا دیا ہے———! اس مرد کے بارے میں کیا سنو گی، جسے خدا نے دو شمعوں کے درمیان استادہ کر دیا ہو؟ کیا کہوں؟ وہ مسرور ہے کہ محزوں؟ کیا وہ اس دنیا کے لئے اجنبی ہے———؟ میں کچھ نہیں جانتا———!

کیا تم چاہتی ہو کہ یہ شخص ہمیشہ اجنبی بنا رہے، اور کوئی اس کی زبان نہ سمجھے! کہ وہ زبان ہی ایسی بولتا ہے جو ہر کسی کی سمجھ سے ماورا ہے!

لیکن اس شخص کو صرف تم جانتی ہو——— اس کی زبان کو صرف تم ہی سمجھتی ہو——— اس دنیا میں کتنے ہی لوگ ہیں جو میری روح کی زبان کو سمجھنے سے قاصر ہیں——— اور اسی طرح کتنے ہی لوگ ہیں جو تمہاری روح کی زبان نہیں سمجھتے———! لیکن مجھے تمہاری پوری ہستی اور تمہارے پورے وجود کا ادراک ہے۔ میں تمہاری زبان کا ایک ایک لفظ سمجھتا ہوں!

کہنے کو تو زندگی نے مجھے اور تمہیں ایک نہیں، بہت سے دوست عطا کر رکھے ہیں لیکن ان سب میں ایسا کون ہے جس سے ہم یہ کہہ سکیں "رفیق من! صرف آج کے روز، میری صلیب تم اٹھا لو!———" اور وہ اٹھا لے———! کون ہے ایسا دوست؟ اور ایسا رفیق؟ کون ہے جسے ہماری مسرتوں میں غم کی پرچھائیاں اور غموں میں مسرت کی پرچھائیاں دکھائی دیتی ہوں———؟

اور کیا کہوں، می! تم تو میرے متعلق اتنا کچھ جانتی ہو کہ شاید خود میں بھی نہیں جانتا!

جبران

۱۹۲۸ء

عزیزہ من!

اپنے یوم پیدائش سے لے کے اب تک میری ہستی عورتوں کی مرہون منت ہے۔ میری "خودی" پر سب سے زیادہ احسان عورتوں کی محبت و شفقت کا ہے۔ عورتوں ہی نے میری آنکھوں کے پٹ کھولے اور میری روح کے باب وا کیے۔ عورت ہر حیثیت میں میری رفیق رہی ہے۔ ماں کے روپ میں، بہن کے روپ میں، اور دوست کے روپ میں!

سچ پوچھو تو می بیمار رہنے میں مجھے ایک لطف سا محسوس ہونے لگا ہے۔ اب میں اپنی علالت سے بے زار نہیں ہوں بلکہ مجھے اس سے ایک لگاؤ سا ہو گیا ہے۔ یہ لطف اور یہ لگاؤ——— ہر لطف اور ہر مسرت سے جداگانہ ہے——— بیمار آدمی اس لحاظ سے بھی خوش قسمت ہوتا ہے کہ زندگی کے بے ہنگم شور و شغب سے محفوظ رہتا ہے——— اپنوں اور بیگانوں کے مطالبات سے اس کی جان بچی رہتی ہے۔ لوگوں کی بک بک اور ٹیلی فون کی جھک جھک سے اس کے کان نجات پا لیتے ہیں۔ اپنی بیماری کے دوران مجھے ایک اور فائدہ پہنچا ہے ایک اور مسرت حاصل ہوئی ہے، اور وہ یہ کہ تندرستی کے برعکس بیماری نے مجھے اشیائے مطلق کے بہت قریب کر دیا ہے۔ بستر علالت پر لیٹے لیٹے جب میں آنکھیں بند کر لیتا ہوں تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے میں ایک پرندے میں تبدیل ہو چکا ہوں اور سرسبز وادیوں اور ہرے بھرے جنگلات کے اوپر محو پرواز ہوں۔ میں اپنے آپ کو ان ہستیوں کے انتہائی قریب پاتا ہوں، کہ جن کے دلوں میں میری محبت کی قندیلیں روشن ہیں!

کاش میں ان دنوں مصر میں ہوتا کہ میری تیمارداری وہ شخصیت کرتی جسے میں قلب و

روح کی پوری قوت سے پیار کرتا ہوں ـــــ تمہیں پتا ہے می؟ کہ ہر روز صبح و شام میں خود کو قاہرہ میں تمہارے روبرو پاتا ہوں اور تم میری کتاب کا آخری باب پڑھ رہی ہوتی ہو ـــــ وہ باب جو ابھی شرمندہ اشاعت نہیں ہوا ـــــ!

جب میں اپنی موت کے بارے میں سوچتا ہوں تو میرے رگ و پے میں مسرت کی ایک لہر سی دوڑ جاتی ہے اور مجھے ایک بے پایاں فرحت محسوس ہوتی ہے۔ یقین مانو می' کہ میں موت سے ہم آغوش ہونے کا تہہ دل سے آرزو مند ہوں۔ موت کی تمنا مجھے ہر لحظہ مضطرب رکھتی ہے! لیکن اس دنیا سے روانہ ہونے سے پہلے میں ایک لفظ' ہاں صرف ایک "لفظ" کہنا چاہتا ہوں۔ یہ لفظ تاحال شرمندہ تکلم نہیں ہوا ـــــ میں جب بھی اسے ادا کرنے کی سعی کرتا ہوں۔ میری آنکھوں کے سامنے ایک دھند سی چھا جاتی ہے اور مجھے اپنا وجود پگھلتا ہوا محسوس ہوتا ہے اور میں طاقت گویائی پہ قادر نہیں رہتا!

مجھے یقین ہے کہ میری یہ علالت میری مستقل رفاقت پر مصر ہے اور خود میں بھی اب اسے اپنے آپ سے جدا کرنا نہیں چاہتا ـــــ! ہم دونوں ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو گئے ہیں ـــــ اور موت کے سوا کوئی طاقت ہمیں ایک دوسرے سے الگ نہیں کر سکتی! یہ بیماری تمہاری رقیب بن گئی ہے۔ می! ہے نا عجیب سی بات!

جبران

۱۹۳۰ء

عزیزہ من' می!

.... میری صحت گزشتہ ایام کے مقابلے میں زیادہ بدتر ہو گئی ہے۔ وہ وقت کہ جو میں نے شہر اور سمندر کے درمیان گزارا ہے اس نے میرے جسم اور روح کے درمیان ایک وسیع و عریض خلیج سی حائل کر دی ہے۔ میرا دل وحشی کہ ایک منٹ میں ایک سو بار دھڑکنا جس کا معمول بن چکا تھا' میری صحت و توانائی کو برباد کرنے کے بعد اپنی طبعی رفتار میں واپس آ چکا ہے! بے شک آرام بہت ضروری ہے۔ لیکن ڈاکٹروں کے نزدیک آرام کے بجائے علاج زیادہ بہتر ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کی ادویات میرے مرض میں اس طرح اضافہ کر رہی ہیں جس طرح تیل' دیے کی لو کو تیز کر دیتا ہے مجھے اب ڈاکٹروں کی ضرورت ہے نہ ان کی ادویات کی۔ پرہیز کی ضرورت ہے نہ آرام کی! مجھے تو اب ایک ایسے مسیحا کی احتیاج ہے جو میری روح کو علالت کی زنجیروں سے آزاد کرا دے! مجھے روحانی دوا کی ضرورت ہے۔ ایک مددگار رفیق کی احتیاج ہے۔ جو میرے درماندہ نفس کو پھر سے ترو تازہ کر دے ـــــ میں ایسی تند و تیز آندھی کا آرزو مند ہوں جو میرے برگ و بار کو بکھیر کر رکھ دے!

میں ایک چھوٹا سا آتش فشاں ہوں' می' ایسا آتش فشاں کہ جس کے دھانے کو بند کر دیا گیا ہو۔ مجھے یقین ہے کہ اگر مجھے لکھنے کی اجازت دے دی جائے تو میرے قلم سے تخلیق کے ایسے پیکر جنم لیں گے کہ انہیں دیکھتے ہی میری علالت کے آسیب مجھے آزاد کر دیں گے ـــــ اگر مجھے چیخنے چلانے کی اجازت ہو تو میری چیخ و پکار مجھے بیماری کی آغوش سے چھین لائے!.... اب تم کہو گی کہ اگر یہ سچ ہے تو میں اپنی صحت و توانائی کی واپسی کے

لئے قلم سے کیوں کام نہیں لیتا اور صحت کے لئے چیخ پکار اتنی ہی ضروری ہے تو میں چیخ پکار سے کیوں گریزاں ہوں-----؟ یقین جانو می' میرے پاس کوئی جواب نہیں۔ میں چیخنے چلانے پر قادر نہیں ہوں' اور یہی میری علالت ہے---- یہ ایک روحانی عارضہ ہے جس کی علامات جسم سے پھوٹ رہی ہیں-----!

تم کہو گی کہ پھر تم اپنے اس عارضے کا علاج کیوں نہیں کرواتے' اس بیماری سے نجات کیوں نہیں حاصل کر لیتے-----؟ کب تک یوں ہی بستر مرگ پر پڑے رہو گے اور آخر اس کا انجام کیا ہو گا؟

سنو می! میں اچھا ہو جاؤں گا---- میں بیماری سے چھٹکارا پا لوں گا' میرے زخم مندمل ہو جائیں گے اور میری توانائی لوٹ آئے گی-----!

میں اپنا محبوب نغمہ دہراؤں گا' دل کے پورے درد اور روح کے تمام کرب کے ساتھ---- میں جسم کی پوری طاقت کے ساتھ چیخوں گا کہ سکوت کا سینہ شق ہو جائے گا---- لیکن خدارا مجھ سے یہ مت کہو کہ تم تو نغمہ سرا ہو چکے ہو' اور تمہارا ماضی نہایت درخشاں تھا-----! خدارا مجھے ماضی کی آغوش میں نہ پھینکو کہ وہ جہنم سے زیادہ ہولناک ہے۔ ایام رفتہ کی یاد میری روح کو غبار آلود' اور میرے وجود کو شعلوں کے سپرد کر دیتی ہے! خدارا مجھے میرا ماضی یاد نہ دلاؤ کہ اس کی یادیں میری روح کی پیاس کو بڑھا دیتی ہیں اور ماضی کی کوتاہیاں گدھ بن کے میرے نفس کو نوچنے لگتی ہیں۔ ماضی کی یاد میرے وجود کو ہر روز ایک ہزار ایک مرتبہ موت کے پاتال میں اتارتی رہتی ہے-----!

میں نے نثر کے موتی لٹائے اور نظم کے جواہرات بکھرائے' آخر کس لیے؟ اس لیے کہ مجھے اسی کام کے لیے خلق کیا گیا تھا----- مجھے ایک مختصر سی کتاب لکھنا تھی۔ اور صرف ایک لفظ کہنا تھا' اور اس کے عوض مجھے اذیت کی آگ میں جلایا گیا۔ غم کی زنجیروں میں جکڑا گیا---- صرف ایک لفظ کہنے کے جرم میں مجھے مایوسی کی مے پلائی گئی اور شکست کی سیج پر سلایا گیا! لیکن وہ لفظ اب تک شرمندہ تکلم نہیں ہوا---- اسے گویائی کی خلعت نہیں پہنائی گئی اور وہ اب بھی میرے سینے میں بند ہے!---- اور سنو! میں خاموش نہیں رہ سکتا' اب میں خاموش رہنے پر قادر نہیں رہا اور کچھ وقت جاتا ہے کہ زندگی خود ہی اس لفظ کو میرے ہونٹوں سے چھین کے فضا میں بکھیر دے گی اور ارض و سما اس کی گونج سے معمور ہو جائیں گے۔

میں اس لفظ کو ادا نہ کر سکا کہ میری زبان میں بچوں کی سی لکنت اور سادگی تھی اور میرے لیے یہ عیب ندامت آمیز تھا۔ پھر میں نے سوچا کہ کب تک یوں ہی رہوں گا' یہ ہر روز کا بے معنی تکلم اور بے مقصد گویائی میری توانائی کو کچل کے رکھ دے گی---- میں نے وہ لفظ ادا کرنے کی کوشش کی' جسے میں اب تک روکے ہوئے تھا۔ لیکن جانتی ہو کیا ہوا-----؟ اس سے پہلے کہ وہ لفظ میرے ہونٹوں سے باہر آتا' مجھے زمین پر ڈھیر کر دیا گیا۔ میں منہ کے بل گرا اور دھول میرے حلق تک اتر گئی!

اور وہ لفظ' اب بھی میرے دل کی گہرائیوں میں پوشیدہ ہے۔ ضمیرِ صدف میں موتی کی طرح---- ایک دن آئے گا کہ میں اسے ضرور ادا کروں گا' میرے ہونٹ اسے فضا میں بکھیر دیں گے اور وہ اپنے مقدس پروں کے ساتھ خلائے بسیط میں محو پرواز رہے گا---- لیکن اس کے پر میرے گناہوں کی دھول سے اٹے ہوئے ہیں' اور جب تک میں انہیں خون جگر کے ساتھ دھو نہیں لیتا اور انہیں منزہ نہیں کر لیتا' اس وقت تک یہ لفظ میرے سینے میں بند رہے گا' ضمیرِ شب میں شعاع سحر کی طرح---- اور صداقت کی مشعل بہرحال فروزاں ہو گی!!!

جبران

جل پریاں

مشرقی جزیروں کے گرد پھیلے ہوئے سمندر کی گہرائیوں میں جہاں بے شمار موتی ہیں ایک نوجوان کی لاش پڑی تھی۔ اس کے گرد لمبے سنہری بالوں والی جل پریاں دائرہ بنائے بیٹھی تھیں اور اپنی جھیل ایسی گہری نیلی آنکھیں لاش پر جمائے نہایت مترنم آواز میں باتیں کر رہی تھیں۔ ان کی گفتگو سمندر نے سنی' موجیں اسے ساحل تک لے گئیں اور وہاں سے ہوا کے لطیف جھونکے مجھ تک پہنچا گئے۔

ایک بولی: یہ آدمی کل اس وقت ہماری دنیا میں داخل ہوا تھا جب سمندر بپھرا ہوا تھا۔

دوسری نے کہا سمندر تو بپھرا ہوا نہیں تھا...... ہاں! انسان...... جو خود کو دیوتاؤں کی اولاد سمجھتا ہے' ایک خوفناک جنگ میں مبتلا ہے۔ جس میں اب تک اتنی خون ریزی ہو چکی ہے کہ پانی کا رنگ سرخ ہو گیا ہے..... یہ آدمی اس جنگ کے مقتولوں میں سے ہے۔

تیسری پکاری: جنگ ونگ تو میں جانتی نہیں کیا بلا ہے ہاں! اتنا ضرور جانتی ہوں کہ انسان نے خشکی پر قبضہ پالینے کے بعد حرص کی کہ سمندر پر بھی حکومت کرے۔ اس نے نت نئے آلات بنائے اور سمندر کے سینے پر دندنانے لگا۔ پانی کے دیوتا .... نیپچون (NEPTUNE) کو انسان کی حرص و ہوس اور بے جا دراز دستی کی اطلاع ہوئی' تو وہ چراغ پا ہوا' لیکن انسان بھی ایک ہی عیار ہے..... اس نے اپنی چرب زبانی سے دیوتا کو راضی کر لیا اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے قیمتی تحفے تحائف نذر گزارنے اور قربانیاں پیش کرنے کا وعدہ کیا..... یہ مردہ جسم جو ہمارے سامنے بے حس و حرکت پڑا ہے' انسان کی تازہ ترین بھینٹ ہے جو اس نے ہمارے عظیم اور پر ہیبت نیپچون کو نذر کی ہے۔

چوتھی بولی: نیپچون کتنا جلیل القدر' مگر کتنا سنگ دل ہے۔ اگر سمندر پر میری حکمرانی ہوتی' تو میں ایسے خونی نذرانے ہرگز قبول نہ کرتی! آؤ! اس نوجوان کی لاش کو دیکھیں' ممکن ہے اس کے پاس سے کوئی ایسی شے نکل آئے جس سے بنی نوع انسان کے متعلق ہمارے علم میں اضافہ ہو جائے۔

جل پریاں نوجوان کی لاش کے قریب آئیں اور اس کی جیبیں ٹٹولنے لگیں۔ دل سے متصل جیب میں ایک خط نظر آیا۔ ایک نے آگے بڑھ کر نکال لیا اور بہ آواز بلند پڑھنے لگی تاکہ دوسری جل پریاں بھی سن سکیں۔

میرے محبوب!

رات بھیگ چکی ہے اور میں جاگ رہی ہوں..... اس عالم کسم پرسی میں اگر کوئی تسلی دینے والا ہے' کہ تم' تو وہ میرے آنسو ہیں یا یہ امید کہ تم جنگ کے خونی چنگل سے نکل کر ایک روز میرے پاس ضرور آؤ گے! مجھے تمہارے وہ الفاظ کبھی نہیں بھولتے' جو تم نے رخصت ہوتے وقت مجھ سے کہے تھے کہ' ہر انسان کے پاس آنسوؤں کی ایک امانت ہوتی ہے' جو ایک نہ ایک دن واپس کرنی ضروری ہے۔

پیارے! سمجھ میں نہیں آتا تمہیں کیا لکھوں؟ جذبات کا ایک طوفان ہے جو امڈا چلا آتا ہے اور مجھے اپنا آپ سنبھالنا دشوار ہو رہا ہے!!! میری روح جدائی کے عذاب سے بے قرار و بیتاب ہو کر تڑپتی ہے' تو تمہاری محبت آگے بڑھ کر تسکین کا پھاہا رکھ دیتی ہے اور میں اپنے سارے دکھ' درد اور غم بھول کر ایک انجانی مسرت اور سرور کے عالم میں کھو جاتی ہوں' ہمارے محبت سے دھڑکتے ہوئے دو دل جب ایک ہوئے تھے' تو ہمیں امید تھی کہ ہمارے جسم آپس میں اس طرح گھل مل جائیں گے کہ ان دونوں میں ایک ہی روح گردش کرے گی..... کہ معاً" جنگ کی ہولناک پکار سنائی دی اور تم لیڈروں کے ذہن نشین کرائے ہوئے درس کے زیر اثر "فرض" اور "وطنیت" کے جذبات سے مغلوب ہو کر اس پکار کے پیچھے ہو لئے۔

یہ کیسا فرض ہے جو دو محبت کرنے والوں کو جدا کر دیتا ہے! عورتوں کو بیوہ اور بچوں کو یتیم بنا دیتا ہے؟ یہ کونسی وطنیت ہے' جو معمولی معمولی باتوں پر ہنستے بستے شہروں کو تباہ و برباد کرنے کے لئے جنگ برپا کرا دیتی ہے؟

یہ کیسا اہم فرض ہے' جو غریب اور حقیر دیہاتیوں کے لئے تو ناگزیر ہے' لیکن طاقت

ور اور موروثی شریف زادے اس کی بالکل پرواہ نہیں کرتے؟

اگر فرض' قوموں کی سلامتی کو تباہ اور وطنیت انسانی زندگی کے امن اور سکون کو برباد کرے' تو ایسے "فرض" اور ایسی "وطنیت" کو دور ہی سے سلام!...... نہیں نہیں...... میری جان! تم میری باتوں کی بالکل پرواہ نہ کرو اور وطن کے لئے زیادہ سے زیادہ بہادری اور سرفروشی کا ثبوت دو.... اس لڑکی کی باتوں پر کان نہ دھرو جسے محبت نے اندھا کر دیا ہے اور جدائی نے عقل پر پردہ ڈال دیا ہے! اگر محبت نے تمہیں زندہ سلامت اب میرے پاس نہ پہنچایا' تو آنے والی زندگی میں تمہیں مجھ سے ضرور ملائے گی۔

جل پریوں نے وہ خط نوجوان کی جیب میں واپس رکھ دیا اور بوجھل دلوں کے ساتھ تیرتی ہوئی پرے چلی گئیں' نوجوان سپاہی کی لاش سے کچھ دور پہنچ کر وہ دوبارہ اکٹھی ہوئیں' تو ان میں سے ایک بولی' انسان کا دل تو ظالم نیپچون سے بھی زیادہ سخت ہے!!

ریحانہ

باپ مرا' تو وہ دودھ پیتی بچی تھی۔ اور ماں مری تو آٹھ نو برس کی بھولی بھالی لڑکی' جسے بے چارگی و کسمپرسی نے ایک مفلس ہمسائے کے ٹکڑوں پر لا ڈالا' جو لبنان کی دل کش وادیوں میں کھیتی باڑی' اور وہیں ایک تنہا جھونپڑے میں' اپنے بیوی بچوں کے ساتھ اناج اور پھلوں پر زندگی بسر کرتا تھا۔

باپ کی طرف سے اس غریب کو مرنے والے کے نام' اخروٹ اور شفتالو کے درختوں سے گھری ہوئی ایک چھوٹی سی جھونپڑی ورثہ میں ملی اور ماں کی طرف سے رنج و غم کے آنسو اور یتیمی کی ذلت! اب وہ اپنے وطن میں غریب الوطن تھی اور ان بلند چٹانوں اور گھنے درختوں میں اکیلی!!

اس کا معمول تھا کہ صبح سویرے' ننگے پاؤں' بدن پر لیرے لگائے اودھیل گائے بھینسوں کا ریوڑ ہانکتی' ہری بھری چراگاہ میں جاتی اور درختوں کی چھاؤں تلے بیٹھ کر' چڑیوں کے ساتھ گاتی' نہر کے ساتھ روتی' گائے بھینسوں کو ---- ان کے چارہ کی بہتات پر ---- رشک کی نگاہ سے دیکھتی' پھولوں کی شگفتگی اور تتلیوں کی پرواز کا نظارہ' شام ہوتے کڑاکے کی بھوک لگتی تو گھر واپس آتی اور اپنے آقا کی چھوٹی لڑکی کے ساتھ بیٹھ کر تھوڑے سے خشک پھل اور روغن زیتون اور سرکہ میں ڈوبی ہوئی ترکاریوں سے جوار کی روٹی کنگلوں کی طرح کھاتی۔ اس کے بعد خشک گھاس کے بستر پر اپنے بازوؤں کو تکیہ بنا کر لیٹ جاتی اور اپنی بدقسمتی پر ٹھنڈے سانس بھرتی' اس تمنا میں سو جاتی کہ "زندگی' کاش! ایک گہری نیند ہوتی' جسے خواب منقطع کر سکتے' نہ بیداری چھو سکتی۔" مگر صبحدم جب اس کا آقا' اسے بیدار کرتا' تو گھبرا کر اٹھ بیٹھتی ---- اس کے غضب سے کانپتی اور اکھڑ پن سے ڈرتی ہوئی!

سال پر سال گزرتے گئے اور غریب ریحانہ اسی طرح ان ٹیلوں اور وادیوں میں پلتی

بڑھتی رہی۔ عمر کے ساتھ ساتھ اس کی معصیتیں بھی بڑھ رہی تھیں۔ اس کے دل میں' غیر محسوس طور پر جذبات پیدا ہو رہے تھے' جیسے پھول کی گہرائیوں میں خوشبو پیدا ہوتی ہے۔ دھڑکے اور وسوسے اسے چاروں طرف سے گھیر رہے تھے' جس طرح مویشی چشمے کو گھیر لیتے ہیں۔

اب وہ سوجھ بوجھ کی لڑکی تھی' اس عمدہ اور اچھوتی زمین کی مانند' جو معرفت کے بیج اور تجربہ کے قدم سے ناآشنا ہو!

اب وہ ایک مقدس روح کی حامل تھی' جسے مشیت الٰہی نے اس طلسمی سبزہ زار میں پھینک دیا تھا' جہاں زندگی موسموں کے تغیر کے ساتھ بدلتی رہتی ہے۔

اپنی ان لطافتوں کی بنا پر وہ ایسی معلوم ہوتی تھی' گویا انجانے خدا کا پرتو' زمین اور آفتاب کے درمیان جلوہ فرما ہے۔

ہم کہ ہماری زندگی کا بیشتر حصہ' متمدن شہروں میں گزرتا ہے' لبنان کی دیہاتی زندگی کے متعلق تقریباً کچھ نہیں جانتے۔ ہم جدید تمدن کے دھارے پر بہتے ہیں' یہاں تک کہ اس سیدھی سادی' صاف ستھری اور حسین و جمیل زندگی کے فلسفہ کو بھول جاتے ہیں' یا جان کر بھلا دیتے ہیں ——— وہ زندگی' جو غور کرنے پر ہمیں بہار میں متبسم' گرمیوں میں گراں بار' خزاں میں زر آفریں' جاڑوں میں سکون پذیر اور اپنے ہر دور میں فطرت کے عطیوں کی تصویر نظر آتی ہے۔ مادی حیثیت سے ہمیں دیہاتیوں پر امتیاز حاصل ہے لیکن روحانی اعتبار سے وہ ہمارے مقابلہ میں کہیں بہتر ہیں۔ ہم بوتے بہت کچھ ہیں' لیکن کاٹتے کچھ نہیں' لیکن وہ جو کچھ بوتے ہیں وہی کاٹتے ہیں۔ ہم غرض کے بندے ہیں اور وہ قناعت کے پتلے۔ ہم ناامیدی' خوف اور اداسی سے تلخ زندگی کی شراب پیتے ہیں اور وہ پاک و صاف' نتھری ستھری!

ریحانہ اب سولہ برس کی تھی۔ اس کا نفس ایک شفاف آئینہ کی مثال تھا' جس میں سبزہ و گل کی رعنائیوں کا عکس پڑتا' اور دل وادی کی خلاؤں سے مشابہ' جس میں ہر آواز گونجتی۔

فطرت کی آہ و بکا کے دن تھے۔ ریحانہ ایک چشمہ کے قریب بیٹھی' جو زمین پر ہوتے ہوئے بھی اس سے اس طرح الگ تھا' جیسے شاعر کے افکار اس کے خیال و تصور سے' زرد پتوں کے نظارہ میں محو تھی' جن سے ہوا کی موجیں کھیل رہی تھیں' جس طرح موت انسانی روح کے ساتھ کھیلتی ہے اس نے ان مرجھائے ہوئے پھولوں کی طرف نگاہ کی' جو شاخ سے گر گر اپنے بیجوں کو زمین کے حوالے کر رہے تھے' جس طرح افراتفری کے زمانہ میں عورتیں اپنے جواہر و زیورات مٹی میں دبا دیتی ہیں۔

وہ پھولوں اور درختوں کو دیکھ رہی تھی اور موسم گرما کی جدائی کا المناک احساس اس کے دل کو برما رہا تھا کہ اس نے سنا' وادی گھوڑے کی ٹاپوں سے گونج رہی ہے۔ پلٹ کر دیکھا تو ایک گھڑ سوار آہستہ آہستہ اس کی طرف آرہا تھا۔ چشمہ کے قریب پہنچ کر وہ گھوڑے سے اتر گیا۔ اس کے لباس اور خدوخال سے آسودگی اور ذہانت آشکار تھی۔ اس نے نہایت تکلف سے' جو صرف مرد کا حصہ ہے' ریحانہ کو سلام کیا اور کہا:

"میں ساحل کا راستہ بھول گیا ہوں' کیا تم میری رہنمائی کر سکتی ہو؟"

وہ ایک دم کھڑی ہو گئی' جیسے چشمہ کے کنارے درخت کی شاخ' اور جواب دیا:

"مجھے ساحل کا رستہ معلوم نہیں! لیکن میں ابھی جا کر اپنے آقا سے پوچھے لیتی ہوں' وہ جانتا ہے۔"

یہ الفاظ اس نے دل کڑا کر کے ادا کئے۔ حیا نے اس کے حسن و دلکشی میں اضافہ کر دیا۔ لیکن جب اس نے جانے کا ارادہ کیا تو اجنبی نے اسے روک لیا' جوانی کی شراب اس کی رگوں میں موجزن تھی اور اس کی آنکھیں ایک ناقابل بیان کیفیت سے چمک رہی تھیں۔ وہ کہنے لگا:

"نہیں! نہیں!! تم نہ جاؤ!!!"

ریحانہ نے اجنبی کی آواز میں ایک ایسی قوت محسوس کی' جس نے اسے حرکت سے روک دیا اور وہ جہاں کھڑی تھی' متحیر و مبہوت وہیں کھڑی رہی۔ اس نے حیا سے اچٹتی ہوئی نگاہ اجنبی پر ڈالی۔ وہ اسے گھور رہا تھا' ایک ایسے اہتمام کے ساتھ' جس کے معنی اس کی سمجھ میں نہ آئے۔ وہ مسکرا رہا تھا' ایک ایسے طلسمی شغف کے ساتھ' جس کی شیرینی قریب تھا کہ ریحانہ کو رلا دیتی۔ وہ لطف و محبت کی نگاہ سے اس کے ننگے پاؤں' خوبصورت بازوؤں' چمک دار گردن اور کثیف لیکن نرم و نازک بالوں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ شوق اور تعجب کے ساتھ اس امر پر غور کر رہا تھا کہ آفتاب نے کس طرح اس کے چہرہ کو

تابناک بنایا ہے اور فطرت نے کیسے اس کے بازوؤں کو طاقت بخشی ہے؟

لیکن ریحانہ؟ ——— وہ شرم سے نیچی نگاہ کئے کھڑی تھی نامعلوم اسباب کی بنا پر وہ نہ وہاں سے ہلنا چاہتی تھی' نہ اس سے گفتگو کرنے پر قادر تھی۔

اس دن شام کو دودھیل گائے بھینسیں' تنہا اپنی باڑ میں واپس آئیں۔ شام کو جب ریحانہ کا آقا کھیت سے لوٹا' تو اسے تلاش کرنے کے لئے نکلا' لیکن اس کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اس نے "ریحانہ" کہہ کر اسے پکارنا شروع کیا' لیکن درختوں میں سنسناتی ہوئی ہوا اور غاروں کے سوا کسی نے جواب نہ دیا۔ مجبور و مایوس وہ جھونپڑی میں واپس آیا اور اپنی بیوی کو اس حادثہ کی اطلاع دی۔ وہ اس غیر متوقع خبر کو سن کر حیران رہ گئی۔ اس غم میں وہ غریب ساری رات چپکے چپکے روتی رہی اور اپنے دل میں کہتی رہی:

"میں نے ایک دفعہ خواب میں دیکھا تھا کہ وہ ایک وحشی درندہ کے چنگل میں پھنسی ہے۔ درندہ اسے پھاڑ رہا ہے اور وہ ہنس بھی رہی ہے رو بھی رہی ہے۔"

اس چھوٹے سے خوبصورت گاؤں میں لوگوں کو ریحانہ کے متعلق صرف اتنا ہی معلوم تھا۔ مجھے اس کی اطلاع گاؤں کے ایک بوڑھے آدمی سے ملی' جس کے سامنے ریحانہ چھوٹی سے بڑی ہوئی اور یکایک لاپتہ ہوگئی' اس طرح کہ اپنی یادگار کے طور پر کچھ چھوڑا بھی' تو اپنی مالکہ کی آنکھ میں چند آنسو' یا وہ لطیف و موثر یاد' جو اس وادی میں نسیم سحر کی نرم و نازک موجوں کے ساتھ بہتی ہے اور فنا ہو جاتی ہے گویا کھڑکی کے شیشہ پر بچہ کے منہ کی بھاپ ہے۔

(۲)

۱۹۰۰ء کا ذکر ہے' خزاں کا موسم تھا کہ میں اپنی تعطیلات کا زمانہ شمالی لبنان میں گزار کر بیروت واپس آیا اور کالج کھلنے سے پہلے مسلسل ایک ہفتہ تک اپنے دوستوں کے ساتھ پھرتا پھراتا اور آزادی کی اس مسرت سے لطف اندوز ہوتا رہا' جس سے جوانی کو بے انتہائی محبت ہے اور جس کا احترام وہ ماں باپ اور عزیز و اقربا کے گھروں میں بھی کرتی ہے اور مدرسہ کی چار دیواری میں بھی۔ ہم سب کی حالت اس وقت ان پرندوں کی سی تھی' جو پنجرہ کا دروازہ کھلا دیکھیں اور ان کا دل پرواز کی لذت اور چہچہانے کی مسرت سے لبریز ہو جائے۔

جوانی ایک حسین خواب ہے' جس کی شیرینی' کتابوں کے باریک اور پوشیدہ مسائل کو اپنا غلام بنا کر' ایک الم کار بیداری سے بدل دیتی ہے۔ تو کیا کبھی وہ دن بھی آئے گا۔ جب اہل فکر و نظر' جوانی کے تصورات اور معرفت کی لذتوں کو سمو دیں گے' جس طرح ملامت دو متنفر دلوں کو آپس میں ملا دیتی ہے؟ کیا کبھی وہ دن بھی آئے گا' جب فطرت انسانی کی معلم' انسانیت اس کی کتاب اور زندگی اس کا مدرسہ ہوگی؟ کوئی مجھے بتا دے! کیا میری یہ تمنا پوری ہوگی؟

گو ہم جانتے نہیں' لیکن محسوس کرتے ہیں کہ ہم نہایت تیز رفتاری کے ساتھ "روحانی ارتقاء" کی طرف جا رہے ہیں۔ اور یہ ارتقاء جمال کائنات کا ادراک ہے' جو ہمیں اپنے دل کے جذبات کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے اور سعادت و خوش بختی کی بہتات ہے' جو نتیجہ ہے اس جمال سے ہماری محبت کا۔

ایک دن میں چوک میں کسی بلند مقام پر بیٹھا' وہ ہنگامے دیکھ رہا تھا' جو شہر کے میدانوں میں مستقل طور پر پائے جاتے ہیں۔ دکانداروں اور پھیری والوں کی چیخ پکار اور وہ آوازیں سن رہا تھا' جو وہ اپنے سامان تجارت یا کھانے پینے کی چیزوں کی تعریف میں لگا رہے تھے کہ پانچ برس کا ایک بچہ' پھٹے پرانے کپڑے پہنے' کندھوں پر چھوٹا سا چھابہ لئے' جس میں پھولوں کے ہار تھے' میرے پاس آیا اور گھٹی ہوئی آواز میں' جس سے موروثی پستی اور المناک تباہی کا اظہار ہوتا تھا' کہنے لگا:

"بابو جی پھول لیں گے؟"

میں نے اس کے ننھے منے سے زرد چہرے کی طرف دیکھا' اس کی آنکھیں بدبختی اور مفلسی کی پرچھائیوں سے تاریک تھیں' منہ تھوڑا سا کھلا تھا' گویا بیمار کے سینہ کا گہرا گھاؤ ہے۔ کلائیاں ننگی اور دبلی پتلی تھیں۔ چھوٹا سا نازک قد پھولوں کے چھابے پر جھکا تھا' جیسے تر و تازہ سبزیوں میں مرجھائے ہوئے زرد گلاب کی ٹہنی۔ میں نے ایک لمحہ میں اس کا یہ دلدوز سراپا دیکھ لیا اور میری شفقت و مہربانی اس مسکراہٹ کی شکل میں ظاہر ہوئی' جو آنسو سے زیادہ تلخ ہوتی ہے ——— وہ مسکراہٹ' جو ہمارے دل کی گہرائیوں سے ابھر کر

ہونٹوں پر نمودار ہوتی ہے اور اگر ہم اس سے گریز کرتے ہیں تو ہماری آنکھوں میں پہنچتی ہے اور آنسو بن کر ہمارے رخساروں پر ڈھلک آتی ہے۔

میں نے کچھ پھول خریدے اور اس سے باتیں کرنے لگا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کی غمناک نگاہوں کے پیچھے ایک چھوٹا سا دل ہے' جس میں ازلی اور ابدی فقیروں کی المیہ کہانی کا ایک باب پوشیدہ ہے ــــــــ وہ المیہ کہانی' جو شب و روز دنیا کے اسٹیج پر کھیلی جاتی ہے' لیکن بہت کم لوگ ہیں' جو اس کی درد آفرینیوں کو دیکھنے کی تاب لاتے ہیں۔

جب میں نے لطف و مہربانی کے انداز میں اس سے باتیں کیں تو اس کا خوف دور ہوا اور وہ مجھے حیرت سے دیکھنے لگا' کیونکہ وہ بھی اپنے جیسے اور محتاجوں کی طرح ان نوجوانوں کی جھڑکیاں گھرکیاں سننے کا عادی تھا' جو عام طور سے سڑک پر بھیک مانگنے والی نوجوان لڑکی کو اس طرح دیکھتے ہیں' گویا وہ ایک پلید و ناپاک چیز ہے جس کی کوئی ہستی نہیں۔ ان خدا کے بندوں کو کبھی یہ خیال نہیں آتا کہ یہ غریب بھی ان قسمت کے ماروں میں سے ایک ہے' جن کے سینے زمانہ کے تیروں نے چھلنی کر دیئے ہیں۔

میں نے اس سے پوچھا:

"تمہارا نام کیا ہے؟"

زمین سے نگاہیں اٹھائے بغیر اس نے جواب دیا:

"فواد ــــ!"

"تم کس کے بیٹے ہو؟" میں نے پوچھا' "اور تمہارے رشتہ دار کہاں ہیں؟"

"میں ریحانہ کا بیٹا ہوں!" اس نے جواب دیا۔

"اور تمہارا باپ کہاں ہے؟" میں نے پھر پوچھا۔

جواب میں اس نے اس طرح سرہلا دیا گویا سرے سے باپ کے معنی ہی نہیں جانتا۔

"فواد! تمہاری ماں کہاں ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"گھر میں بیمار پڑی ہے!" اس نے جواب دیا۔

بچہ کے منہ سے نکلے ہوئے یہ مختصر الفاظ میرے کانوں میں پہنچے اور میرے جذبات نے انوکھی تصویریں اور المناک پرچھائیاں بناتے ہوئے انہیں جذب کر لیا۔ میں اسی لمحے سمجھ گیا کہ غریب ریحانہ جس کی داستان میں نے گاؤں کے اس بوڑھے سے سنی تھی' آج کل بیروت میں ہے اور بیمار ہے۔ وہ نو عمر حسینہ' جو کل تک وادی کے درختوں میں اطمینان و بے فکری کی زندگی بسر کر رہی تھی' آج شہر میں ہے اور مفلسی و بے چارگی کی مصیبتیں برداشت کر رہی ہے۔ وہ یتیم لڑکی' جس نے حسین و جمیل چراگاہوں میں گائے بھینسیں چراتے ہوئے' اپنی جوانی کا ابتدائی دور فطرت کی ہتھیلیوں پر گزارا تھا آج فاسد تمدن کے سیلاب میں بہہ کر ناکامی و بدبختی کے خونی چنگل کا شکار ہو گئی ہے۔

میں خاموش بیٹھا' ان تمام چیزوں کے متعلق سوچ رہا تھا اور بچہ ایک عجیب حیرانی کے عالم میں مجھ پر نگاہیں جمائے بے حس و حرکت کھڑا تھا' گویا اپنی پاک و معصوم روح کی آنکھوں سے میرے دل کی پامالی کا دردناک مشاہدہ کر رہا ہے۔ جب اس نے جانے کا ارادہ کیا' تو میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا:

"مجھے اپنی ماں کے پاس لے چلو' میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔"

وہ خاموش و حیران میرے آگے آگے ہو لیا۔ بار بار وہ مڑ مڑ کر دیکھ رہا تھا' یہ معلوم کرنے کے لئے کہ میں اس کے پیچھے پیچھے آ بھی رہا ہوں یا نہیں۔

میں ان ناپاک گلی کوچوں کو طے کر رہا تھا' جہاں فضا موت کے سانسوں سے گرانبار تھی۔ ان شکستہ مکانوں کے پاس سے گزر رہا تھا' جہاں تاریکی کے پردوں میں چھپ کر' بدمعاش گناہوں کا ارتکاب کرتے ہیں۔ ان چوراہوں کو پار کر رہا تھا' جن کے دائیں بائیں کالے سانپوں کی طرح بل کھاتی ہوئی سڑکیں تھیں۔ ایک نامعلوم خوف مجھ پر طاری تھا' اور وہ لڑکا میرے آگے آگے تھا' جس کے بچپن اور دل کی پاکیزگی نے اس میں بے خوفی پیدا کر دی تھی' ایک ایسی بے خوفی' جسے وہ شخص محسوس ہی نہیں کر سکتا' جو اس شہر کے بدمعاشوں اور کمینوں کی چالبازیوں سے باخبر ہو' جسے اہل مشرق "شام کی دلہن" اور "بادشاہوں کے تاج کا موتی" کہتے ہیں۔

ایک محلہ کے آخری سرے پر پہنچ کر لڑکا ایک چھوٹے سے مکان میں داخل ہوا' جس کا صرف ایک ٹوٹا پھوٹا حصہ زمانہ کی گردشوں سے بچ رہا تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے میں بھی اس مکان میں چلا گیا۔ ہر قدم پر میرے دل کی دھڑکن تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ میں اس مرطوب کمرہ میں پہنچا' جس میں سامان کے نام کا صرف ایک ٹوٹا چراغ تھا' جس کی زرد شعاعوں کے تیر' ظلمت کا سینہ چھید رہے تھے' یا ایک جھلنگا

چارپائی جو غربت و محتاجی کا آئینہ تھی۔ اس چارپائی پر ایک عورت پڑی سو رہی تھی۔ اس کا منہ صحن کی طرف تھا' گویا اس کے ذریعہ زمانہ کے ظلم و جور سے بچ رہی ہے۔ یا پھر یہ کہ اس کے پتھروں میں ایک ایسا دل پا رہی ہے جو انسان کے دل سے زیادہ نرم و گداز ہے۔

بچہ اس کے پاس گیا اور "ماں" کہہ کر اسے آواز دی۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں اور یہ دیکھ کر کہ وہ میری طرف اشارہ کر رہا ہے' اپنے بوسیدہ لحاف میں لرز اٹھی۔ ایک ایسی درد ناک آواز میں' جو روحانی اذیت اور تلخ آہوں سے مرکب تھی۔ اس نے میری طرف متوجہ ہو کر کہا:

"تم کیا چاہتے ہو؟ کیا تم اس لئے آئے ہو کہ میری زندگی کے آخری لمحے خرید کر انہیں اپنی نفسانیت سے ناپاک کر دو۔ جاؤ! میرے پاس سے چلے جاؤ! بازار ان عورتوں سے بھرا پڑا ہے' جو کوڑیوں کے مول اپنا جسم اور اپنی روح فروخت کرتی ہیں اور میرے پاس اب کچھ نہیں' جسے میں فروخت کر سکوں' سوائے ان بچے کھچے ٹوٹتے ہوئے سانسوں کے جنہیں موت عنقریب قبر کی راحت کے عوض خرید لے گی۔"

میں اس کی چارپائی کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اس کے ان الفاظ نے میرے دل کو ناقابل بیان درد سے لبریز کر دیا' اس لئے کہ وہ اس کی بدبختی کی مختصر روداد تھے۔ میں نے درد مندانہ لہجے میں کہا' اس طرح کہ میرے جذبات الفاظ کے ساتھ رواں تھے۔

"ریحانہ! مجھ سے نہ ڈرو۔ میں تمہارے پاس بھوکے جانور کی حیثیت سے نہیں' درد مند انسان کی حیثیت سے آیا ہوں۔ میں لبنانی ہوں اور ایک مدت تک ان وادیوں اور اس گاؤں میں رہا ہوں' جو صنوبر کے جنگل کے قریب واقع ہے۔ قسمت کی ماری ریحانہ! مجھ سے خوف نہ کھاؤ!"

اس نے میرے یہ الفاظ سنے اور جان گئی کہ یہ اس روح کی گہرائیوں سے نکل رہے ہیں' جو اس کے ساتھ مبتلائے الم ہے۔ وہ اپنے بستر پر لرز گئی' جس طرح بے برگ و بار شاخیں' سرمائی ہواؤں کے سامنے لرزتی ہیں۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا' گویا خود کو اس یاد سے چھپانا چاہتی ہے' جو اپنی حلاوت کی بنا پر ہولناک اور اپنے حسن کی بنا پر تلخ ہے۔

تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد جو آہوں سے لبریز تھی' لرزتے ہوئے شانوں میں سے اس کا چہرہ نمودار ہوا۔ اور میں نے دیکھا کہ اس کی دھنسی ہوئی آنکھیں کمرہ میں کھڑی ہوئی ایک غیر محسوس شے پر جمی ہیں۔ خشک ہونٹ یاس و نومیدی سے پھڑک رہے ہیں۔ گلے میں گہری اور ٹوٹتی ہوئی کراہ کے ساتھ' موت کی خرخراہٹ ہے۔ التماس و طلب سے ابھرتی اور ضعف و الم سے پست ہوتی ہوئی آواز میں اس نے کہا:

"تم ایک محسن و مشفق کی حیثیت سے آئے ہو۔ اگر خطا کاروں پر احسان کرنا اچھی بات ہے اور رذیلوں کے ساتھ لطف و مہربانی سے پیش آنا نیکی' تو خدا تمہیں اس کی جزائے خیر دے' لیکن میں گزارش کرتی ہوں کہ تم جہاں سے آئے ہو' الٹے پاؤں وہیں واپس چلے جاؤ! تمہارا یہاں ٹھہرنا' تمہارے لئے ننگ و عار کا سبب ہو جائے گا اور میرے حال پر تمہاری یہ شفقت' تمہیں دنیا کی نگاہوں میں عیب زدہ بنا دے گی۔ جاؤ! اس سے پہلے کہ اس گندے اور خنزیر کی ناپاکیوں سے اٹے ہوئے کمرہ میں کوئی تمہیں دیکھ لے' یہاں سے چلے جاؤ۔ اس گلی سے گزرتے وقت اپنے منہ پر کپڑا ڈال لینا' مبادا کسی آتے جاتے کی نظر تم پر پڑ جائے اور تم مفت میں بدنام ہو جاؤ۔ وہ شفقت و ہمدردی' جو تمہاری روح سے ہمکنار ہے مجھے دوبارہ پاکباز نہیں بنا سکتی' میرے عیبوں کو نہیں مٹا سکتی' میرے دل سے موت کے طاقتور ہاتھ کو نہیں ہٹا سکتی۔ مجھے میری بدقسمتی اور گنہگاری نے ان تاریک گہرائیوں میں پھینک دیا ہے۔ خدارا! تم اپنی دل سوزی کی وجہ سے اس چہ بچہ میں نہ گرو!!

میں اس کوڑھی کی مثال ہوں' جو قبرستان میں بیٹھا ہو' اس لئے تمہیں چاہئے کہ میرے قریب نہ آؤ' ورنہ سماج تمہیں ذلیل کر دے گا' اس ناقابل معافی جرم کی پاداش میں تمہارے تمام سماجی حقوق تم سے چھین لئے جائیں گے اور تم کہیں منہ دکھانے کے قابل نہ رہو گے۔

جاؤ! فوراً واپس چلے جاؤ!! اور دیکھو! ان مقدس وادیوں میں میرا نام اپنی زبان پر نہ لانا' اس لئے کہ گڈریا اپنے ریوڑ کے خیال سے خارش زدہ بھیڑ کو چھوڑ دیتا ہے۔ اگر کوئی میرے متعلق تم سے ذکر بھی کرے' تو کہہ دینا کہ ریحانہ مر گئی۔ اس کے سوا اور کچھ نہ کہنا۔"

اس نے اپنے بچہ کے چھوٹے چھوٹے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لئے اور انہیں غمگین

بوسہ دیا۔ اس کے بعد ایک آہ بھری اور کہنے لگی:

"لوگ میرے بچہ کو ذلت و حقارت سے دیکھیں گے اور کہیں گے "یہ گناہ کا پھل ہے۔ یہ ریحانہ کسبی کا بیٹا ہے۔ یہ ننگ و عار کی پیداوار ہے' یہ خاکی انڈا ہے ——— بہت ہیں' جو اس کے متعلق یہی کچھ کہیں گے' اس لئے کہ وہ اندھے ہیں' جنہیں نظر نہیں آتا۔ جاہل ہیں' جو نہیں جانتے کہ اس کی ماں نے اپنے درد اور آنسوؤں سے اس کے بچپن کو غسل دے دیا ہے اپنی بدبختی اور کم نصیبی سے اس کی زندگی کا کفارہ ادا کر دیا ہے۔

میں مرجاؤں گی اور گلی کے بچوں میں اسے یتیم بنا کر چھوڑ جاؤں گی۔ یہ اس بے رحم زندگی میں اکیلا رہ جائے گا۔ میں اس کے لئے کچھ نہ چھوڑوں گی' سوائے ایک خوفناک یاد کے' جو اسے شرمندہ کرے گی' اگر یہ کم حوصلہ اور بزدل ہوا' اور اس کا خون اونٹائے گی' یہ بہادر اور منصف ہوا۔

زمانہ نے اگر اس کا ساتھ دیا اور یہ طاقتور جوان ہو گیا تو خدا اس مرد کے خلاف اس کی مدد کرے گا' جس نے اسے اور اس کی ماں کو دنیا میں اچھوتوں سے بدتر بنا دیا اور اگر یہ مر گیا' زندگی کے جال سے اس نے خلاصی پالی تو دوسرے عالم میں مجھے اپنی آمد کا منتظر پائے گا' جہاں ہر طرف نور ہی نور اور راحت ہی راحت ہے۔"

میں نے اپنے دل کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا:

"مانا کہ تم قبرستان میں بیٹھی ہو' ریحانہ! مگر پھر بھی کوڑھی نہیں ہو۔ مانا کہ زمانہ نے تمہیں کمینوں کے حوالے کر دیا ہے' مگر پھر بھی تم کمینی نہیں ہو۔ جسم کی آلودگی روح کی پاکیزگی کو نہیں چھو سکتی' جس طرح تہ بہ تہ برف زندہ بیجوں کو نہیں مار سکتی۔ یہ زندگی کیا ہے؟ محض رنج و غم کا کھلیان' جسے دانہ نکالنے سے پہلے انسانی عمر کچل کچلا کر رکھ دیتی ہے۔ لیکن افسوس گندم کے ان خوشوں پر ہے' جو کھلیان سے الگ پڑے ہیں۔ چیونٹیاں انہیں اٹھا کر لے جاتی ہیں' پرندے چگ لیتے ہیں اور کسان کے مٹکوں میں نہیں پہنچنے پاتے۔

تم مظلوم ہو ریحانہ! اور ظالم وہ کمینہ ہے' جو مالی اعتبار سے چاہے کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو۔ لیکن ذہنی حیثیت سے انتہائی پست ہے۔ تم حقیر و مظلوم ہو' اور انسان کے لئے مظلوم ہونا' ظالم ہونے سے بہتر ہے۔ مادی فطرت کی کمزوریوں کا شکار ہونا' طاقتور ہونے سے افضل ہے' جو اپنے ہاتھوں سے زندگی کے پھولوں کو مسل دے' اپنی ناپاک خواہشوں سے محاسن جذبات کو خاک میں ملا دے!

ریحانہ! روح ایک سنہری کڑی ہے' جو زنجیر الوہیت سے ٹوٹ کر گر پڑی ہے۔ اس کڑی کو دہکتی ہوئی آگ کے شعلے لپک لیتے ہیں اور اس کی صورت بدل دیتے ہیں' اس کے دائرہ کا سارا حسن زائل کر دیتے ہیں' لیکن اس کڑی کے سونے کو کسی دوسری دھات کی طرف منتقل نہیں کرتے بلکہ اس کی چمک میں اور اضافہ کر دیتے ہیں۔ لیکن افسوس اس سوکھی لکڑی پر ہے' جسے آگ کے شعلے جلا کر راکھ کر دیتے ہیں اور ہوا اس کی راکھ کو جنگل میں اڑا دیتی ہے۔

ریحانہ! بلاشبہ تم وہ پھول ہو' جو انسانی جسم میں چھپے ہوئے حیوان کے پاؤں تلے روندا گیا ہے۔ تمہیں فولادی جوتوں نے بے دردی سے پامال کر دیا ہے۔ لیکن خوف کی کوئی بات نہیں! تمہاری خوشبو' جو بیواؤں کے نالہ و ماتم' یتیموں کی پکار اور محتاجوں کی آہ کے ساتھ آسمان کی طرف جا رہی ہے' رحمت و انصاف کا سرچشمہ ہے۔ ریحانہ! صبر کرو کہ تم روندا ہوا پھول ہو' پامال کرنے والا قدم نہیں۔"

میں بول رہا تھا اور وہ سن رہی تھی۔ میری تسکین و تشفی نے اس کے زرد چہرے کو روشن کر دیا تھا' جس طرح غروب ہوتے سورج کی لطیف شعاعیں بادلوں کو روشن کر دیتی ہیں۔ اس نے مجھے اپنے پلنگ کے پاس بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ میں بیٹھ گیا۔ میری نگاہیں اس کے چہرہ پر جمی ہوئی تھیں' جو اس کی غمگین روح کے اسرار کی ترجمانی کر رہا تھا ——— اس ہستی کے چہرہ پر جمی ہوئی تھیں' جسے معلوم تھا کہ میری موت قریب ہے ——— اس نوجوان عورت کے چہرہ پر جمی ہوئی تھیں جسے اپنے پھٹے پرانے بستر کے اردگرد موت کے خوفناک قدموں کی چاپ سنائی دے رہی تھی ——— اس ٹھکرائی ہوئی عورت کے چہرہ پر جمی ہوئی تھیں۔ جو کل تک لبنان کی حسین وادیوں میں قوت اور زندگی سے ہمکنار تھی' لیکن آج بے جان پڑی زندگی کی قیدوں سے آزاد ہونے کا انتظار کر رہی ہے۔

تھوڑی دیر کی موثر خاموشی کے بعد اس نے اپنی بچی کھچی قوتیں جمع کیں اور کہنے

گی' اس طرح کہ آنسو اس کی زبان کے ساتھ مصروف کلام تھے اور قوتیں اس کے سانس کے ساتھ خارج ہو رہی تھیں:

"ہاں! میں مظلوم ہوں۔ اس حیوان کا شکار ہوں' جو ہر انسان میں چھپا ہوا ہے۔ میں پاؤں تلے روندا ہوا پھول ہوں۔ میں چشمہ کے کنارے بیٹھی تھی' جب ایک اجنبی گھوڑے پر سوار' وہاں سے گزرا۔ اس نے لطف و نرمی سے مجھے مخاطب کیا اور بتایا کہ میں حسین ہوں اور یہ کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے اور تمام عمر محبت کرتا رہے گا۔ اس نے کہا کہ جنگل وحشیوں سے بھرا پڑا ہے اور وادیاں پرندوں اور گیدڑوں کا مسکن ہیں ---- اس کے بعد وہ مجھ پر جھکا اور اپنے سینے سے چمٹا کر مجھے پیار کیا۔ میں اس وقت تک بوسہ کے لطف سے ناآشنا تھی' اس لئے کہ ٹھکرائی ہوئی یتیم لڑکی تھی ---- اس نے مجھے گھوڑے کی پیٹھ پر اپنے پیچھے بٹھالیا اور مجھے ایک خوبصورت مگر تنہا مکان میں لے گیا۔ وہاں میں اس کے ساتھ رہنے لگی۔ وہ میرے لئے طرح طرح کے تحفے لاتا' ریشمی لباس' پاکیزہ خوشبوئیں' لذیذ کھانے اور قیمتی شرابیں ---- اس نے یہ سب کچھ کیا' مسکراتے ہوئے' اپنی خواہشوں کی گندگی اور مقاصد کی حیوانیت کو لطف کلام اور دل کش اشاروں میں چھپاتے ہوئے ---- لیکن جب میں نے اپنے جسم سے اس کی نفسانیت کا پیٹ بھر دیا' اپنی روح کو ذلت و ننگ سے بوجھل بنا دیا تو وہ میری طرف سے غافل ہو گیا' میرے پیٹ میں ایک بھڑکتا ہوا زندہ شعلہ چھوڑ کر' جو میرے جگر سے غذا حاصل کر کے "فانا" نمو پا گیا۔ اس طرح میں اس ظلمت زار میں آ پھنسی' جہاں ہر طرف نالہ و ماتم کا دھواں ہے اور درد و غم کی تلخیاں اور اس طرح میری زندگی دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ ایک کمزور و دردناک حصہ اور ایک چھوٹا حصہ' جو فضائے لانہایت میں اڑ جانے کے لئے رات کی خاموشیوں میں چلاتا تھا۔

وہ سنگ دل مجھے اور میرے دودھ پیتے بچہ کو اس تنہا مکان میں چھوڑ کر چلتا بنا اور ہم دونوں بھوک' سردی اور تنہائی کی تکلیفیں برداشت کرنے لگے آہ و ماتم کے سوا ہمارا کوئی مددگار تھا نہ خوف اور دھڑکوں کے سوا کوئی ہم سے بات چیت کرنے والا۔

آخر کار اس کے دوستوں کو میری حالت کا علم ہوا' میری بے چارگی و مفلسی کا پتہ چلا اور وہ یکے بعد دیگرے میرے پاس آئے لیکن ان میں سے ہر ایک اپنی دولت سے میری عزت خریدنا چاہتا تھا' جسمانی شرافت کے عوض روٹی دینا چاہتا تھا۔

آہ! کتنی مرتبہ میں نے چاہا کہ گلا گھونٹ کر اپنا کام تمام کر دوں' لیکن نہ کر سکی کیونکہ میں تنہا نہ تھی' اب میری زندگی میں میرا بچہ بھی شریک تھا' جسے اللہ نے عدم کی عشرت گاہوں سے اس دنیا میں دھکیل دیا تھا' بالکل اسی طرح جیسے مجھے زندگی سے دور کر کے اس جہنم کی گہرائیوں میں پھینک دیا تھا۔

لیکن اب وہ گھڑی قریب آ گئی ہے' جس کا مجھے دنوں سے انتظار تھا۔ میری زندگی کا آقا ---- فرشتہ اجل ---- طویل جدائی کے بعد مجھے لینے آ گیا ہے تاکہ اس کے نرم و گداز بستر پر آرام کروں۔"

ایک گہری خاموشی کے بعد' جو اڑنے والی روحوں کے لمس سے مشابہ تھی' اس نے اپنی آنکھیں کھولیں' جن پر موت کا سایہ پڑا تھا اور آہستہ آہستہ کہنے لگی:

"اے مخفی انصاف! جو ان خوفناک صورتوں کے پیچھے روپوش ہے' تو ہی میری چلن ہار روح کی پکار اور سست رفتار دل کی آواز کا سننے والا ہے۔ تجھ سے' صرف تجھی سے میں التجا کرتی ہوں کہ مجھ پر رحم کر' اپنے دائیں سے میرے بچہ کی دستگیری فرما اور بائیں ہاتھ سے میری روح کا تحفہ قبول کر ----!!"

اس کی قوتیں جواب دینے لگیں اور آہوں میں کمزوری پیدا ہو گئی۔ اس نے غم اور دلسوزی کی نگاہیں اپنے بچہ پر ڈالیں اور اس کی آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہونے لگیں۔ ایک دلسوز آواز میں' جو خاموشی سے قریب تر تھی' اس نے کہا:

"اے آسمان پر رہنے والے! تیرا نام ہمیشہ مقدس رہے ---- تیرا بھیجا ہوا فرشتہ اجل آ گیا ہے ---- تیری مشیت جس طرح آسمان پر کارفرما ہے' اسی طرح زمین پر بھی رہے ---- یارب! ---- ہمارے گناہوں کو ---- معاف فرما!"

اس کی آواز منقطع ہو گئی لیکن ہونٹ تھوڑی دیر تک ہلتے رہے۔ ہونٹوں کے ساتھ اس کے جسم کی تمام حرکات ختم ہو گئیں۔ اس کے بعد اس کے جسم میں لرزش پیدا ہوئی اور منہ سے ہلکی سی آہ نکلی۔ چہرہ پر زردی کھنڈ گئی اور روح پرواز کر گئی' لیکن اس کی آنکھیں ایک موہوم شے پر جمی رہیں۔

صبح کو ریحانہ کی لاش ایک لکڑی کے تابوت میں رکھی گئی اور فقیروں کے کندھوں پر شہر سے دور ایک میدان میں پہنچا کر دفن کر دی گئی۔ پادری نے اس کے جنازہ کی نماز پڑھانے سے انکار کر دیا اور لوگوں نے اس کی لاش کو اس قبرستان میں دفن کرنے کی اجازت نہ دی' جہاں صلیب قبروں کی حفاظت کرتی ہے۔ اس دور دراز میدان میں اس کے جنازہ کے ساتھ کوئی نہ گیا' سوائے اس کے بیٹے اور ایک نوجوان کے' جسے دنیا کی مصیبتوں نے ہمدردی کا سبق دیا تھا۔

حیات محبت

بہار

آؤ میری محبوبہ! ویرانوں میں چلیں!!

برف پگھل کر پانی پانی ہو چکی ہے اور زندگی اپنے شبستانوں سے نکل کر کوہساروں اور وادیوں میں اٹھلاتی پھر رہی ہے۔

آؤ میرے ساتھ آؤ کہ ہم بہار کے نقش پر قدم اٹھاتے ہوئے دور کھیتوں میں نکل چلیں اور ٹیلوں پر چڑھیں اور آس پاس کے ہریالے میدانوں کے نظاروں سے لطف اندوز ہوں۔

صبح بہار نے سرما کی چادر کو پھیلا دیا ہے۔ جس میں شفتالو اور سنگترے کے پیڑ ایسے معلوم ہو رہے ہیں جیسے چودھویں رات کی چاندنی میں چوتھی کی دلہن' انگور کی بیلوں کی شاخیں ایک دوسرے کو چاہنے والوں کی طرح گلے مل رہی ہیں۔ ندیاں بہہ نکلی ہیں اور خوشی کے راگ گاتے ہوئے چٹانوں میں رقص کر رہی ہیں۔ پھول بھی سینۂ فطرت سے پھوٹ نکلے ہیں۔ جیسے سمندر کے سینے سے حباب آؤ میری محبوبہ! گل نیلو فر کے پیانوں میں چھلکتے موسم سرما کے آخری شبنمی آنسو پئیں اور خوشنوا پرندوں کی چہکار سے اپنی روح سرشار کریں اور نسیم بہار کی مستانہ ہوا میں چہل قدمی کریں۔ گلگشت کریں۔

آؤ اس چٹان پر بیٹھ جائیں۔ جہاں بنفشہ کے پھول چھپے ہیں اور محو بوس و کنار ہو جائیں۔

گرمی

آؤ میری محبوبہ کھیتوں میں چلیں!!

فصل کاٹنے کا زمانہ آگیا ہے۔ سورج کی شعاعوں سے اناج کے خوشے پک گئے ہیں۔

آؤ زمین کے ثمرات سے بہرہ ور ہوں۔ جیسے فطرت محبت کے اس بیج سے خوشی کے خوشوں کے پرورش کرتی ہے جو ہمارے دلوں کی گہرائیوں میں بویا گیا۔

آؤ فطرت کی اس پیداوار سے اپنے گودام بھرلیں۔ جس طرح زندگی اپنے غیر مختتم عطیات سے ہمارے دلوں کے خطوں کو بھر دیتی ہے۔

آؤ پھولوں کو اپنا بستر بنائیں۔ آسمان کو اپنا دوشالا اور گھاس کے نرم و نازک تکئے پر اپنا سر رکھ دیں۔

آؤ دن بھر کی مشقت کے بعد استراحت و آرام کریں اور جذبات کو مشتعل کرنے والا ندیوں کا ترنم سنیں۔

خزاں

آؤ میری محبوبہ تاکستان میں چلیں۔

انگور کی بیلوں سے انگوروں کے خوشے چن کر ان کے فشار سے مئے ناب تیار کریں اور پرانے مٹکوں میں بھرلیں۔ جس طرح فطرت صدیوں کے علم و فلسفہ کو ابدیت کے ظروف میں محفوظ کرلیتی ہے۔

آؤ اپنے عشرت کدے کو لوٹ چلیں کیونکہ ہواؤں کے جھونکے خزاں رسیدہ زرد پتوں کو منتشر کرنے لگے ہیں تاکہ مرجھائے ہوئے ان پھولوں کو ڈھانپ لیں جن کی سرگوشیوں میں موسم گرما کے لئے ایک مرثیہ ہے۔

آؤ میری ابدی و ازلی محبوبہ گھر چلیں کہ پرندوں نے موسم گرما کی یاترا کی اور ویرانوں کے دکھ درد چھوڑ گئے۔ چشم نرگس و یاسمین میں اب کوئی آنسو نہیں رہا۔ آؤ واپس چلیں۔ تھکی ہوئی ندیوں کے ساتھ ان کا ترنم بھی رک گیا ہے اور بلبلے چھوڑتے ابلتے ہوئے چشموں کے اشکِ مسرت بھی خشک ہو چکے ہیں اور ٹیلوں نے اپنا خوشنما لبادہ اتار کر پھینک دیا ہے۔

آؤ میری محبوبہ' فطرت کو نیند آرہی ہے اور اپنے اثر انگیز الوہی نغمے کے ساتھ الوداع کہہ رہی ہے۔

جاڑا

آؤ میرے قریب آؤ میری رفیقہ حیات اور قریب۔ اتنا قریب کہ سردی کا لمس ہمارے درمیان نہ آنے پائے۔ اس آتش دان کے سامنے میرے پہلو میں بیٹھ جاؤ۔ آگ ہی تو موسم سرما کا مرغوب میوہ ہے۔ مجھ سے اپنے دل کی فتحیابی کا ذکر کرو کیوں کہ وہ ہمارے دروازے کے اس پار چیختے ہوئے عناصر سے زیادہ عظیم ہے۔

کھڑکیوں اور دروازوں کو بند کردیں۔ فضا کی ہولناکیوں سے میرح روح لرز جاتی ہے اور برف کے کفن میں کفنائے ہوئے کھیت دیکھ کر میری روح چیخنے لگتی ہے۔

میری محبوبہ! چراغ میں تیل ڈال دیں کہ اس کی لو کہیں مدہم نہ ہو جائے اور چراغ کو اپنے رخِ زیبا کے سامنے رکھو تاکہ میں اپنے آنسوؤں کے ساتھ وہ نقوش دیکھ سکوں جو میرے ساتھ گزاری ہوئی تمہاری زندگی نے تمہارے چہرے پر مرتسم کردیے ہیں۔

جاؤ اور موسم سرما کی شراب لاؤ۔ تاکہ ہم دونوں پئیں۔

ہم بھی پئیں تمہیں بھی پلائیں تمام رات! اور شراب کشید کرنے کے زمانہ کی یاد کو تازہ کریں۔ موسم بہار کے چٹکتے غنچوں کا تصور کریں۔

میرے قریب آؤ میرے دل کی ملکہ۔ آگ بجھ چکی ہے۔ راکھ کا ڈھیر بن چکی ہے۔ مجھ سے ہم آغوش ہو جاؤ۔ تنہائی سے مجھے ڈر آتا ہے۔ چراغ بجھ چکا ہے اور وہ شراب جو ہم نے پی ہے اس کے خمار نے آنکھوں کو بوجھل کردیا ہے۔ اس سے پہلے کہ یہ بند ہو جائیں آؤ ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھیں۔

مجھے اپنے سینے سے لگا لو۔ اس سے پہلے کہ نیند ہمیں اپنے گلے سے لگا لے۔ میری محبوبہ مجھے بوسہ دو کہ سردی تیرے بوسوں کے سوا ہر چیز پر غالب آگئی ہے ہمارے ہونٹوں کی جنبش بھی اس نے چرا لی ہے۔

میری محبوبہ ہم ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں۔ ہمیشہ کے لئے۔

اور نیند کا سمندر بڑا گہرا ہے۔

آہ! میرے دل کی راحت۔ اس دنیا میں صبح کتنی دور ہے۔

اے ساحرہ

اے ساحرہ! یہ تو مجھے کہاں لئے جا رہی ہے؟

اس پرخار و دشوار گزار سنگستانی رستے پر میں کہاں تک تیرے ساتھ چلوں' جو ہمارے قدموں کو تو بلندی کی طرف لے جا رہا ہے۔ لیکن ہماری روحوں کو کھنڈوں میں دھکیل رہا ہے۔

ماں سے چمٹے ہوئے بچے کی طرح' میں نے تیرا دامن پکڑا' اور تیرے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ میں نے اپنے تمام خوابوں کو بھلا دیا اور تیری ذات میں جو حسن ہے اس پر نگاہیں جما دیں۔ میں نے اپنے سر پر منڈلاتی ہوئی پرچھائیوں سے آنکھیں بند کر لیں اور تیرے جسم میں جو ایک مقناطیسی قوت پوشیدہ ہے' اس کی طرف کھنچ گیا۔

ذرا کی ذرا ٹھہر! کہ میں تیرا چہرہ دیکھ لوں۔ ایک لمحے کے لئے میری طرف دیکھ کہ میں تیری آنکھوں میں تیرے سینے کے بھید دیکھ لوں اور تیرے خدوخال سے تیری روح کے راز سمجھ لوں۔

تھوڑی دیر کے لئے ٹھہر جا' اے پری! کہ میں چلتے چلتے تھک گیا ہوں اور میری روح رستے کی ہولناکیوں سے کانپ اٹھی ہے۔ ٹھہر! کہ ہم اس دوراہے پر پہنچ گئے ہیں' جہاں موت زندگی سے گلے ملتی ہے۔ اب میں ایک قدم نہ بڑھوں گا' جب تک میری روح تیری روح کے ارادوں سے باخبر نہ ہو جائے اور میرا دل تیرے دل کے خزانوں کو نہ دیکھ لے!

میری بات سن' اے ساحرہ!

کل تک میں ایک آزاد پرندہ تھا' جو شہروں پر منڈلاتا اور فضا میں تاوے کاٹتا رہتا تھا اور شام کو شاخوں پر بیٹھ کر رنگ برنگے بادلوں کی بستی میں ان محلوں اور عبادت گاہوں کا نظارہ کیا کرتا تھا' جنہیں سورج سہ پہر کو بناتا اور ڈوبتے وقت ڈھا دیتا ہے۔

بلکہ میری فکر کی طرح' اکیلا مشرق سے مغرب تک جاتا تھا۔ زندگی کی خوبیوں اور لذتوں سے مسرت اندوز ہوتا تھا اور ہستی کے اسرار و رموز کا کھوج لگاتا تھا۔

نہیں' بلکہ خواب کی طرح' رات کے پروں تلے دوڑتا تھا اور کھڑکیوں کی درزوں میں سے سوئی ہوئی دوشیزاؤں کی خواب گاہ میں داخل ہو کر ان کے جذبات سے کھیلتا تھا۔ پھر نوجوانوں کی مسہریوں کے پہلو میں کھڑے ہو کر ان کی آرزوؤں کو بھڑکاتا تھا اور اس کے بعد بوڑھوں کے بستر کے پاس بیٹھ کر ان کے افکار کی ٹوہ لگاتا تھا۔

لیکن آج جب کہ اے ساحرہ! میں تجھ سے آشنا ہو چکا ہوں اور تیرے ہاتھوں کے بوسے نے مجھے مسموم کر دیا ہے' ایک قیدی کی مثال ہو گیا ہوں جو زنجیروں میں جکڑا ہوا' نہ جانے کہاں جا رہا ہے؟ بلکہ اس شرابی کی مثال ہو گیا ہوں' جو بادہ ہوش ربا کے جام پر جام چڑھا رہا ہو۔ اور ان ہاتھوں کو چوم رہا ہو' جنہوں نے اس کے چہرے پر تھپڑ رسید کیا ہے۔

لیکن ذرا ٹھہر' اے ساحرہ!

دیکھ! میں نے اپنی کھوئی ہوئی توتیں واپس لے لی ہیں۔ ان بیڑیوں کو توڑ دیا ہے' جو میرے پاؤں میں پڑی تھیں اور اس پیالے کو چکنا چور کر دیا ہے' جس میں میں نے وہ زہر پیا تھا' جسے میں خوش گوار سمجھتا تھا۔

پھر بتا' ہم کیا کریں اور کس رستے پر چلیں؟

میں پھر آزاد ہو گیا ہوں۔ کیا اب تو مجھے اپنا ایک آزاد ساتھی بنانے پر تیار ہے' جو ٹکٹکی بندھی آنکھوں سے سورج کو دیکھتا ہے اور غیر مرتعش انگلیوں سے دہکتے انگاروں کو پکڑ لیتا ہے۔

میں نے دوبارہ اپنے بازو کھول لئے ہیں۔ کیا تو ایک ایسے نوجوان کے ساتھ رہے گی' جس کے دن اس طرح گزرتے ہیں' جیسے عقاب کے دن پہاڑوں میں اور جس کی راتیں اس طرح کٹتی ہیں' جیسے شیر کی راتیں جنگل میں؟

کیا تو اس شخص کی محبت پر اکتفا کرے گی' جو محبت کو دم ساز تو بنا سکتا ہے' آقا نہیں بنا سکتا؟

کیا تو اس دل کی فریفتگی پر قناعت کرے گی' جو آرزومند تو ہو سکتا ہے' فرماں بردار نہیں ہو سکتا۔ بھڑک سکتا ہے' پگھل نہیں سکتا؟

کیا تو روح کے ان میلانات سے آسودہ ہو گی' جو آندھی کے سامنے لرز تو سکتے ہیں' پامال نہیں ہو سکتے۔ بگولوں کے ساتھ اٹھ تو سکتے ہیں' اپنی جگہ سے اکھڑ نہیں سکتے۔

کیا تو مجھے اپنا دوست بنانا پسند کرے گی' جو نہ کسی کو پوجتا ہے نہ اپنے تئیں پجواتا ہے۔

اچھا' تو یہ ہے میرا ہاتھ' اسے اپنے ہاتھ میں لے۔ اور یہ ہے میرا جسم' اسے اپنے نرم و نازک بازوؤں میں بھینچ لے۔ اور یہ ہیں میرے لب انہیں ایک طویل' عمیق اور خاموش بوسہ دے!

کنواری کی کہانی

ایک پھول جسے کوئی ہاتھ سے نہ چھو سکا
اس نے زندگی بسر کی اور کنواری مری

اس کے پاس تعداد سے زیادہ فوجی دستے تھے۔ جنرل کے پاس اور کوئی کام نہ تھا۔ سوائے اس کے کہ اس نے درج ذیل حکم جاری کر دیا۔

"جانی اور اسلحہ کے نقصان سے بچنے کے لئے ہمیں یہاں سے ایک بستی کی طرف پسپا ہو جانا چاہئے جو دشمن کو معلوم نہیں وہاں پہنچ کر ہم نئی جنگی چال پر سوچ بچار کریں گے اور نیا منصوبہ بنائیں اگے۔ ہم ایک صحرا میں سے مارچ کریں گے۔ دشمن کی گرفت سے بچنے کو یہ ایک اچھا راستہ ہے اور ہم عیسائی راہبوں کی خانقاہوں کے قریب پڑاؤ کریں گے۔ جہاں ہمیں کھانے پینے کی چیزیں دستیاب ہو سکیں گی۔"

فوجی دستوں نے کوئی اعتراض نہ کیا کیوں کہ وہ دیکھ رہے تھے کہ ایسی تشویش ناک حالت میں اور کوئی چارہ کار نہ تھا۔

وہ کئی روز تھکاوٹ، گرمی اور بھوک پیاس کی تکالیف برداشت کرتے ہوئے صحرا میں چلتے گئے تو ایک دن انہیں ایک ایسی عمارت دکھائی دی جو قلعہ معلوم ہوتی تھی۔ اس کا دروازہ ایسا تھا جیسا کہ شہر کی فصیل میں ہوتا ہے۔ یہ دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئے۔ انہوں نے سوچا کہ یہی راہبوں کی خانقاہ ہے جہاں وہ آرام و سکون پائیں گے اور انہیں کھانے کو ملے گا۔ جب انہوں نے دروازہ کھولا تو ایک لمحہ کے لئے انہیں کوئی ملنے نہ آیا اور پھر ایک عورت نمودار ہوئی جس نے سیاہ لبادہ اوڑھا ہوا تھا۔ اور ڈھانپے ہوئے سارے جسم میں فقط اس کا چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ کمانڈنگ آفیسر کو اس عورت نے بتایا کہ یہ جگہ تارک الدنیا عورتوں کی خانقاہ ہے۔ لہٰذا اس کے تقدس کا خیال رکھا جائے اور کسی راہبہ کو کسی طرح کا کوئی گزند نہ پہنچے۔ جنرل نے راہبہ کو یقین دلایا کہ راہباؤں کی پوری پوری حفاظت کی جائے گی اور جنرل نے استدعا کی کہ اس کے فوجی دستوں کو کھانے کو کچھ ملنا چاہئے اور ایسا ہی کیا گیا۔ فوجیوں کو خانقاہ کے باغ میں کھانا کھلایا گیا۔

کمانڈر کی عمر تقریباً چالیس سال کے پیٹے میں تھی۔ اور وہ بڑا پاجی اور شہوت پرست تھا۔ مسافت کی درماندگی اور قباحت دور کرنے کے لئے اس کے دل میں عورت کی خواہش پیدا ہوئی تو اس نے فیصلہ کیا کہ کسی راہبہ ہی کو اس کام کے لئے مجبور کرنا چاہئے۔ اس طرح شہوانی جذبے نے اس کو ایک ایسی مقدس جگہ کو ناپاک کرنے کی ترغیب دی۔ جہاں راہبہ عورتیں خدا سے لو لگائے رہتی تھیں۔ وہ سب حرص و ہوس کی دنیا سے کنارہ کش تھیں۔

یہ تسلی کر چکنے کے بعد کہ ان میں سے کونسی راہبہ نفیس ہے۔ مکار کمانڈر ایک زینہ چڑھنے لگا جو ایک کمرے کی طرف جاتا تھا اور جہاں ایک ایسی راہبہ رہتی تھی جسے اس نے کھڑکی میں سے دیکھا تھا۔ لگاتار عبادت کرنے' دنیا کی لذتوں کو ترک کرنے اور تنہائی کی زندگی بسر کرنے کے باوجود اس کے چہرے کی معصومیت اور نسوانی حسن میں ذرا فرق نہ آیا تھا۔ جبکہ وہ اس لئے خانقاہ میں آئی تھی کہ گنہ گار دنیا کے شر سے اسے پناہ ملے اور وہ بغیر کسی گڑبڑ کے بڑے سکون کے ساتھ خدا کی عبادت کر سکے۔

مجرم نے اس کے کمرے میں گھستے ہی تلوار کھینچ لی اور اسے دھمکی دی کہ اگر اس نے مدد کو شور مچایا تو وہ اس کی گردن اڑا دے گا۔ وہ مسکرائی اور خاموش رہی۔ جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ وہ اس کی خواہش کو پورا کرے گی راہبہ نے جنرل کی طرف دیکھا اور بولی:

"بیٹھ جاؤ اور آرام کرو۔ تم بہت تھکے تھکے دکھائی دے رہے ہو۔" وہ اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ جیسے وہ اپنے شکار سے مطمئن تھا۔ راہبہ نے اس سے کہا۔

"مجھے تم جنگی سورماؤں پر حیرت ہوتی ہے کہ جب تم اپنے آپ کو موت کے منہ میں دھکیل دیتے ہو تو ذرا نہیں ڈرتے۔"

اس کا جواب بیوقوف بزدل نے یہ دیا:

"حالات ہمیں جنگ میں جھونک دیتے ہیں۔ اگر لوگ مجھے بزدل نہ کہیں تو میں فوجی زندگی بسر کرنے کی آمادگی کا اظہار کرنے سے پہلے ہی فوج سے رفو چکر ہو جاؤں۔"

راہبہ اس پر مسکرائی اور کہا:
"کیا تم نہیں جانتے کہ اس مقدس جگہ میں ہمارے پاس ایسی روحانی مرہم ہے کہ جس کو تم اگر اپنے جسم پر لگالو تو تیز تر تلوار کے گھاؤ سے بھی محفوظ رہو گے۔"
"مجھے حیرت ہے۔ کہاں ہے وہ روحانی مرہم۔ میں یقیناً" اسے استعمال کروں گا۔"
"بہتر۔ میں اس میں سے تھوڑا سا تمہیں ضرور دوں گی۔"

ایک ایسے زمانے میں پیدا ہونے سے جس میں لوگ اعتقادات میں یقین رکھتے تھے۔ جنرل نے سسٹر کی بات پر کوئی شبہ نہ کیا۔

راہبہ نے ایک مرتبان کھولا اور اس میں سفید سا مرہم اسے دکھایا۔ جسے دیکھ کر جنرل کے دل میں شک و شبہ پیدا ہو گیا۔

راہبہ نے تھوڑی سی مرہم نکالی اور اسے اپنی گردن پر مل لیا اور اس سے کہا:
"اگر تمہیں میری بات کا یقین نہیں تو میں اسے تم پر ثابت کروں گی۔ اپنی تلوار لو اور اپنی پوری طاقت سے میری گردن پر وار کرو۔"

جنرل ہچکچایا۔ لیکن راہبہ نے بحث و تکرار کرتے ہوئے اسے وار کرنے پر مجبور کیا تو اس نے وار کر ہی دیا اور وہ غشی کی حالت کے قریب تھا کہ اس نے دیکھا کہ راہبہ کا سر گردن سے جدا ہو کر زمین پر گر چکا تھا۔ تب اس کی سمجھ میں یہ آیا کہ راہبہ نے کس حکمت عملی سے اپنے آپ کو ذلت سے بچالیا تھا۔

راہبہ مر چکی تھی۔ اور جنرل اپنے سامنے صرف دو چیزوں کے سوا اور کچھ نہ دیکھ رہا تھا۔ کنواری کی نعش اور روحانی مرہم کا مرتبان۔

وہ بڑے غور سے کبھی روحانی مرہم اور کبھی بغیر سر کے جسم کو دیکھنے لگا اور اس نے حوصلہ ہار دیا۔ اس نے دھکا مار کر دروازہ کھول دیا اور خون سے لتھڑی ہوئی تلوار پکڑ کر بھاگ نکلا اور چیخ چیخ کر اپنے فوجی دستوں سے کہنے لگا۔
"جلدی کرو۔ جلدی کرو۔ آؤ اس جگہ سے کوچ کریں۔"

وہ بدستور بے تحاشا بھاگتا چلا گیا حتیٰ کہ چند فوجی اس کے قریب پہنچے تو اسے ایک بدحواس بچے کی طرح شور مچاتے سنا۔
"میں نے اسے قتل کر دیا۔ میں نے اسے قتل کر دیا۔"

دلہن کی سیج (۱)

دولہا دلہن ہیکل سے نکلے، آگے آگے شمعیں تھیں اور پیچھے پیچھے شاد و خرم باراتی۔ ارد گرد نوجوان لڑکے نغمے الاپ رہے تھے اور نوخیز لڑکیاں خوشی کے راگ گا رہی تھیں۔

بارات دولہا کے مکان پر پہنچی، جو بیش قیمت غالیچوں اور زرق برق ساز و سامان سے آراستہ اور نشاط آگیں خوشبوؤں سے معطر تھا۔ دولہا دلہن ایک اونچے تخت پر بیٹھ گئے اور مہمان ریشمی صوفوں اور مخملی کرسیوں پر۔ تمام وسیع کمرہ آدمیوں سے بھر گیا۔

غلام شراب کی صراحیاں لائے۔ دور چلنے لگے۔ جام و ساغر کی کھنک اور عشرت و سرور کی لک سے ساری فضا نغمہ ریز ہو گئی۔

ارباب نشاط آئے اور اپنے سحر آفریں نغموں سے اہل محفل کو بے خود کرنے لگے۔ ان کی سریلی آوازیں عود کے سروں، لوگوں کے گہرے سانسوں اور طبلے کی تھاپ سے ہم آہنگ ہو کر سینوں کو گرمانے لگیں۔

پھر البیلی لڑکیاں ناچنے کھڑی ہوئیں۔ آواز کے زیر و بم کے ساتھ ان کے جسم اس طرح لچکتے، جیسے نسیم سحر کی ہلکی ہلکی موجوں سے نرم و نازک شاخیں۔ جب وہ ناچتیں تو ان کی زرتار پشوازوں کے گھیر میں کچھ ایسی لہریں پیدا ہوتیں، گویا چاند کی شعاعیں، سفید بادلوں سے کھیل رہی ہیں۔

نگاہیں ان پر جمی ہوئی تھیں اور سر ان کے قدموں میں سجدہ گزار۔ البیلے نوجوانوں کی روحیں ان سے گلے مل رہی تھیں اور ہوس پیشہ بڈھوں کے سینے ان کے رعب جمال سے پھٹے جاتے تھے۔

گردش جام تیز سے تیز تر ہو گئی۔ شرابی اپنی آرزوؤں اور تمناؤں کو شراب میں غرق کرنے لگے۔ ہنگامہ و شورش میں اضافہ ہو گیا۔ سنجیدگی رخصت ہو گئی۔ آزادی و بیباکی نے اپنا پرچم گاڑ دیا۔ دماغ معطل ہو گئے۔ تن من بھڑک اٹھے، دل بے چین ہو گئے اور

سارے گھر کی یہ حالت ہو گئی' جیسے ٹوٹا ہوا رباب' جس کے تار کسی آہنی ہاتھ نے زور زور سے بجا کے توڑ دیئے ہوں۔ اور اس سے ایسے نغمے پیدا ہوئے جن میں آہنگ بھی ہو اور بے آہنگی بھی۔

ایک جانب مسیں بھیگتا لڑکا' عشوہ سامان الھڑ حسینہ سے اپنی محبت کا راز بیان کر رہا تھا' دوسری جانب ایک نوجوان دل کی گرمی کے ساتھ اپنی محبوبہ کے شیریں الفاظ اور دل دوز مطالب ایک ایک کر کے اپنے ذہن میں تازہ کر رہا تھا۔ ایک طرف ایک ادھیڑ عمر کا شرابی جام پر جام چڑھا رہا تھا اور گانے والوں سے ان گیتوں کو دوبارہ سنانے کی بہ اصرار فرمائش کر رہا تھا جو اس کی جوانی کے آئینہ دار تھے۔ دوسری طرف ایک عورت کنکھیوں سے اس مرد پر نکتہ چینی کر رہی تھی جو اس کے سوا ہر عورت کو محبت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ادھر کونے میں ایک پختہ عمر خاتون' مسکراتی نگاہوں سے نوجوان لڑکیوں کا جائزہ لے رہی تھی' اس نیت سے کہ اپنے اکلوتے بچے کے لئے کوئی اچھی سی دلہن کا انتخاب کرے۔ ادھر کھڑکی کے پاس ایک شادی شدہ عورت بیٹھی تھی' جس کے خاوند کی بے ہوشی و بے خبری نے اسے اپنے آشنا سے کچھ دیر مل بیٹھنے کی مہلت دے دی تھی۔ مختصر یہ کہ محفل کی محفل شراب و غزل کے سمندر میں غرق تھی۔ عشرت پسندوں نے اپنے تئیں کیف و سرور کی موجوں کے حوالے کر دیا تھا اور غم دیروز و فکر فردا سے غافل و بے پروا' حال کی سرمستیوں میں گم تھے۔

یہ سب کچھ ہو رہا تھا اور حسین دلہن اس محفل نشاط کو اپنی غمگین نگاہوں سے اس طرح دیکھ رہی تھی' جیسے ایک مایوس قیدی' قید خانہ کی تاریک دیواروں کو دیکھتا ہے۔ اس کی نگاہیں بار بار اسی گوشہ کی طرف جا رہی تھیں' جہاں ایک بیس سالہ نوجوان' اس تمام ہنگامہ طرب سے بے نیاز' اس زخمی پرندہ کی طرح جو اپنے غول سے بچھڑ گیا ہو' تنہا بیٹھا تھا ----- دونوں کلائیوں سے اپنا سینہ دبائے' گویا "قلب گریزاں" پر قابو پانا چاہتا ہے ----- اور کمرہ کی فضا میں کسی غیر محسوس چیز پر نگاہیں جمائے' گویا اس کی روح' جسم سے الگ ہو کر خلا میں ظلمت کی پرچھائیوں کے پیچھے پیچھے دوڑ رہی ہے۔

رات بھیگی اور ساری مجلس ایک ہنگامہ ہائے و ہو ہو گئی۔ دماغوں پر خمار ایسا چھایا کہ زبانیں لڑکھڑانے لگیں۔ دولہا ----- وہ ادھیڑ عمر کا بدقوارہ انسان' نشہ میں چور' اپنی جگہ سے اٹھا اور از راہ مہمان نوازی مہمانوں میں چکر لگانے لگا۔

اس وقت موقع پا کر دلہن نے ایک لڑکی کو اشارہ سے بلایا۔ وہ آئی اور اس کے پہلو میں بیٹھ گئی۔ دلہن نے مضطربانہ طور پر کنکھیوں سے چاروں طرف دیکھا' گویا کوئی اہم راز اس سے کہنا چاہتی ہے۔ وہ لڑکی سے اور قریب ہو گئی اور لرزتی کانپتی آواز میں چپکے چپکے اس سے کہنے لگی:

"میں تجھے اس سہلاپے کی قسم دیتی ہوں' پیاری سہیلی! جس نے بچپن ہی سے ہم دونوں میں یک دلی پیدا کر دی ہے۔ اس چیز کی قسم دیتی ہوں' جو دنیا میں تجھے سب سے زیادہ پیاری ہے۔ ان بھیدوں کی قسم دیتی ہوں' جو تیرے سینہ میں پوشیدہ ہیں۔ اس محبت کی قسم دیتی ہوں جس نے ہم دونوں کی روحوں کو چھو کر' انہیں ایک شعاع بنا دیا۔ تیرے دل کی راحت اور اپنے دل کے درد کی قسم دیتی ہوں کہ تو ابھی سلیم کے پاس جا اور اس سے کہہ کہ وہ عام نگاہوں سے بچ کر' باغ میں چلا جائے اور وہاں بید کے درختوں میں میرا انتظار کرے۔ سوسان! تو اس سے التجا کرنا' یہاں تک کہ وہ اقرار کر لے' اسے بیتے ہوئے دنوں کی یاد دلانا' محبت کا واسطہ دینا۔ کہنا وہ بدنصیب اندھی ہے۔ کہنا وہ قسمت کی ستائی جاں بلب ہے اور اس سے پہلے کہ تاریکی اسے اپنی چادر میں لپیٹ لے' چاہتی ہے کہ تیرے سامنے اپنا سینہ چیر کر رکھ دے۔ کہنا' وہ غم کی ماری موت کے چنگل میں ہے اور اس سے پہلے کہ دوزخ کے ڈراؤنے شعلے اسے اپنی آغوش میں لپک لیں۔ چاہتی ہے کہ تیری آنکھوں کے نور سے اپنا دل ٹھنڈا کرے۔ کہنا' وہ خطاوار ہے اور چاہتی ہے کہ تیرے سامنے اپنے گناہوں کا اقرار کر کے تجھ سے معافی چاہے جا سوسان! جلدی جا' میری خاطر سلیم سے التجا کر!! ان خنزیروں کی نگہبانی سے نہ ڈر!!! شراب نے ان کے کانوں پر بھی پردے ڈال دیئے ہیں اور آنکھوں پر بھی۔"

سوسان دلہن کے پاس سے اٹھ کر غمزدہ تنہا سلیم کے پاس جا بیٹھی۔ اور سرگوشی کے انداز میں' اس کی محبوبہ کا پیغام اسے سنانے لگی۔ سوسان کے چہرے سے اس وقت محبت اور خلوص کے آثار نمایاں تھے۔ لیکن سلیم سر جھکائے خاموشی سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ جب وہ سب کہہ چکی تو سلیم نے اس کی طرف دیکھا' اس پیاسے کی طرح جو گنبد فلک پر پانی سے بھرا کٹورہ دیکھے اور نارسائی کے رنج سے اپنا دل مسوس کر رہ جائے۔ گھٹی ہوئی

آواز میں' جو زمین کی تہوں سے آتی معلوم ہو رہی تھی' اس نے جواب دیا:

"اچھا! میں باغ میں جا رہا ہوں اور بید کے درختوں میں اس کا انتظار کروں گا۔"

یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور باغ کی طرف چلا گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد دلہن بھی اٹھی اور سلیم کے پیچھے پیچھے' نشہ میں سرشار مردوں اور محو جمال عورتوں کے بیچ میں سے دبے پاؤں نکل گئی۔

باغ میں پہنچ کر' جہاں رات نے اپنی سیاہ چادر پھیلا رکھی تھی' اس نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ اور بار بار پیچھے مڑ کر دیکھنے لگی۔ اس بے قرار ہرن کی طرح' جو کسی حملہ آور بھیڑیئے سے خوف زدہ ہو کر' اپنے مسکن کی طرف تیزی سے بھاگ رہا ہو' وہ بید کے درختوں کی طرف جا رہی تھی' جہاں سلیم اس کے انتظار میں تھا۔ خود کو اپنے حبیب کے پہلو میں پاکر' وہ اس سے چمٹ گئی۔ اپنی باہیں اس کے گلے میں ڈال دیں اور کہنا شروع کیا' اس طرح کہ جتنی سرعت کے ساتھ الفاظ منہ سے نکل رہے تھے اتنی ہی سرعت کے ساتھ آنسو' آنکھوں سے جاری تھے۔

"سنو! میرے پیارے' غور سے سنو!! میں اپنی نادانی اور جلد بازی پر شرمندہ ہوں' اتنی شرمندہ کہ ندامت نے میرے کلیجے کے ٹکڑے اڑا دیئے ہیں۔ سلیم میں تمہیں ——— ہاں! صرف تمہیں چاہتی ہوں اور ساری عمر تمہی کو چاہتی رہوں گی۔ لوگوں نے مجھے بہکایا کہ تم نے مجھے بھلا دیا ہے۔ مجھے چھوڑ کر کسی اور سے محبت کرنے لگے ہو۔ سلیم! لوگوں نے مجھ سے بہت کچھ کہا۔ اپنی زبانوں سے میرے دل کو زہر آلود کیا' اپنے ناخنوں سے میرا سینہ گودا اور اپنے جھوٹ سے میری روح کو گراں بار کر دیا۔ ایک "شریف زادی" نے مجھ سے کہا کہ تم مجھے نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہو اور اسی لئے تم نے مجھے چھوڑ کر اس سے راہ و رسم پیدا کر لی ہے۔ اس غیابی نے مجھ پر مصیبتوں کا پہاڑ توڑا مجھے ورغلایا کہ میں اس کے ایک رشتہ دار سے شادی کر لوں اور بہکاوے میں آکر میں راضی ہو گئی۔ لیکن سلیم! میرا شوہر تمہارے سوا کوئی نہیں اور اب' ہاں! اب کہ میری نگاہوں سے پردہ اٹھا دیا گیا ہے' میں اس مکان سے نکل کر تمہارے پاس آئی ہوں اور یہ ارادہ لے کر کہ اب کبھی واپس نہ جاؤں گی۔ میں تمہارے پاس اس لئے آئی ہوں کہ تمہیں اپنی آغوش میں جذب کر لوں۔ دنیا میں کوئی قوت ایسی نظر نہیں آتی' جو مجھے دوبارہ اس مرد کے پہلو میں جا بٹھائے جسے نفرت و بے چارگی کے عالم میں میرا شوہر بنایا گیا ہے۔ سلیم! میں اس دولہا کو چھوڑ آئی ہوں' جسے مکر و فریب نے میری زندگی پر مسلط کر دیا تھا۔ اس باپ کو چھوڑ آئی ہوں' جسے مشیت نے میرا ولی بنایا تھا۔ ان پھولوں کو چھوڑ آئی ہوں جن کا ہار بنا کر پادری نے میرے گلے میں ڈالا تھا اور اس قانون کو چھوڑ آئی ہوں جسے رسم و رواج کی جکڑ بندیوں نے میرے پاؤں کی زنجیر بنا دیا تھا۔ ہاں! میں ان تمام چیزوں کو اس مکان میں' چھوڑ کر' جو بدمستی و آوارگی کا مسکن بنا ہوا ہے یہاں اس لئے آئی ہوں کہ تمہارے ساتھ کہیں دور ——— بہت دور ——— چلی جاؤں' دنیا کے اس کنارہ پر چلی جاؤں۔ جنوں اور پریوں کی بستی میں چلی جاؤں۔ موت کے قبضہ میں چلی جاؤں۔ آؤ سلیم رات کی تاریکیوں میں چھپ کر اس مکان سے بھاگ چلیں۔ آؤ! سمندر کے ساحل پر چلیں اور کسی ایسی کشتی میں سوار ہو جائیں' جو ہمیں ایک نامعلوم و دور دراز بستی میں پہنچا دے۔ سلیم! جلدی کرو!! پو پھٹنے سے پہلے ہمیں دشمنوں کے قبضہ سے نکل جانا چاہئے!!! دیکھو سلیم! دیکھو!! یہ سونے کا گہنا' یہ قیمتی ہار اور انگوٹھیاں یہ عمدہ جواہر' ہمارے مستقبل کی ضمانت ہیں۔ انہیں بیچ کر ہم امیروں کی طرح ٹھاٹ باٹ سے زندگی بسر کریں گے ———! ہائیں ——— سلیم! تم بولتے کیوں نہیں؟ میری طرف دیکھتے کیوں نہیں؟ مجھے پیار کیوں نہیں کرتے؟ کیا تم میرے دل کی فریاد اور میرے من کی پکار سن رہے ہو؟ ——— کیا تمہیں یقین نہیں آتا کہ میں اپنے شوہر اور ماں باپ کو چھوڑ کر لباس عروسی میں تمہارے ساتھ بھاگنے آئی ہوں؟ اچھے! سلیم بولو!! آؤ جلدی کرو! یہ لمحے ہیرے کے ٹکڑوں سے زیادہ قیمتی اور شاہی تاج سے زیادہ گراں بہا ہیں!!!"

دلہن گفتگو کر رہی تھی اور اس کی آواز میں ایک نغمہ تھا۔ زندگی کی سرگوشیوں سے زیادہ شیریں اور موت کی تلخیوں سے زیادہ کڑوا' پروں کی سرسراہٹ سے زیادہ لطیف اور موجوں کے شور سے زیادہ گہرا۔ ایسا نغمہ' جو یاس و امید' لذت و الم' راحت و رنج اور ان جذبات و میلانات کے درمیان جنبش میں تھا' جو عورت کے سینہ میں پوشیدہ ہوتے ہیں۔

لیکن نوجوان خاموش کھڑا سن رہا تھا' اس کے دل میں محبت اور ناموس کی جنگ ہو رہی تھی ——— محبت' جو مشکلوں کو آسان اور تاریکیوں کو روشن کر دیتی ہے اور ناموس' جو انسانوں کو خواہشوں اور تمناؤں سے باز رکھتا ہے ——— محبت جو خدا کی طرف سے

دل پر نازل ہوتی ہے اور ناموس' جسے انسانی تقلید' دماغ کے ہر رگ و ریشہ میں پیوست کر دیتی ہے۔

کچھ عرصہ کے بعد' جو اپنی خاموشی اور خوفناکی میں اس تاریک عہد سے مشابہ تھا' جس میں قومیں عروج و زوال کے درمیان ڈگمگاتی ہیں' نوجوان نے اپنا سر اٹھایا۔ شرافت محبت پر غالب آچکی تھی۔ اس نے متفکر و خوف زدہ لڑکی کی طرف سے آنکھیں پھیر لیں اور نرم آواز میں بولا:

"اے عورت جا! اپنے شوہر کا پہلو آباد کر!! جا کہ مشیت خداوندی یوں ہی تھی۔ خوابوں کے سارے نقوش بیداری نے محو کر دیئے ہیں —— جلدی جا اور مسرتوں کی آغوش میں آسودہ ہو جا! کہیں ایسا نہ ہو کہ پہرہ دار تجھے دیکھ لیں اور دنیا کہے کہ تو نے شادی کی رات اپنے شوہر کی امانت میں خیانت کی' اسی طرح' جیسے جدائی کے زمانہ میں اپنے محبوب کے ساتھ دغا کی تھی۔"

دلہن کانپ اٹھی اور اس طرح بے چین ہو گئی جیسے کملایا ہوا پھول ہوا کے جھونکوں سے پریشان ہو جاتا ہے۔ دردناک لہجہ میں اس نے کہا:

"جب تک میرے جسم میں ایک سانس بھی باقی ہے میں اس مکان میں واپس نہیں جاؤں گی' جہاں سے میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نکل آئی ہوں۔ میں اس مکان کو —— اس مکان کی ہر چیز کو —— اس طرح چھوڑ آئی ہوں' جیسے جلاوطن قیدی اس جگہ کو چھوڑتا ہے' جہاں اس نے اپنی جلاوطنی کے دن تنہائی اور بے چارگی میں گزارے ہوں۔ سلیم' مجھے دھکے نہ دو' مجھے خیانت کار نہ کہو۔ اس لئے کہ محبت کا ہاتھ' جس نے میری اور تمہاری روح کو ایک دوسرے میں جذب کر دیا ہے' پادری کے ہاتھ سے زیادہ قوی ہے' جس نے میرے جسم کو' میرے شوہر کی مرضی کے ہاتھ بیچ ڈالا ہے۔ آؤ! میں اپنی بانہیں تمہاری گردن میں اس طرح ڈالوں کہ کوئی قوت انہیں چھڑا نہ سکے۔ تمہیں اس طرح بھینچ لوں کہ موت بھی ہمیں ایک دوسرے سے جدا نہ کر سکے!"

نوجوان نے بمشکل اس کی بانہیں اپنی گردن سے چھڑائیں اور نفرت و حقارت کے لہجہ میں بولا:

"میرے پاس سے دور ہو جا! میں تجھے بھلا چکا ہوں۔ ہاں! میں تجھے بھلا چکا ہوں اور

تجھ سے نفرت کرتا ہوں! لوگوں نے تجھ سے جھوٹ نہیں کہا کہ میں کسی اور کی محبت میں گرفتار ہوں۔ سنا! میں کیا کہہ رہا ہوں؟ کہہ رہا ہوں کہ میں تجھے بھلا چکا ہوں' اس حد تک کہ میں نے تیرے وجود کو بھی فراموش کر دیا ہے۔ میں تجھ سے نفرت کرتا ہوں' اتنی کہ تمہاری شکل سے بھی بیزار ہو گیا ہوں۔ چل پرے ہٹ! مجھے اپنی راہ جانے دے! جا اپنے شوہر کے پاس واپس جا اور اس کی باوفا بیوی بن کر رہ!!

دلہن نے دردناک آواز میں کہا:

"نہیں نہیں! مجھے تمہاری باتوں پر یقین نہیں! تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔ میں نے تمہاری آنکھوں میں محبت کے معنی پائے ہیں اور جب تمہارے جسم کو چھوا ہے گویا محبت کو چھوا ہے۔ تم مجھ سے محبت کرتے ہو! محبت کرتے ہو!! محبت کرتے ہو!!! بالکل اسی طرح جیسے میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ اس مکان کا تو ذکر ہی کیا میں یہاں سے تمہاری آغوش کے سوا کہیں نہ جاؤں گی۔ یہ میرا پختہ ارادہ ہے۔ میں آئی ہی اس لئے ہوں کہ تمہارے ساتھ کسی غیر معلوم سرزمین پر چلی جاؤں۔ اس لئے یا تو میرے ساتھ چلو یا ہاتھ اٹھاؤ اور مجھے قتل کر دو۔"

نوجوان نے پہلے سے زیادہ بلند آواز میں کہا:

"مجھے چھوڑ دے' ورنہ میں چلا کر ان تمام مہمانوں کو یہاں جمع کر لوں گا' جو تیری شادی کی خوشی میں شرکت کے لئے بلائے گئے ہیں اور انہیں تیری اس ذلت کا منظر دکھا کر تجھے ان کے منہ کا ایک کڑوا نوالہ اور ان کی زبانوں کی ایک شرمناک کہاوت بنا دوں گا۔ صرف یہی نہیں بلکہ میں یہاں اس عورت کو بھی بلا لوں گا' جو میرے دل کی ملکہ ہے۔ وہ تجھ پر ہنسے گی اپنی کامیابی پر مسرور ہو گی اور تیری شکست کا مذاق اڑائے گی۔"

یہ کہا اور بازو پکڑ کر اسے دھکا دے دیا۔

دلہن کے تیور بگڑ گئے۔ آنکھوں میں برقیت پیدا ہو گئی اور اس کی ساری محبت' امیدیں اور فریادیں' غضب اور سنگ دلی میں تبدیل ہو گئیں اس غضب ناک شیرنی کی طرح جس کا بچہ چھین لیا گیا ہو یا اس سمندر کی طرح جسے بگولے ہیجان میں لے آئے ہوں۔ وہ چیخی:

"کون ہے' جو میرے بعد تیری محبت سے آسودہ ہو؟ میرے دل کے سوا کون ہے جو

تیرے بوسوں سے کیف و سرور حاصل کرے؟؟"

یہ کہہ کر چپکے سے ایک آبدار خنجر' اپنے کپڑوں سے نکالا اور بجلی کی سی تیزی سے اس کے سینہ میں گھونپ دیا۔ وہ تیورا کے گرا' جیسے آندھی کے تھپیڑے سے ٹہنی ٹوٹ کر گر پڑتی ہے۔ دلہن اس پر جھکی' ہاتھ میں خنجر تھا جس سے خون کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ سلیم نے موت کے سائے میں اپنی بوجھل آنکھیں کھولیں' ہونٹوں پر جنبش پیدا ہوئی اور کمزور تنفس کے ساتھ یہ کلمے اس کی زبان سے ادا ہوئے۔

"میری پیاری! اب میرے پاس آؤ! میری لیلیٰ! میرے پاس آؤ!! مجھے کبھی نہ چھوڑو۔ زندگی' موت سے زیادہ کمزور ہے اور موت' محبت سے زیادہ کمزور ہے' سنو! سنو!! خوش دل براتیوں کے قہقہے سنو!!! ساغروں کی جھنکار سنو! سنو' میری پیاری!! میری لیلیٰ!!! تم نے مجھے ان قہقہوں کی سنگدلی اور ان ساغروں کی تلخی سے نجات دلا دی۔ میری آنکھیں ان ہاتھوں کو بوسہ دیتی ہیں' جنہوں نے میری ساری قیدیں توڑ دیں۔ میرے ہونٹوں کو بوسہ دو' جنہوں نے جھوٹ بولا اور دل کی بات چھپائی۔ میرے ناتواں پپوٹوں کو اپنی انگلیوں سے' جو میرے خون میں لتھڑی ہوئی ہیں' بند کر دو۔ لیلیٰ! جب میری روح فضا میں پرواز کر جائے' تو یہ خنجر میرے پہلو میں رکھ دینا اور کہہ دینا کہ اس نے حسد اور ناامیدی کے ہجوم سے خود کشی کر لی۔ میری لیلیٰ! میں تمہی سے محبت کرتا تھا۔ تمہارے سوا' میرا اور کوئی مرکز نظر نہ تھا۔ لیکن میں نے اپنے دل' اپنی شرافت اور اپنی زندگی کی قربانی کو اس سے بہتر سمجھا کہ تمہاری شادی کی رات تمہارے ساتھ بھاگ جاؤں۔ میرے دل کی ملکہ! اس سے پہلے کہ لوگ میری لاش کو آکر دیکھیں' مجھے بوسہ دو ——— مجھے پیار کرو ——— مجھے پیار کرو! میری لیلیٰ!!!"

سلیم نے اپنا زخمی ہاتھ دل پر رکھا۔ منکا ڈھلا اور اس کی روح پرواز کر گئی۔

دلہن نے سر اٹھا کر مکان کی طرف دیکھا اور دردناک آواز میں چلا چلا کر کہنے لگی:

"آؤ لوگو! آؤ' دولہا دلہن یہاں ہیں۔ آؤ میں تمہیں اپنی سیج دکھاؤں۔ سونے والو! جاگو!! سرمستو! ہوش میں آؤ!! آؤ! محبت' موت اور زندگی کے راز دیکھنے کے لئے جلدی آؤ!!"

دلہن کی چیخ پکار سے گھر کا گوشہ گوشہ گونج اٹھا۔ جب یہ آواز عیش و نشاط میں ڈوبے ہوئے شرابیوں کے کان میں پہنچی تو ان کی روح لرز گئی۔ حیران و سراسیمہ ہو کر انہوں نے چاروں طرف دیکھنا شروع کیا گویا ان کے کان انہیں دھوکا دے رہے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ اٹھے اور دروازوں سے نکل نکل کر ادھر ادھر متجسس نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ جب انہوں نے دلہن کو مقتول کی لاش کے قریب کھڑا پایا' تو مارے خوف کے الٹے پاؤں بھاگنے لگے۔ ان میں سے کسی کو یہ جرات نہ ہوئی کہ آگے بڑھ کر اصل واقعہ کا کھوج لگاتا۔ دلہن کے ہاتھ میں آبدار خنجر اور مقتول کے سینہ سے خون کے فوارے چھوٹتے دیکھ کر ان کی زبانیں بند ہو گئی تھیں اور زندگی ان کے جسموں میں منجمد۔

دلہن ان کی طرف متوجہ ہوئی۔ اس کا چہرہ الم انگیز ہیبت سے روشن تھا۔ وہ زور سے چلائی:

"بزدلو! قریب آؤ!! اس خنجر سے نہ ڈرو۔ یہ ایک مقدس ہتھیار ہے' جو تمہارے ناپاک جسموں اور تاریک سینوں میں پیوست نہیں ہو سکتا۔ دیکھو! اس خوبصورت نوجوان کو دیکھو!! جو لباس نوشہی میں ملبوس ہے۔ یہ میرا محبوب ہے اور اسے میں نے قتل ہی اس لئے کیا ہے کہ یہ میرا محبوب ہے۔ یہ میرا دولہا ہے اور میں اس کی دلہن۔ ہم نے بہت تلاش کیا' مگر اس دنیا میں' جسے تم لوگوں نے اپنی رواجی پابندیوں سے تنگ' اپنی جہالتوں سے تاریک اور اپنی حرص و طمع سے ناکارہ بنا دیا ہے۔ ہمیں کوئی سیج ایسی نہ ملی' جو ہماری ہم آغوشی کے قابل ہوتی۔ اس لئے ہم نے یہی بہتر سمجھا کہ بادلوں سے پرے ——— دوسرے عالم میں چلے جائیں۔ بزدلو! قریب آؤ! بہت ممکن ہے تم دیکھ لو کہ ہمارے چہروں پر خدا کا نور کھیل رہا ہے اور ہمارے دلوں سے الوہیت کے شیریں نغمے ابل رہے ہیں۔ کہاں ہے وہ غیبانی؟ جس نے میرے حبیب کے متعلق مجھ سے جھوٹی باتیں لگائیں۔ مجھ سے کہا:

"وہ تجھے فراموش کر کے مجھ سے محبت کرنے لگا ہے۔ اس نے مجھ سے محبت ہی اس لئے کی ہے کہ تجھے فراموش کر دے۔"

کیا وہ فتنہ کار یہ سمجھتی تھی کہ میرے اور اس کے رشتہ دار کے سر پر' پادری کا ہاتھ اٹھتے ہی اس نے مجھ پر فتح پالی؟۔ کہاں ہے؟ کہاں ہے؟ وہ دھوکا باز شریف زادی! کہاں ہے؟ وہ جہنمی ناگن! میں اسے دعوت دیتی ہوں' آئے اور دیکھے کہ اس نے تم لوگوں کو میرے حبیب کی

شادی کی خوشیاں منانے کے لئے جمع کیا تھا' نہ کہ اس شخص کی' جسے اس نے میرے لئے انتخاب کیا تھا۔

تم میری گفتگو نہیں سمجھ سکتے ـــــ کہاں پریشان آوازیں اور کہاں فرشتوں کے گیت ـــــ لیکن تم اپنی اولاد کو اس عورت کا قصہ سناؤ گے جس نے شادی کی رات اپنے حبیب کو قتل کر دیا۔ تم میرا ذکر کرو گے اور اپنے گنہگار ہونٹوں سے مجھ پر لعنت بھیجو گے لیکن تمہاری اولاد مجھے مبارک باد دے گی۔ آنے والا زمانہ یقیناً سچائی اور روح کی حکومت کا زمانہ ہوگا۔

اور اے بیوقوف انسان! اپنی کمینگی' حیلے حوالوں اور مال و دولت کے ذریعے مجھے اپنی بیوی بنانے والے! تو اس بدقسمت گروہ کا نمائندہ ہے' جو تاریکی میں نور تلاش کرتا ہے' چٹان سے پانی نکالنا چاہتا ہے اور ریگستان میں پھول کھلنے کا آرزومند ہے۔ اس ملک کا باشندہ ہے' جس نے خود کو اس طرح جہالت کے حوالے کر دیا ہے جیسے اندھا' اپنے تئیں اندھے رہنما کے حوالے کر دے۔ تو اس جھوٹی مردانگی کا نمونہ ہے' جو ہاروں اور چوڑیوں کے لئے گردن اور بانہیں کاٹ ڈالتی ہے۔ جا! میں تجھے معاف کرتی ہوں ـــــ تیری ساری کمزوریوں کو معاف کرتی ہوں' اس لئے کہ شاد کام روح' کوچ کرتے وقت' دنیا کی ساری ذلتوں اور حماقتوں کو معاف کر دیتی ہے۔

دلہن نے خنجر اونچا کیا اور اس پیاسے کی طرح' جو مضطربانہ انداز میں پانی سے بھرا کٹورہ اپنے ہونٹوں سے لگاتا ہے' عزم و ہمت کے ساتھ اپنے سینہ میں پیوست کر لیا اور اپنے حبیب کے پہلو میں گر پڑی ـــــ اس پودے کی طرح' جس کی جڑیں درانتی سے کاٹ دی گئی ہوں۔ عورتوں میں کھلبلی مچ گئی اور انہوں نے خوف و الم کی شدت سے چلا چلا کر رونا شروع کر دیا ان میں سے بعض تو بے ہوش ہو گئیں۔ مردوں میں بھی ایک ہنگامہ برپا ہو گیا اور وہ خوف و دہشت سے لرزتے کانپتے' زخمیوں کے پاس آئے۔ دلہن نے جو نزع کے عالم میں تھی اور جس کے شفاف سینہ سے خون کا فوارہ چھوٹ رہا تھا' ان کی طرف دیکھا اور کہا:

"ملامت کرنے والو! خبردار' ہمارے قریب نہ آنا' نہ ہمارے جسموں کو ایک دوسرے سے علیحدہ کرنا۔ ورنہ وہ مقدس روح جو ہمارے سروں پر سایہ فگن ہے' تمہاری گردنیں دبوچ لے گی اور سنگدلی و بے رحمی کے ساتھ تمہیں زمین پر دے پٹکے گی۔ ہمارے جسموں کو بھوکی زمین کے منہ کا نوالہ بننے دو! جاؤ' زمین کو موقع دو کہ وہ ہمیں اپنے سینہ میں محفوظ کر لے جس طرح وہ بیجوں کو موسم بہار کی آمد تک جاڑے کی برف سے محفوظ رکھتی ہے۔"

دلہن سلیم کی لاش سے اور قریب ہو گئی اور اپنے ہونٹ اس کے سرد ہونٹوں پر رکھ دیئے۔ ٹوٹتے ہوئے یہ الفاظ آخری سانسوں کے ساتھ اس کے منہ سے نکلے:

"میرے حبیب! دیکھو!! میرے من کے دولہا! دیکھو!! حاسد کیسے ہماری سیج کے چاروں طرف کھڑے ہیں۔ ان کی نگاہیں کس طرح ہم پر جمی ہیں۔ سنو! ان کے دانتوں کے بجنے اور پسلیوں کے چٹخنے کی آوازیں سنو!! سلیم! تم نے مدتوں میرے انتظار کی تکلیف برداشت کی۔ دیکھو! اب میں تمہاری ہوں میرے حبیب! ہم بہت دن تاریکیوں میں افسردہ و حیران رہے۔ اب میں نے اپنی ساری قیدیں توڑ دی ہیں اور ساری زنجیریں کاٹ ڈالی ہیں تاکہ ہم سورج کی حرارت و روشنی سے اک نئی زندگی حاصل کریں۔ سلیم! دیکھو' ایک ایک کر کے سارے نقش مٹ چکے ہیں۔ ہر چیز میری نگاہوں سے چھپ گئی ہے۔ اب مجھے تمہارے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ اف! میرے ہونٹ' اچھے سلیم! میرے آخری سانس قبول کرو!! آؤ! میرے پیارے' چلیں!! محبت کا فرشتہ پر تول چکا ہے اور حلقۂ نور کے گرد منڈلا رہا ہے۔"

دلہن نے اپنا سینہ سلیم کے سینہ پر رکھ دیا۔ اس کا خون اس کے خون سے مل گیا' اس کا سر اس کی گردن پر جھک گیا اور اس کی آنکھیں اس کی آنکھوں پر جم گئیں۔

لوگ خاموش کھڑے تھے۔ ان کے چہرے پیلے پڑ گئے تھے اور ٹانگوں میں لرزش پیدا ہو گئی تھی۔ گویا موت کی ہیبت نے ان کی قوت و حرکت کو سلب کر لیا تھا۔

پادری ـــــ افسوں پڑھ کر' دلہن کے لئے ازدواجی ہار گوندھنے والا پادری آگے بڑھا اور ان لاشوں کی طرف اشارہ کر کے' حاضرین سے کرخت لہجہ میں بولا:

"قابل تعزیر ہیں وہ ہاتھ' جو ذلت و جرم کے خون میں لتھڑے ہوئے' ان جسموں کی طرف بڑھیں اور قابل نفرت ہیں وہ آنکھیں جو ان کی موت پر رنج و غم کے آنسو بہائیں۔ شیطان ان کی ناپاک روحوں کو جہنم میں لے گیا ہے۔ پڑا رہنے دو! ان دونوں

لاشوں کو' اس ناپاک زمین پر' جو ان کے خون سے آلودہ ہے۔ پڑا رہنے دو' یہاں تک کہ کتے ان کا گوشت بانٹ کھائیں اور ہوا ان کی ہڈیوں کو اڑا لے جائے۔ لوگو! اپنے اپنے گھر کو واپس جاؤ! بھاگو! اس عفونت سے بھاگو!! جو ان کے دلوں سے پھوٹ رہی ہے۔ ان کے پتلے خطا و قصور کے خمیر سے بنے ہیں اور انہیں خود ان کی رذالت و کمینگی نے پیس کر رکھ دیا ہے۔

کھڑے ہونے والو! ان کے پاس سے ہٹ جاؤ!! جلدی ہٹو' کہیں ایسا نہ ہو کہ جہنمی آگ کے شعلے تمہیں بھی لپیٹ لیں۔

تم میں سے کوئی یہاں نہ رہے ورنہ ذلیل و محروم ہو جائے گا۔ اس کے لئے مقدس ہیکل میں باریابی ناممکن ہوگی' جہاں اہل ایمان نماز عبودیت ادا کرتے ہیں۔"

سوسان ---- وہ لڑکی' جسے دلہن نے قاصد بنا کر سلیم کے پاس بھیجا تھا ---- آگے بڑھی' اس کی پلکیں آنسوؤں سے تر تھیں۔ عزم و ہمت اور جرات و شجاعت کے لہجہ میں اس نے کہا:

"اندھے کافر! ان کی حفاظت کے لئے میں یہاں موجود ہوں۔ صبح ہونے پر' ان جھومتی ہوئی شاخوں کے نیچے میں ان کے لئے قبر کھودوں گی۔ اگر تم نے پھاوڑا میرے ہاتھ سے چھین لیا تو میں اپنی انگلیوں سے زمین کا سینہ چیروں گی اور اگر تم نے میرے ہاتھ بھی جکڑ دیئے تو یہ فرض میں اپنے دانتوں سے انجام دوں گی۔

چلے جاؤ! عطر و لوبان سے بسی ہوئی اس جگہ سے فوراً چلے جاؤ!! خنزیر' پاک خوشبوؤں کو سونگھنے سے بھاگتے ہیں اور چور اچھے گھر کے مالک اور آمد صبح سے ڈرتے ہیں۔

جاؤ! اپنی تاریک خوابگاہوں میں جاؤ!! شہیدان محبت کے سروں پر منڈلاتے ہوئے فرشتوں کے گیت' میل کچیل سے اٹے ہوئے کانوں میں نہیں پہنچ سکتے۔"

لوگ بوڑھے پادری کے سامنے سے ہٹ گئے اور سوسان لاشوں کے پاس کھڑی رہی۔ معلوم ہوتا تھا کہ بیوہ ماں رات کو خاموشی میں اپنے دو بچوں کی حفاظت کر رہی ہے۔ لوگوں کے چلے جانے کے بعد سوسان زار و قطار رونے لگی۔

یہ شمالی لبنان کا بالکل سچا واقعہ ہے جو انیسویں صدی کے نصف آخر میں پیش آیا۔ مجھے اس کی اطلاع اس علاقہ کی ایک معزز خاتون کے ذریعہ ملی۔ جو خود بھی اس کہانی کا ایک کردار ہے۔

(جبران)

زہراب

خزاں کے عہد زریں میں جب کہ شمالی لبنان اپنی پوری رعنائیوں اور نظر فریبیوں کے ساتھ جلوہ فروش ہوتا ہے' ایک دن صبح کو قصبہ تولا کے باشندے' اس گرجا کے قریب جمع ہوئے' جو بیچ آبادی میں واقع ہے اور فارس رحال کے یکایک لاپتہ ہو جانے پر اظہار خیال کرنے لگے۔ یہ سوال ان کے لئے افسوس ناک بھی تھا اور تعجب خیز بھی' کہ اپنی حسین اور نوجوان بیوی کو چھوڑ کر ---- جسے چھ مہینے ہوئے' وہ بڑے چاؤ چوچلوں سے بیاہ کر لایا تھا' فارس رحال کہاں چلا گیا؟

فارس رحال اپنے قصبہ کا سردار تھا' اور یہ سرداری اسے باپ دادا سے ورثہ میں ملی تھی۔ ابھی وہ چوبیس ہی برس کا تھا کہ اس کی شخصیت میں وہ تمام خوبیاں پیدا ہو گئیں جن کی وجہ سے باشندگان تولا اس کے وقار و احترام پر مجبور تھے۔

گزشتہ سال موسم بہار کے وسط میں' جب اس نے سوسان برکات سے شادی کی' تو لوگ کہتے تھے:

"یہ نوجوان کتنا خوش نصیب ہے کہ اسے تیس برس کی عمر سے پہلے ہی وہ تمام سعادتیں حاصل ہو گئیں' جو بجا طور پر' انسان کی مادی زندگی کا ماحصل ہیں!"

لیکن اس دن صبح کو' جب تولا کے باشندے' خواب راحت سے بیدار ہوئے اور ان سے کہا گیا کہ شیخ فارس اپنی ساری جمع جکڑی لے کر' عزیزوں اور دوستوں سے ملے بغیر' گھوڑے کی پیٹھ پر کہیں چلا گیا' تو ان کے دل میں شکوک و شبہات پیدا ہوئے اور وہ ان مخفی اسباب کا پتہ لگانے لگے' جن کی بنا پر اس نے اپنی بیوی' اپنے گھربار' اپنی زمینیں' اپنے باغات اور اہل وطن سب کو چھوڑ دیا۔

شمالی لبنان کی طرز معاشرت' دنیا کے اور تمام نظاموں کے مقابلہ میں' اشتراکی نظام سے قریب تر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی کے رنج و راحت میں' ایک دوسرے کا ساتھ

دینا' وہاں کے لوگوں کی فطرت میں داخل ہے' چنانچہ گردش روزگار جب انہیں کسی نئے حادثہ سے دوچار کرتی ہے' تو وہ اپنی تمام تر توجہ اس کے اسباب و علل کی جستجو میں صرف کر دیتے ہیں اور ان کی یہ جستجو ختم نہیں ہوتی' جب تک کہ زمانہ کوئی اور مسئلہ ان کے سامنے پیش نہ کر دے۔

یہی اجتماعی مزاج تھا' جس کی بنا پر' تولا کے باشندے اپنے کام کاج سے بے پروا ہو کر' مارتولا کے گرجے کے قریب جمع ہوئے اور فارس رحال کے اچانک چلے جانے پر گفت و شنید اور قیاس آرائیاں کرنے لگے۔

ابھی لوگوں میں چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں کہ قصبہ کا پادری اسطفان' گردن ڈالے' ان کی طرف آتا دکھائی دیا۔ اس کے چہرہ پر فکر و کدورت کے آثار تھے۔ مجمع اسطفان کے قریب پہنچا اور فارس رحال کے متعلق طرح طرح کے سوالات کرنے لگا' لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا اور خاموش کھڑا کف افسوس ملتا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے کہا:

"کچھ نہ پوچھو! میرے بچو! مجھ سے کچھ نہ پوچھو!! مجھے صرف اتنا معلوم ہے کہ صبح ہونے سے ذرا پہلے فارس نے میرے دروازہ کی کنڈی کھٹکھٹائی' میں نے دروازہ کھولا' تو وہ گھوڑے کی باگ تھامے کھڑا تھا۔ اس وقت اس کے چہرہ پر انتہائی رنج و ملال کے آثار تھے۔ حیرت زدہ ہو کر میں نے وجہ پوچھی تو کہا:

"آپ سے رخصت ہونے آیا ہوں۔ میں سمندر پار جا رہا ہوں اور اس ارادہ کے ساتھ کہ اب جیتے جی واپس نہ آؤں گا۔"

یہ کہہ کر اس نے مجھے اپنے دوست نجیب مالک کے نام ایک خط دیا اور تاکید کی کہ دست بدست پہنچا دیا جائے۔ خط دے کر وہ گھوڑے پر سوار ہوا اور اسے ایڑ لگا کر یہ جا وہ جا' اس نے مجھے اتنا موقع بھی نہ دیا کہ میں اس سے تفصیل کے ساتھ عزم سفر کا سبب دریافت کرتا۔

جو کچھ میرے علم میں تھا۔ میں نے تمہیں بتا دیا۔ اب اس سے زیادہ مجھ سے کچھ نہ پوچھو!"

مجمع میں سے ایک شخص بولا:

"نجیب مالک قصبہ میں اس کا سب سے گہرا دوست تھا اس لئے لازمی طور پر اس نے اپنے وطن چھوڑنے کی ساری کیفیت' اس خط میں لکھی ہوگی۔"

دوسرے نے پوچھا:

"کیا آپ نے اس کی بیوی کو بھی کہیں دیکھا ہے؟"

پادری نے جواب دیا:

"ہاں! میں نے اسے صبح کی عبادت کے بعد دیکھا تھا۔ وہ کھڑکی کے پاس بیٹھی' جامد نگاہوں سے کہیں دور دیکھ رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے حواس گم ہیں۔ فارس کے متعلق' جب میں نے اس سے پوچھا' تو اس نے مڑ کر مجھے دیکھا اور جواب دیا:

"مجھے کچھ معلوم نہیں! میں کچھ نہیں جانتی!!"

یہ کہا اور بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگی۔

ابھی پادری کی بات پوری نہ ہوئی تھی کہ قصبہ کی مشرقی جانب سے بندوق چلنے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ایک عورت کے رونے پیٹنے کی آواز سنائی دی' جس نے فضا میں ایک ہیجان سا پیدا کر دیا۔ لوگ تھوڑی دیر تک تو حیران و خاموش کھڑے رہے' لیکن اس کے بعد سب کے سب' جن میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی ---- چہروں پر خوف و بدبختی کی نقاب ڈالے' آواز کی سمت دوڑے۔

جب وہ فارس رحال کی کوٹھی کے پائیں باغ میں پہنچے تو انہوں نے ایک خوفناک منظر دیکھا' جس کے اثر سے ان کے دماغ معطل ہو گئے تھے اور خون ان کی رگوں میں جم کر رہ گیا ---- انہوں نے دیکھا کہ نجیب مالک خون میں لتھڑا پڑا ہے اور فارس رحال کی بیوی' سوسان اس کے پاس بیٹھی' اپنے بال نوچ نوچ کر اور کپڑے پھاڑ پھاڑ کر دردناک آواز میں چلا رہی ہے:

"اس نے خودکشی کر لی! اس نے اپنے سینہ میں بندوق مار لی۔"

لوگ حیرت زدہ کھڑے تھے' گویا موت کے فرشتہ کی غیر مرئی انگلیوں نے ان کی روحوں کو دبوچ رکھا تھا۔ پادری لاش کے قریب آیا اس نے دیکھا کہ مقتول کے دائیں ہاتھ میں فارس رحال کا خط ہے' جو آج ہی صبح' اس نے صاحب مکتوب کی خواہش کے مطابق' اسے دست بدست پہنچایا تھا۔ مقتول نے خط کو اتنی قوت سے پکڑ رکھا تھا۔ گویا چاہتا تھا' اسے اپنی انگلیوں کا جزو بنا لے۔ پادری نے وہ خط اس کے ہاتھ سے لے کر' اپنی

جیب میں رکھ لیا' اس طرح کہ کوئی دیکھنے نہ پائے اور منہ پیٹتا ہوا دو چار قدم پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔

لوگ نجیب مالک کی لاش کو اس کی بیوہ ماں کے گھر لے گئے۔ اس بیچاری نے جونہی اپنے اکلوتے بچے کو اس حالت میں دیکھا' غش کھا کر کھڑے قد زمین پر گر پڑی۔

کچھ عورتیں فارس رحال کے ترک وطن اور نجیب مالک کی خودکشی کے سلسلہ میں فارس رحال کی بیوی کو مورد الزام ٹھہرا رہی تھیں کہ اسے ادھ موئی حالت میں اندر پہنچا دیا گیا۔

اسلفان اپنے گھر آیا اور دروازہ بند کر کے اپنی جیب سے وہ خط نکالا' جو اس نے نجیب مالک کے ہاتھ سے لیا تھا۔ لرزتی کانپتی آواز میں اس نے پڑھنا شروع کیا:

"بھائی نجیب!

میں ترک وطن کر رہا ہوں' اس لئے کہ میرا وجود' صرف تمہارے اور میری بیوی کے لئے ہی نہیں' خود میرے واسطے بھی موجب بدبختی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تم شریف النفس ہو اور تم نے اپنے دوست کی ——— جو تمہارا ہمسایہ بھی ہے ——— امانت میں خیانت نہیں کی۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ میری بیوی سوسان پاک دامن ہے' لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ محبت' جس نے تمہارے اور سوسان کے دل کو ایک کر دیا ہے' تم دونوں کے ارادہ و اختیار سے باہر ہے۔ تم چاہو بھی' تو اسے محو نہیں کر سکتے' جس طرح تم نہر قادیشا کے بہاؤ کو نہیں روک سکتے۔

نجیب! تم میرے بچپن کے دوست ہو' جب کہ ہم دونوں باغوں' کھیتوں' میدانوں اور گرجا کے صحن میں کھیلتے پھرتے تھے۔ اور میں خدا کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ اس وقت بھی تم میرے لئے ویسے ہی دوست ہو' جیسے پہلے تھے۔ مجھے امید ہے کہ تم بھی مجھے ہمیشہ اسی طرح سمجھو گے' جس طرح ہمیشہ سے سمجھتے چلے آئے ہو۔

کل یا اس کے بعد سوسان سے اگر ملو تو کہہ دینا' میرے دل میں اس کی طرف سے کوئی بدگمانی یا رنجش نہیں ہے۔ میں اسے اب بھی محبت اور مہربانی کے قابل سمجھتا ہوں اور جیتے جی سمجھتا رہوں گا۔ اسے یہ بھی بتا دینا کہ جب میں آدھی رات کو بیدار ہوا اور میں نے دیکھا کہ وہ حضرت مسیح کی مورت کے سامنے دو زانوں بیٹھی' گریہ وزاری اور اپنے دل کے لئے صبر و سکون کی التجا کر رہی ہے' تو میرا دل شفقت و ہمدردی کے جذبات سے پس پس گیا۔

دنیا کی کوئی دشواری اور کوئی تکلیف ایسی نہیں' جو اس عورت کی زندگی کے مقابلہ میں پیش کی جا سکے' جس کے ایک طرف اس کا محب ہو اور دوسری طرف محبوب!

غریب سوسان مستقل طور پر اسی کشمکش میں مبتلا تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ بیوی ہونے کی حیثیت سے جو فرائض اس پر عائد ہوتے ہیں' انہیں انجام دے لیکن وہ اپنے ہاتھوں' اپنے جذبات کا گلا بھی نہیں گھونٹ سکتی تھی۔ اسی لئے میں ایک دور دراز مقام پر جا رہا ہوں اور اس نیت سے کہ کبھی واپس نہ آؤں گا۔ میں نہیں چاہتا کہ تم دونوں کی کامیابیوں اور کامرانیوں کے راستہ کا بھاری پتھر بنوں!

آخر میں مجھے امید ہے کہ تم سوسان سے خلوص و محبت کا رشتہ قائم رکھو گے اور آخری دم تک اس کی حفاظت کرو گے۔ اس نے تمہارے لئے اپنی ہر چیز قربان کر دی' اس لئے وہ ہر اس مہربانی اور دلسوزی کی مستحق ہے جو ایک مرد' عورت کے ساتھ کر سکتا ہے۔

نجیب! خدا کرے تم ہمیشہ شریف القلب اور بلند حوصلہ رہو! خدا تمہیں ہمیشہ اپنی پناہ میں رکھے!!!

تمہارا بھائی ——— فارس رحال"

خط پڑھنے کے بعد اسلفان نے اسے تہ کر کے جیب میں رکھ لیا اور کھڑکی کے پاس بیٹھ کر دور وادی کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے سکڑے ہوئے خدوخال بتا رہے تھے کہ اس وقت وہ کسی گہری فکر میں مبتلا ہے۔

لیکن ایک منٹ بھی نہ گزرنے پایا تھا کہ وہ ایک دم کھڑا ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس نے اپنے افکار کی تہ میں ایک دقیق اور ہولناک راز پا لیا ہے ——— وہ دقیق اور ہولناک راز' جو ظاہری پردوں میں چھپا ہوا اور سطحی چادروں میں لپٹا ہوا تھا۔ وہ چلایا:

"فارس رحال تو کس قدر چالاک ہے! میں سمجھ گیا' تو نے ابن مالک کو کس طرح قتل

کیا اور پھر کس طرح اس کے خون سے بری رہا۔ تونے زہر بھیجا لیکن شہد ملا کر' تو نے اسے تلوار بھیجی لیکن ریشم و حریر میں لپیٹ کر۔ تونے اس کے پاس فرشتہ اجل کو بھیج لیکن خط کی تہوں میں ملفوف کرکے۔ جب اس نے بندوق کا رخ اپنے سینہ کی طرف کیا تو اس کا ہاتھ تیرے ہاتھ کی گرفت میں تھا اور اس کا ارادہ تیرے ارادہ کے تا ———— اف! فارس رحال تو کس قدر عیار ہے!!"

اسلطان دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ بار بار سرہلاتا اور اپنی انگلیوں سے داڑھی میں کنگھی کرتا رہا۔ اس کے ہونٹوں پر معنی خیز تبسم ———— المیہ ڈرامہ سے زیادہ ہولناک تبسم۔

تھوڑی دیر کے بعد' اس نے قریب کی الماری میں سے ایک کتاب نکالی اور افرا سیابی کے پاکیزہ اشعار گنگنانے لگا۔ کبھی کبھی بیچ آبادی سے آتی ہوئی عورتوں کی چیخ پکا سننے کے لئے وہ آنکھ اٹھا کر ادھر دیکھ بھی لیتا تھا۔

جوانی اور محبت

یہ نوجوان جس کا ذکر میں تمہارے سامنے کر رہا ہوں عین عنفوان شباب میں تھا۔ اس وقت وہ ایک یکہ و تنہا مکان میں اپنی میز پر بیٹھا تھا۔ وہ کچھ سوچ رہا تھا۔ کبھی وہ کھڑکی میں سے منہ نکال کر آسمان پر چمکتے ہوئے ستاروں کو دیکھنے لگتا اور کبھی اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی ایک دوشیزہ کی تصویر پر نظریں جما لیتا اس تصویر کے رنگ اور خدوخال جو کسی عظیم فنکار کا نتیجہ فکر تھے اس کے قلب و نظر میں پوری طرح منعکس ہو چکے تھے اور دنیا و مافیہا اور ابدیت کے تمام اسرار منکشف کر رہے تھے۔

عورت کی تصویر نوجوان کے ساتھ ہمکلام ہونے لگی۔ اب اس کی آنکھیں کانوں میں تبدیل ہو گئیں۔ وہ ہمہ تن گوش ہو گیا اور اس کی باتیں سننے لگا۔ اب وہ ان تمام روحوں کی زبان سمجھ رہا تھا۔ جو اس کے کمرے پر منڈلا رہی تھیں۔ اس کا دل اب محبت سے معمور ہو گیا۔

یہ کئی گھنٹوں کا وقفہ ایک خوبصورت خواب کا ایک لمحہ اور ابدی زندگی میں گزرا ہوا ایک سال معلوم ہونے لگا۔

اب نوجوان نے اس تصویر کو اپنے سامنے رکھ لیا اور قلم اٹھا کر اپنے جذبات کو صفحہ قرطاس پر پھیلانے لگا۔

"اے میری محبوبہ وہ عظیم سچائی جو کارگہ فطرت میں کارفرما ہے۔ اسے ایک شخص سے دوسرے ذی روح تک پہنچنے میں کسی قسم کے تکلم کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ سچائی محبت کرنے والی روحوں سے ہمکلام ہونے کے لیے ہمیشہ سکوت و خامشی سے ہی کام لیتی ہے۔

میں اچھی طرح سمجھتا ہوں کہ ہمارے دلوں کے درمیان رات کی خاموشی پیام رسانی کا بہترین ذریعہ ہے۔ کیونکہ رات کی خاموشی ایک دوسرے کو محبت کے پیام پہنچاتی رہتی

ہے اور ہماری مسرتوں کے گیت گاتی رہتی ہے۔ جس طرح دست قدرت نے ہماری روحوں کو جسموں میں قید کر دیا ہے' اسی طرح محبت نے ہمیں الفاظ و تکلم کی پابندیوں میں جکڑ رکھا ہے۔

اے میری محبوبہ! لوگ کہتے ہیں کہ آدمی کے دل میں محبت ایک ایسا شعلہ ہے جو انسان کو فنا کر دیتا ہے۔ جب ہماری پہلی ملاقات ہوئی تو مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے میں تمہیں صدیوں سے جانتا ہوں۔ اور جس وقت ہم ایک دوسرے سے الوداع ہونے لگے تو مجھے مکمل یقین ہو گیا کہ دنیا کی کوئی طاقت ہمیں ایک دوسرے سے الگ نہیں کر سکتی۔

محبت کی پہلی نظر دراصل پہلی نظر نہ تھی۔ جس وقت ہمارے دلوں کی دھڑکنیں باہم دگر ہم آہنگ ہوئیں تو ہمارے دلوں نے گویا ابدیت اور روح کی ہمیشگی اور فنا نہ ہونے والی حقیقتوں کی تصدیق کر دی۔

ایسی ساعتوں میں فطرت تمام پردوں کو چاک کر دیتی ہے۔ اور مظلوم کے لیے ایک قائم و دائم انصاف کا پیام دیتی ہے۔

اے میری محبوبہ کیا تمہیں وہ ندی یاد ہے جس کے کنارے بیٹھ کر ہم ایک دوسرے کی طرف محبت بھری نگاہوں سے تک رہے تھے۔ شاید تمہیں اس امر کی حقیقت کی آگہی نہیں کہ اس وقت تمہاری آنکھوں نے مجھے صاف الفاظ میں یہ پیغام دے دیا تھا کہ محبت کے جو جذبات تم میرے لیے رکھتی ہو وہ جذبہ ترحم کی پیداوار نہیں بلکہ اس کے سوتے انصاف کے چشمہ سے پھوٹے ہیں اور اب میں اپنے اور دنیا کے سامنے اس حقیقت کا اعلان کر سکتا ہوں کہ وہ انعام و اکرام جس کا منبع احساس انصاف پر ہو وہ جود و سخا اور جذبہ ترحم سے حاصل کیے ہوئے انعامات سے کہیں عظیم اور برتر ہے۔

"اور وہ محبت جو محض اتفاقات کی پیداوار ہوتی ہے وہ دلدل میں رکے ہوئے پانی کی طرح ہوتی ہے۔"

"اے میری محبوبہ! اس وقت میرے سامنے ایسی زندگی ہے جس کو میں عظمت اور حسن سے معمور کر سکتا ہوں۔ اس زندگی کی ابتدا ہماری پہلی ملاقات سے ہوئی تھی لیکن یہ ابدیت تک قائم رہے گی۔"

اب میں بالکل تمہارے بس میں ہوں۔ اور تم ان تمام صلاحیتوں کو جو خدا نے ہمیں ودیعت کی ہیں۔ بروئے کار لا سکتی ہو۔ اور جس طرح سورج کی روشنی خوبصورت اور معطر پھولوں کو زندگی بخشتی ہے۔ تم میرے عظیم الفاظ اور کارناموں کو مشہود شکل عطا کر سکتی ہو۔

"اس طرح میری محبت تمہارے لئے ہمیشہ قائم رہے گی۔"

نوجوان اب کمرے میں ادھر ادھر گھومنے لگا۔ اس نے کھڑکی سے منہ باہر نکال کر دیکھا کہ چاند افق سے طلوع ہو کر آسمان کی وسعتوں اور پہنائیوں میں نرم و نازک نور پھیلانے میں مصروف ہے۔

یہ دیکھ کر اب پھر وہ اپنی میز پر جا بیٹھا اور لکھنے میں مصروف ہو گیا۔

"اے میری محبوبہ مجھے معاف کرنا۔ اب تک میں تمہیں صیغہ واحد حاضر میں ایک دیگر جسم و جان سمجھ کر ہی ہمکلام ہوتا رہا ہوں۔ حالانکہ تم میرے وجود کا ایک حصہ ہو اور بہترین حصہ ہو۔ آج تک میں اس راز کو نہ سمجھ سکا تھا اس لیے اے میری محبوبہ! مجھے معاف کر دینا۔"

پردے کے پیچھے

راحیل آدھی رات کو بیدار ہوئی اور اس نے کھڑکی میں سے باہر آسمان کی طرف ایک غیر مرئی شے کو دیکھا۔

اس نے ایک آواز سنی جو زندگی کی سرگوشیوں سے زیادہ راحت انگیز تھی۔ اس کے ساتھ ہی ورطہ آب کی گریہ وزاری سے زیادہ اندوہناک۔

------ سفید پروں کی سرسراہٹ سے زیادہ نرم و نازک۔

------ اور موجوں کے پیغام سے زیادہ عمیق....!

------ اس میں امید اور بے اثری کی رو دوڑ رہی تھی'

------ اس میں مسرت اور مصیبت کے جذبات نمایاں تھے'

------ اس میں زندگی کی محبت اور موت کی آرزو دونوں چیزیں موجود تھیں۔

راحیل نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور آہ بھری اور دم واپسیں سے یہ کہا۔

"صبح وادی کے آخری کنارے تک پہنچ گئی ہے۔ ہمیں اب سورج کی طرف چلنا چاہئے تاکہ وہاں ہم اس سے ملاقات کریں۔"

اس کے ہونٹ ایک دوسرے سے نہ مل سکے۔ روح کی گہرائیوں میں ایک گہرے زخم کی گونج پیدا ہوئی.....!

اس موقع پر پجاری اس کے نزدیک آیا' اس کا ہاتھ چھوا جو برف کی طرح ٹھنڈا تھا۔

اس نے خوف زدہ ہو کر اپنا ہاتھ راحیل کے دل پر رکھا۔ اس نے محسوس کیا کہ یہ زمانوں کی طرف غیر متحرک اور اس کے دل کے راز کی طرح خاموش ہے!

مقدس پجاری نے گہری مایوسی کے ساتھ اپنا سر جھکا لیا' اس کے ہونٹ کانپنے لگے گویا کوئی مقدس لفظ کہنے کے لئے بے تاب ہے جو رات کی روحیں دور دراز اور سنسان وادیوں میں دہرایا کرتی ہیں۔

پجاری نے راحیل کے دونوں ہاتھ اس کے سینے پر باندھ دیئے اور پھر اس شخص کی طرف دیکھا جو کمرے کے تاریک کونے میں بیٹھا تھا۔ پجاری نے کہا۔

"تمہاری محبوبہ روشنی کے بہت بڑے حلقے میں داخل ہو گئی ہے۔ میرے بھائی! ------ میرے نزدیک آجاؤ اور میرے ساتھ مل کر گھٹنوں کے بل دعا کرو۔"

غم زدہ خاوند نے اپنا سر اٹھایا اور اس کی آنکھیں بہت دور ان دیکھی چیز کو دیکھ رہی تھیں۔ اس کے خدوخال میں ایک تبدیلی سی پیدا ہوئی۔ گویا اس نے ناشناس خدا کی روح میں ایک ادراک پالیا ہے۔

اس نے اپنی شخصیت کے باقی ماندہ پادریوں کو اکٹھا کیا اور اپنی جگہ سے بڑے ادب سے اٹھ کر اپنی بیوی کے بستر پر پہنچا۔ وہ پجاری کے ساتھ لاش کے سامنے دوزانو ہو گیا جو سینے پر صلیب کا نشان بناتے ہوئے ماتمی دعا میں مصروف تھا۔

پادری نے اپنا ہاتھ غمگین خاوند کے کاندھے پر رکھتے ہوئے کہا۔

"میرے بھائی تم دوسرے کمرے میں چلے جاؤ تمہیں آرام کی بے حد ضرورت ہے۔"

خاوند نے حکم کی تعمیل کی اور خاموشی سے اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ وہاں اس نے اپنے تھکے ہوئے جسم کو ایک چارپائی پر گرا دیا اور لیٹتے ہی وہ اس طرح محو خواب ہو گیا جیسے کوئی بچہ اپنی ماں کی گود میں سو جاتا ہے۔

پجاری کمرے کے وسط میں بت بنا کھڑا رہا اور ایک عجیب و غریب آویزش اس کے سینے میں برپا تھی۔

اور اس نے پہلے تو اس نوجوان عورت کے ٹھنڈے جسم کی طرف دیکھا پھر دروازے کے پردے میں سے اس نے خاوند کو دیکھا جو نیند کی آغوش میں مدہوش پڑا تھا....!

ایک گھنٹہ گزر گیا اور یہ ساعت کئی زمانوں سے زیادہ طویل اور موت سے زیادہ ہولناک تھی..... اور پجاری ابھی تک ان دو مجبور روحوں کا دربان بن کر کھڑا تھا------

------ ایک روح اس کھیت کی طرح محو خواب تھی جو خزاں کے المیہ کے بعد بہار

کا منتظر ہو۔

اور دوسری روح ابد کی نیند سو چکی تھی۔

پھر پجاری نوجوان عورت کی لاش کے قریب آیا اور اس طرح دوزانو ہوا گو معبد میں بڑے بت کے سامنے جھک گیا ہے۔ اس نے یخ ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیا اور کانپتے ہوئے ہونٹوں سے ان پر بوسہ دیا۔ اور پھر اس نے حسین چہرے کی طرف دیکھا جس پر موت کا نرم گداز پردہ چھایا ہوا تھا۔

اس کی آواز میں رات کی سی خاموشی اور بڑے شگاف کی طرح گہرائی تھی۔ لیکن اس کی یہ آواز انسان کی امیدوں کی طرح لرز رہی تھی۔

اس نے روتے ہوئے کہا۔

"اے راحیل! اے میری روح کی دلہن! میری آواز سن' آخر کار میری بھی زبان کھل گئی۔ موت نے میرے ہونٹوں کو جنبش دی ہے.... میں وہ راز بے نقاب کرنے لگا ہوں جو میری زندگی سے بھی زیادہ قیمتی تھا۔

درد سے میرے زخموں کے تمام ٹانکے ٹوٹ گئے اور میں اب وہ راز بیان کرنے لگا ہوں جو اس درد سے بھی زیادہ دردناک ہے۔

اے روح پاک! تو تو اس وقت آسمان اور زمین کے درمیان سفر کر رہی ہے میری روح کی چیخ سن!

اس جوان کی آواز بھی سن جو کھیتوں میں تیرا منتظر رہتا تھا اور تیرے لازوال حسن سے مرعوب ہو کر درختوں کی اوٹ میں کھڑا رہتا تھا۔

اس پجاری کی آواز سن جو صرف اس وقت تم سے ندامت کے احساس کے بغیر تم سے بات کر رہا ہے جب کہ تم خدا کے شہر میں پہنچ چکی ہو۔

میں نے تیری زندگی میں اپنا راز سینے میں دبا کر محبت کی قوت کو ثابت کر دیا ہے۔"

اس کے بعد پجاری جھک گیا اور اپنی روح کے سارے دریچے کھول کر خوابیدہ حسن کی پیشانی آنکھوں اور گلے پر تین طویل بوسے ثبت کر دیئے۔

ان تین بوسوں میں اس نے اپنی زندگی کے کئی برسوں کا راز درد اور اندوہ الٹ کر رکھ دیا....!

پھر اچانک وہ پیچھے ہٹ گیا اور خزاں کے پتے کی طرح کانپتا ہوا ایک کونے میں گر پڑا۔ گویا اس عورت کے ٹھنڈے جسم نے اس کے اندر پشیمانی کا جذبہ ابھار دیا دوزانو ہو کر اس نے اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا اور وہ نرم آواز میں سرگوشی کرنے لگا۔

"خدا.... میرا گناہ معاف کر دے' میری کمزوری پر نظر نہ رکھ' تم جانتے ہی ہو یہ راز بے نقاب کرنے کے بعد میں خواہش کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔۔۔۔۔۔ سات برس تک یہ راز میں نے اپنے سینے میں چھپائے رکھا اور صرف موت ہی نے مجھ سے یہ راز میرے سینے سے الگ کر دیا۔

اے خدا! میری امداد کر۔ تاکہ میں ان خوف ناک لیکن حسین یادوں کو بھلا سکوں جو زندگی کے لئے تو ایک رس پیدا کرتی ہیں۔ لیکن تیرے نزدیک وہ ایک تلخی کا انبار ہیں۔

اے آقا! مجھے معاف کر دیجئے' اے آقا! میری کمزوری کو بھی معاف کر دینا۔

اس نوجوان عورت کی لاش کی طرف دیکھے بغیر پجاری رات بھر اپنے درد ناک جذبات کا اظہار کرتا رہا۔

نور کا تڑکا ہوا اور دو بے حس و حرکت تصویروں پر گلابی سا پردہ نظر آنے لگا۔

ایک تصویر میں مذہب اور محبت کی جنگ کا نقشہ نظر آ رہا تھا۔

اور دوسری تصویر پر زندگی اور موت کا اطمینان برس رہا تھا....

میلے میں

کسی دیہات سے ایک خوب صورت لڑکی ایک میلے میں آئی------ کہتے ہیں بڑی ہی حسین تھی وہ دوشیزہ!

اس کے چہرے پر سوسن اور گلاب کی سی تازگی تھی۔ بالوں میں ڈوبتے ہوئے سورج کی سنہری کرنوں کی جھلملاہٹ تھی۔

اور ہونٹوں پر طلوع صبح کی مسکراہٹ!

جیسے ہی میلے میں' یہ حسین اجنبی دوشیزہ دکھائی دی' جوانوں کی بھیڑ نے اسے اپنے گھیرے میں لے لیا---------- ایک اس کے ساتھ رقص کر رہا تھا۔ تو دوسرا اس کے اعزاز میں شراب کے خم لنڈھا رہا تھا۔ اور اس کے گلابی گال چومنے کی ہوس میں تو سبھی بے تاب ہو رہے تھے۔

آخر وہ بھی تو میلے ہی میں آئے ہوئے تھے نا

لیکن حسین دوشیزہ پریشان تھی۔ گھبرا رہی تھی' جوانوں کی بھیڑ میں اس کا دم گھٹا جا رہا تھا' اسے ان سے وحشت ہو رہی تھی وہ انہیں کوسنے دے رہی تھی---------- اور ایک کے تو اس نے تھپڑ بھی جڑ دیا تھا---------- آخر وہ ان سے بھاگ کر دور چلی گئی!

"اف توبہ ہے' ناک میں دم کر دیا" اس شام گاؤں لوٹتے ہوئے' راستے میں وہ اپنے آپ سے کہہ رہی تھی۔

"کس قدر ناشائستہ اور بدتمیز ہیں' یہ نوجوان------- ناقابل برداشت ہیں۔ بابا یہ سب لوگ!"

ایک سال گزر گیا۔ اور وہ حسین دوشیزہ سال بھر میلے اور نوجوانوں کی یاد میں ڈوبی رہی میلے اور نوجوانوں کے خیال میں کھوئی رہی۔ سال بعد وہ پھر چہرے پر سوسن اور گلاب کا سا نکھار بالوں میں ڈوبتے ہوئے سورج کی سنہری کرنوں کی جھلملاہٹ اور ہونٹوں پر طلوع صبح کی مسکراہٹ لئے' میلے میں آئی! لیکن اب جو جوان بھی اسے دیکھتا' منہ پھیر لیتا------- سارا دن گزر گیا۔ نہ کسی نے اسے بلایا' نہ کسی نے اس سے بات کی------- وہ تنہا ہی میلے میں پھرتی رہی۔

اور اس بار رات گئے گاؤں لوٹتے ہوئے' وہ اپنے آپ سے کہہ رہی تھی

"ہائے توبہ! ناک میں دم ہے کس قدر بداخلاق اور بداطوار ہیں یہ نوجوان--------- ناقابل برداشت ہیں بابا' یہ سب لوگ!"

موسیقی

میں اپنی محبوبہ کے پاس بیٹھا اس کی باتوں کا لطف اٹھا رہا تھا۔ یکایک میری روح لامحدود خلاؤں میں جہاں ساری کائنات ایک خواب اور جسم ایک تنگ و تاریک قید خانہ نظر آتا ہے گھومنے لگی۔

میری محبوبہ کی مسحور کن آواز میرے دل کی گہرائیوں میں اترنے لگی۔ اے میرے دوست یہ بھی ایک نغمہ ہے۔ میں نے یہ نغمہ اپنی محبوبہ کی سانسوں اور ان الفاظ میں سنا جو ابھی زیر لب تھے۔

میں نے اپنی قوت سماعت کے ذریعے اپنی محبوبہ کے دل کا مشاہدہ کر لیا۔

اے میرے دوستو! موسیقی روحوں کی زبان ہے۔ اس کے نغمات شوخ شنگ بادِ نسیم کی طرح ہیں۔ جو دل کے تاروں میں محبت کا ارتعاش پیدا کرتے ہیں جب موسیقی کی نرم و نازک انگلیاں جذبات کے دروازے پر دستک دیتی ہیں تو وہ ان تمام یادوں کو تازہ کر دیتی ہیں۔ جو اس سے پہلے ماضی کے پردوں میں چھپی ہوئی ہوتی ہیں۔ موسیقی کی افسردہ بھری سریں افسوسناک واقعات کی یاد دلاتی ہیں اور طربیہ سریں مسرت و خوشی کے لمحات کو تازہ کرتی ہیں۔ کبھی یہ سریں کسی عزیز و اقارب کے سانحہ ارتحال کی یاد دلاتی ہیں اور کبھی یہی سریں ہماری مسکراہٹ کا باعث بنتی ہیں۔

روح موسیقی کی جان ہے اور دل اس کا ذہن ہے۔ جس وقت خدا نے انسان کو پیدا کیا تو اس نے موسیقی کی زبان بھی عطا کی جو باقی زبانوں سے بالکل مختلف تھی۔ شروع کا انسان جنگلوں میں گیت گاتا رہا۔ موسیقی کی عظمت و شان کے گیت سن کر بادشاہوں کے دل جنگلوں کی طرف کھنچنے لگے اور بہتوں نے تو اپنے تخت چھوڑ کر جنگل کی راہ لی۔

ہماری روحیں نرم و نازک پھولوں کی طرح ہیں جن کا وجود تقدیر کی ہواؤں کے رحم و کرم پر ہے وہ صبح کے وقت بادِ نسیم کے سامنے کانپتی ہیں اور جب شبنم پڑتی ہے تو اپنی گردنیں جھکا لیتی ہیں۔

پرندوں کے نغمے انسان کو نیند سے بیدار کرتے ہیں۔ اور اس ابدی عقل کی تسبیح میں شریک ہونے کی دعوت دیتے ہیں جس نے پرندوں کے نغمے پیدا کئے۔

یہ نغمات سننے کے بعد ہم اپنے آپ کو پرانی کتابوں میں مخفی اسرار اور ان کے معانی پوچھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

جب پرندے گاتے ہیں تو کیا وہ باغوں، کھیتوں اور پھولوں کو آوازیں دیتے ہیں؟ یا وہ درختوں اور پودوں سے مصروف تکلم ہوتے ہیں؟ اور یا پھر کیا وہ ندیوں کی صدائے بازگشت ہیں؟ انسان باوجود اپنے علم و فضل کے یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ پرندے کیا کہتے ہیں۔ نہ وہ یہ سمجھ سکتا ہے کہ ندی کیا گنگناتی ہے۔ وہ یہ بات سمجھنے کے بھی قابل نہیں ہے کہ سمندر کی لہریں ساحل سے بار بار لپٹ کر کیا سرگوشیاں کر رہی ہیں۔

انسان اپنی عقل و خرد اور فہم و ادراک کے باوجود یہ نہیں جان سکتا کہ بارش کے قطرے درختوں کے پتوں سے ہمکنار ہو کر یا کھڑکیوں کے شیشوں پر دستک دے کر کیا گفتگو کرتے ہیں۔ وہ یہ راز بھی سمجھنے سے قاصر ہے کہ بادِ نسیم پھولوں کے کانوں میں کیا پیغام سناتی ہے۔

لیکن انسان کا دل ان تمام جذبات اور ان آوازوں کے تمام تر معانی اور مطالب کو اچھی طرح سمجھتا ہے جو اس کے دل کی گہرائیوں میں وارد ہوتے ہیں۔ حقیقت کل بعض اوقات اس کے ساتھ ایک پراسرار زبان میں ہمکلام ہوتی ہے روح اور فطرت دونوں ایک دوسرے کے انداز تکلم کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ وہ اکثر ہمکلام ہوتے ہیں۔ لیکن انسان چپ چاپ اور خاموش حیرت زدہ ہو کر ان کی طرف تکتا رہتا ہے۔

کیا بعض اوقات انسان ان آوازوں کو سن کر رو نہیں دیتا اور کیا اس کے یہ آنسو اس کے فہم و ادراک کی فصاحت کا اظہار نہیں ہوتے؟

وجدانی موسیقی!
روح محبت کی دختر!
تلخ و شیریں جام!
انسانی قلوب کا خواب اور رنج و الم کا ثمر

مسرت کا پھول۔ جذبات کی شگفتگی اور خوشبو۔
محبت کرنے والوں کی زبان اور منکشف اسرار۔
چھپی ہوئی محبت کے آنسوؤں کی ماں۔
شاعروں' موسیقاروں اور فنکاروں کا وجدان۔
الفاظ کے انتشا میں وحدت فکر۔
حسن کی دولت سے محبت بخشنے والی۔
اعلیٰ دلوں کو خوابوں کی دنیا عطا کرنے والی۔
سپاہیوں کی حوصلہ افزائی کرنے والی۔ روحوں کو قوی تر بنانے والی۔ بحر ترحم و شفقت۔
اے موسیقی!
تمہاری گہرائیوں میں اپنے قلب و نظر ڈبو دیتے ہیں۔
تو نے ہمیں کانوں کے ذریعے دیکھنا اور دلوں کے ذریعے سننا سکھایا ہے۔

زمانے کی راکھ

رات نے اپنا سیاہ آنچل پھیلا دیا اور زندگی "آفتاب(۱)" میں اونگھنے لگی۔ صنوبر اور لارل کے درختوں میں گھرے ہوئے عظیم الشان ہیکلوں کے چاروں طرف جو عمارتیں تھیں' ان کی روشنیاں گل ہو گئیں' چاند طلوع ہوا' اس کی شعاعیں ان مرمریں ستونوں کی سفیدی پر مچل رہی تھیں' جو رات کی خاموشی میں دیوؤں کی طرح کھڑے' دیوی کی قربان گاہوں کی حفاظت کر رہے تھے اور لبنان کے ان بلند و بالا میناروں کو حیرت سے تک رہے تھے' جو دور اونچی نیچی پہاڑیوں پر فخر اور غرور سے سر اٹھائے کھڑے تھے۔

رات کے پچھلے پہر جب مضطرب و بیقرار روحیں تھک ہار کر نیند کی آغوش میں چلی گئیں' تو بڑے پادری کا بیٹا ناتھان اپنے لرزتے ہوئے ہاتھوں میں ایک مشعل اٹھائے ہیکل عشتار(۲) میں داخل ہوا۔ اس نے ہیکل کے چراغ روشن کئے اور عود و لوبان سلگایا جس کی خوشبو سے ہیکل کا گوشہ گوشہ مہک اٹھا پھر وہ طلائی اور مرمریں سیلوں سے مزین قربان گاہ کے سامنے گھٹنوں کے بل جھکا اور اپنے ہاتھ عشتار دیوی کے سامنے پھیلا کر بڑی دردناک آواز میں گڑگڑانے لگا۔ رحم! اے جلیل القدر عشتار! رحم! رحم!! اے حسن و محبت کی دیوی رحم! میرے حال پر ترس کھا اور میری محبوبہ کو موت کے چنگل سے نجات دلا جسے میں نے تیری مرضی اور رضا سے اپنا شریک حیات بنایا ہے۔ آہ! طبیبوں کی دوائیں بے اثر ثابت ہوئیں اور پادریوں کے افسوں بے کار .... اب تیرے مقدس نام کے سوا اور کوئی میرا یار و مددگار نہیں' اس لئے میری دعاؤں اور التجاؤں کو شرف قبولیت عطا فرما۔

میرے دل کی پامالی اور روح کے زخموں پر نگاہ کر اور میری زندگی کے اس جزو لاینفک کو میرے پہلو میں زندہ و پائندہ رکھ تاکہ ہم دونوں تیری محبت کے اسرار سے فرحت اور اس جوانی کی لطافتوں سے سعادت حاصل کریں جو تیری عظمت و بزرگی کے

رموز کی آئینہ دار ہے۔

اے مقدس دیوی عشطار! میں تجھے دل کی گہرائیوں سے پکار رہا ہوں اور اس رات کی تاریکی میں تیری شفقت و ہمدردی کا طلب گار ہوں' میری فریاد سن! میرا تیرا غلام ناتھان ہوں ..... پادری جرام کا بیٹا جس نے اپنی ساری عمر تیری قربان گاہ کی خدمت میں گزار دی۔

میں نے ایک نوخیز حسینہ سے محبت کی اور اسے اپنی شریک زندگی بنا لیا۔ ہماری اس کامیابی اور خوش بختی نے پریوں کو آتش حسد میں جھونک دیا اور انہوں نے میری محبوبہ کے حسین اور نازک جسم کو جادو کے زور سے ایک عجیب و غریب بیماری میں مبتلا کر دیا ..... اس کے بعد انہوں نے موت کے فرشتے کو بھیجا کہ وہ اسے ان کے طلسمی غاروں میں پہنچا دے ..... دیکھ وہ موت کا فرشتہ اس کے سرہانے بیٹھا بھوکے چیتے کی طرح غرا رہا ہے وہ دیکھ! اس نے اپنے سیاہ اور منحوس پر پھیلا رکھے ہیں اور اسے میرے پہلو سے نکال لے جانے کے لئے اپنے نوکیلے پنجے اس کی طرف بڑھا رہا ہے میں تیرے حضور بصد احترام اور عجز و انکساری التجا کرتا ہوں ..... مجھ پر رحم کر اور اس نو شگفتہ پھول کو موت کے ہاتھوں مرجھانے سے بچا لے جو ابھی تک زندگی کے جمال حرارت سے اچھی طرح فیض یاب نہیں ہوا(۳)۔

اے مہربان دیوی! اسے موت کے پنجے سے چھڑا لے تاکہ ہم دونوں تیری تعریفوں کے گیت گائیں ..... تیرے مقدس نام پر نذر چڑھائیں ..... تیری قربان گاہ پر قربانیاں پیش کریں ..... تیرے خزانوں کو پرانی شراب اور خوشبو دار تیلوں سے بھریں' تیرے ہیکل کے آستانے پر گلاب اور چنبیلی کا فرش بچھائیں اور تیری مورتی کے سامنے عود و لوبان جیسی پاک خوشبوئیں سلگائیں۔

اے معجزات کی دیوی! اسے اس روگ سے نجات دلا اور غم اور خوشی کی اس جنگ میں موت پر محبت کو غالب کر' کیونکہ تو خوشی اور محبت کی دیوی ہے۔

ناتھان ایک لمحے کے لئے خاموش ہو گیا ..... اس کا غم آنسوؤں کی شکل میں بہہ رہا تھا اور آہوں کی شکل میں آسمان پر چڑھ رہا تھا ..... اس نے ایک گہری ٹھنڈی سانس بھری اور دوبارہ کہنا شروع کیا۔

آہ! اے مقدس عشطار! میرے خوابوں کے محل مسمار ہو گئے ہیں اور شدت غم سے میرا کلیجہ پگھل کر رہ گیا ہے ..... تجھے اپنی عظمت و شوکت کا واسطہ ..... مجھے پھر سے زندگی عطا فرما اور میری محبوبہ کو میرے لئے زندہ رہنے دے۔

ٹھیک اس لمحے ناتھان کا ایک غلام ہیکل میں داخل ہوا اور تیزی سے اس کے پاس پہنچ کر کان میں سرگوشی کی کہ بیگم نے آنکھیں کھول دی ہیں آقا! اس نے سب سے پہلے بستر کے چاروں طرف نگاہ دوڑائی اور آپ کو نہ پا کر کئی آوازیں دیں۔ یہ دیکھ کر میں آپ کے پاس دوڑ آیا ..... جتنی جلدی ممکن ہو سکے' فوراً گھر چلئے!

ناتھان تیزی سے اپنی حویلی کی طرف روانہ ہو گیا۔ غلام اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ اپنی شان دار حویلی میں پہنچ کر وہ بیمار کے کمرے میں داخل ہوا اس کا مرجھایا ہوا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اس کے بستر پر جھک گیا اور اس کے ہونٹوں کو بار بار چومنے لگا گویا اس کے بیمار جسم میں اپنی زندگی میں سے ایک نئی زندگی کی رو دوڑا رہا ہے۔ بیمار نے ریشمی تکیوں میں چھپا ہوا اپنا چہرہ اس کی طرف پھیرا اور آنکھیں کھول دیں۔ اس کے لبوں پر ہلکا سا تبسم نمودار ہوا۔ وہ تبسم جو اس کے کمزور و ناتواں جسم میں زندگی کی آخری رمق تھی ..... وہ تبسم جو موت کی تاریکیوں میں گم ہونے والی روح کی آخری چمک تھی اور وہ تبسم جو عدم کے تیز رو مسافر کے دل کی صدائے بازگشت تھی اس کے بعد اس نے اٹک اٹک کر بولنا شروع کیا جس طرح کسی بھوکے پیاسے بچے کی ماں کی' سوکھی چھاتیوں سے دودھ کی ایک بوند نہ ملنے پر روتے روتے ہچکی بندھ جاتی ہے۔

میرے من کے راجہ! دیوی نے مجھے اپنے حضور بلا بھیجا ہے اور موت مجھے تجھ سے جدا کرنے کے لئے آگئی ہے ..... غمگین نہ ہو! میرے سرتاج! دیوی کی مرضی مبارک ہے اور موت کا مقصد عدل و انصاف پر مبنی! اب میں جا رہی ہوں ..... اس حالت میں کہ محبت اور جوانی کے دو لبریز پیالے ہمارے ہاتھوں میں ہیں اور خوشگوار زندگی کے راستے ہمارے سامنے پھیلے ہوئے! میرے پیارے ..... اب میں روحوں کی نزہت گاہ میں جا رہی ہوں اور ایک دن پھر اس دنیا میں لوٹ کر آؤں گی ..... اس لئے کہ مقدس عشطار ان چاہنے والوں کی روحوں کو دوبارہ اس دنیا میں بھیجے گی جو محبت کی لذتوں اور جوانی کی مسرتوں سے لطف اندوز ہوئے بغیر یہاں سے چلے جاتے ہیں۔

ناتھان! ہم ایک بار پھر ملیں گے .... نرگس کے پیالوں میں صبح کی شبنم پئیں گے اور سبزہ زار کی چڑیوں کے ساتھ قوس قزح کے رنگوں سے لطف اندوز ہوں گے ..... تب تک کیلئے رخصت .... الوداع .... میرے پیارے الوداع !!!

اس کی سانس ٹوٹ گئی اور ہونٹ کانپنے لگے جیسے نسیم سحر کے جھونکوں سے بابونہ کے تنہا پھول پر لرزہ سا طاری ہو جاتا ہے ..... اس نے اپنے محبوب شوہر کو زور سے چمٹا لیا اور اس کی گردن آنسوؤں سے تر ہو گئی' لیکن جب ناتھان نے اپنے لب اس کے لبوں سے قریب کئے تو وہ برف کی مانند ٹھنڈے تھے اس کے منہ سے بے اختیار ایک دلدوز چیخ نکل گئی ... اس نے اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے اور مرنے والی کے بے حس و حرکت جسم کے اوپر گر پڑا .... اس عالم میں کہ اس کی دردناک روح' زندگی کی بلندیوں اور موت کے گڑھے کے درمیان ڈگمگا رہی تھی۔

اس رات کی خاموشی میں سونے والوں کی نیندیں اچاٹ ہو گئیں ..... جب عورتوں اور بچوں نے عشطار کے بڑے پجاری کے محل سے اٹھنے والی الم ناک چیخیں اور دردانگیز نوحے سنے' تو ان کی روحیں دہل گئیں۔ اس دہشتناک رات کی صبح طلوع ہوئی تو لوگ ناتھان کے پاس تعزیت اور اس کی مصیبت پر اظہار ہمدردی کے لئے آئے' لیکن ناتھان اپنی حویلی میں موجود نہ تھا .... پندرہ دنوں کے بعد مشرق سے ایک قافلہ آیا اور اس کے سردار نے بتایا کہ اس نے ناتھان کو دور دراز کے جنگلوں میں ہرنوں کی ایک ڈار کے ساتھ ادھر ادھر بھاگتے دیکھا ہے۔

☆———☆———☆

زمانہ اپنے نادیدہ قدموں سے ماضی کے تمام نقوش پامال کرتا ہوا گزر گیا۔ حسن و محبت کی دیوی کو دیس نکالا مل گیا اور اس کی جگہ ان اہرمنی قوتوں نے لے لی' جو تخریب و تباہی سے مسرور ہوتی ہیں چنانچہ "آفتاب نگر" کا عالیشان ہیکل مسمار ہو گیا' خوبصورت محل زمین بوس ہو گئے .... ہرے بھرے باغ خشک اور ویران ہو گئے .... سرسبز و شاداب کھیت چٹیل میدان بن گئے اور وہاں سوائے ان کھنڈروں کے اور کچھ باقی نہ رہا' جو دماغ کو ماضی کی پرچھائیوں سے الم ناک' اور دل کو عظمت رفتہ کے ترانوں کی صدائے بازگشت سے غمگین کرتے ہیں' لیکن زمانہ اپنی رفتار سے انسان کی صناعیوں کو پامال کر دیتا ہے' اس کا تصورات کو فنا اور اس کے جذبات کو بے جان نہیں کر سکتا' اس لئے کہ تصورات و جذبات ازلی اور ابدی روح کے ساتھ قائم و باقی رہتے ہیں ممکن ہے وہ کبھی کچھ دیر کے لئے نظروں سے اوجھل ہو جائیں' لیکن ان کی روپوشی محض عارضی اور وقتی ہوتی ہے جس طرح رات کی آمد پر سورج اور طلوع سحر کے وقت ستارے کچھ دیر کیلئے نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔

II

بہار ۱۸۹۰ء

دن چھپ گیا ..... روشنی ماند پڑ گئی اور سورج نے .علبک کے میدانوں سے اپنی کرنیں سمیٹ لیں' تو علی الحسینی (۱۴) اپنی بھیڑوں کے ریوڑ کو لئے ہیکل کے کھنڈروں کی طرف لوٹا اور ان ستونوں پر بیٹھ گیا' جو زمین پر اس طرح پڑے تھے گویا میدان جنگ میں بہت سے سپاہیوں کی ہڈیاں اور پنجر بکھرے پڑے ہیں' بھیڑیں اس کی بانسری کی مدھر تانوں سے جیسے مسحور ہو کر اس کے چاروں طرف ایک دائرے میں بیٹھ گئیں۔

رات بھیگی اور اس کی تاریکیوں میں فطرت نے اگلے دن کے بیج ڈال دیئے .... علی کی پلکیں بیداری کی پرچھائیوں سے بوجھل ہو گئیں اور اس کا دماغ ان سایوں کے ہجوم سے تھک گیا جو خوفناک خاموشی کے ساتھ ٹوٹی پھوٹی دیواروں پر سے گزر رہے تھے .... وہ اپنے بازوؤں کے سہارے لیٹ گیا اور غنودگی اس کے حواس کو اپنی نقاب کے سروں سے اس طرح مس کرنے لگی جیسے لطیف بادل کسی خاموش اور پرسکون جھیل کی سطح کو چھوتے ہیں .... وہ اپنے وجود ظاہری کو بھول کر اپنے وجود معنوی میں گم ہو گیا' جو عام نگاہوں سے پوشیدہ اور انسانی قوانین و عقائد سے بالا و برتر تصورات کی جولانگاہ تھا۔

خوابوں کے دائرے اس کی آنکھوں کے سامنے پھیل گئے اور زندگی کے اسرار کی پہیلیاں اس کے ذہن پر منکشف ہونے لگیں۔ اس کی روح زمانے کے قافلے سے الگ ہو کر' جو نہایت تیزی سے عدم کی طرف جا رہا تھا' موزوں و متشاکل تصورات اور شفاف و

بلوریں افکار کے سامنے جاکر تنہا کھڑی ہو گئی۔ اسے زندگی میں پہلی مرتبہ اس روحانی گرسنگی کے اسباب معلوم ہوئے جو اس کی جوانی سے بری طرح چمٹی ہوئی تھی .... وہ گرسنگی' جو زندگی کی شیرینی اور تلخی میں یگانگت پیدا کرتی ہے.... وہ تشنگی' جو شوق و طلب کی آہ و زاری اور راحت و عافیت کے سکون و اطمینان کو ایک جگہ جمع کرتی ہے.... اور وہ فرسنگی جسے مادی قوت و عظمت زائل کر سکتی ہے نہ عمر کی رفتار اس کا رخ پھیر سکتی ہے۔

اپنی عمر میں پہلی مرتبہ علی حسینی نے ایک عجیب و غریب جذبہ اپنے دل کی گہرائیوں میں انگڑائیاں لیتا ہوا محسوس کیا.... ایک نرم و نازک جذبہ جس کا یاد سے وہی تعلق تھا' جو آتش دانوں سے بخور و لوبان کا ہوتا ہے یہ ایک طلسماتی محبت تھی جس کی نرم و نازک انگلیوں نے اس کے حواس کو اس طرح چھوا جیسے کسی مغنی کی انگلیاں ساز کے حساس اور لرزتے ہوئے تاروں کو مس کرتی ہیں۔

یہ ایک نیا جذبہ تھا جو ہستی کے ہر پہلو سے نمودار ہوا اور بڑھتے بڑھتے اس کے سارے وجود معنوی پر چھا گیا اور اس کی روح کو ایک ایسی آتشیں محبت سے سرشار کر گیا جس کی لطافتیں ہلاکت خیز تھیں اور تلخی خوشگوار!

علی نے منہدم ہیکل کی طرف اپنا رخ پھیرا..... قربان گاہ کے کھنڈروں' زمین پر گرے ہوئے ستونوں اور ٹوٹی پھوٹی دیواروں کی بنیادوں کی طرف نگاہ کی اور اس کی غنودگی ایک روحانی بیداری سے بدل گئی...... اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں اور دل تیزی سے دھڑکنے لگا.... اس اندھے کی طرح جسے دفعتاً" بینائی مل گئی ہو وہ دیکھتا اور سوچتا رہا.... دیکھتا اور سوچتا رہا..... یہاں تک کہ اس کے ذہن میں مرتسم بھولی بسری یاد کے مدھم نقوش اجاگر ہو گئے اور وہ کچھ یاد کرنے لگا.... اس کے ذہن میں ان نقرئی چراغوں اور آتش دانوں کی یاد در آئی جو دیوی کی پر جلال مورتی کو گھیرے ہوئے تھے...... اسے ان باوقار کاہنوں کی یاد آئی جو سونے اور ہاتھی دانت سے مرصع قربان گاہ پر بھینٹ چڑھاتے تھے.... تصور کے پردے پر ان دوشیزاؤں کی شکلیں ابھر آئیں' جو دف بجا بجا کر حسن و محبت کی دیوی کی نوازشوں کے گیت گایا کرتی تھیں....

یہ سب کچھ اس نے یاد کیا..... یہ تمام مناظر اس کی گہرائی بصیرت کے سامنے ا

ہو گئے اور اسے ایسا محسوس ہونے لگا کہ یہ مناظر اور ان کے اسرار کی تاثیر اس کے ذہنی سکون میں ایک تلاطم پیدا کر رہی ہے' لیکن حافظہ تو صرف انہی اجسام کی پرچھائیوں سے ہمیں دوچار کر سکتا ہے جو بیتی ہوئی زندگی میں ہماری نظر سے گزرے ہوں اور صرف انہی آوازوں کو دہرا سکتا ہے جو کبھی پہلے ہمارے کانوں میں پڑ چکی ہوں' تو پھر اس طلسم کا ریاد اور اس سادہ لوح نوجوان کی زندگی کے بیتے ہوئے حقیقی دنوں میں باہمی طور پر کیا ربط و علاقہ ہے جس نے ایک خیمے میں جنم لیا اور اپنی عمر کا بہترین حصہ وادیوں میں بھیڑ بکریاں چرانے میں بسر کر دیا۔

علی اٹھا اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہیکل کے کھنڈروں میں ٹہلنے لگا.... ایک پرانی یاد اس کے حافظے سے نسیان کے پردے اٹھا رہی تھی جیسے کوئی نوخیز حسینہ اپنے آئینہ رخ سے باریک ترین نقاب اٹھائے۔ جب وہ ہیکل کے وسط میں پہنچا تو کھڑا ہو گیا' گویا زمین میں ایک مقناطیسی قوت تھی جس نے اس کے قدم پکڑ لئے...... اس نے آنکھ اٹھا کر دیکھا' تو خود کو ایک شکستہ مورتی کے سامنے پایا' جسے زمانے کی گردشوں نے زمین کے برابر کر دیا تھا.... بغیر کچھ سوچے سمجھے وہ اس کے سامنے جھک گیا' اس کے سینے سے جذبات کا دھارا ابلنے لگا جس طرح گہرے زخموں سے خون کا فوارہ چھوٹتا ہے... اس کے دل کی دھڑکنیں تیزی سے بڑھنے اور گھٹنے لگیں جس طرح سمندر کی بپھری ہوئی شوریدہ سر موجیں چڑھتی اور اترتی ہیں.... اس کی نگاہیں جھک گئیں اور وہ ایک گہری آہ بھر کر دردناک آواز میں بین کرنے لگا.... اسے ایکا ایکی اپنی جاں گسل تنہائی اور جاں گداز دوری کا شدید احساس ہوا جس نے اس کی اور اس حسینہ کی روح کو ایک دوسرے سے الگ کر رکھا تھا جو اس زندگی سے پہلے اس کی آغوش کی زینت تھی اس نے محسوس کیا کہ اس کا جوہر نفس اس بھڑکتے ہوئے شعلے کا ایک جزو ہے جسے اللہ نے آفرینش سے پہلے اپنی ذات سے جدا کیا تھا اسے اپنے جلتے ہوئے دل اور تھکے ہوئے دماغ کے گرد لطیف بازوؤں کی پھڑپھڑاہٹ اور خوشگوار لمس کا احساس ہوا اسے محسوس ہوا جیسے ناقابل تسخیر محبت نے اس کے دل اور نفس کی آمدوشد پر قابو پا لیا ہے..... وہ محبت' جو روح پر اس کے اسرار منکشف کر کے اپنے اصول و ارکان سے عقل اور مادے میں تمیز کرتی ہے.... وہ محبت' جسے ہم بولتے سنتے ہیں جب زندگی کی زبانوں پر خاموشی کے قفل لگ جاتے ہیں اور وہ تیرہ

و تار اندھیرے میں روشنی کے مینار کی مانند راستہ دکھاتی ہے وہ محبت ..... وہ غیر معمولی قوت اس پرسکون ساعت میں علی حسینی کے دل پر وارد ہوئی اور اس میں تلخ و شیریں جذبات پیدا کر دیئے ٹھیک اس طرح جس طرح آفتاب نوکیلے کانٹوں کے پہلو میں پھول پیدا کرتا ہے۔

لیکن یہ محبت کیا ہے؟ کہاں سے آئی ہے؟ اور اس نوجوان سے کیا چاہتی ہے جو ایک ہیکل کے ویران اور اجاڑ کھنڈروں میں سجدہ ریز ہے؟ کیا وہ ایک تخم ہے جسے کسی بدوی دوشیزہ نے ان جانے میں اس کے دل صد پارہ کی تہوں میں ڈال دیا یا روشنی کی ایک کرن ہے جو پہلے تاریک سیاہ بادلوں میں چھپی ہوئی تھی اور اب اس کے من میں اجالا کرنے کے لئے ظاہر ہو گئی! کیا یہ ایک خواب ہے' جو اس کے جذبات کا مذاق اڑانے کے لئے رات کی خاموشیوں میں تیزی سے گزر رہا ہے یا ایک حقیقت ہے' جو ازل سے موجود ہے اور ابد تک باقی رہے گی!!

علی نے اپنی اشک آلود آنکھیں بند کر لیں اور رحم طلب سائل کی طرح اپنے ہاتھ پھیلا دیئے اور دردناک آواز میں چلایا۔ اے میرے دل سے قریب اور آنکھوں سے دور رہنے والی! اے ..... مجھ کو خود سے بیگانہ بنانے والی! اے میرے حال کو بھولے ہوئے ماضی سے رشتہ بدامن کرنے والی! تو کون ہے؟ کیا تو کسی حور کا سایہ ہے' جو عالم ابد سے اس لئے آئی ہے کہ مجھ پر زندگی کے فریب اور انسان کی بشری کمزوریاں آشکارہ کرے؟ یا کسی جن کی روح ہے جو زمین کی تہوں سے اس لئے نمودار ہوئی ہے کہ مجھے ہوش و خرد سے بیگانہ کر کے مجھے قبیلے کے نوجوانوں کے تمسخر اور مذاق کا ہدف بنائے؟ تو کون ہے؟ اور یہ وحشت و کرب کیسا ہے' جو میرے دل پر طاری ہے؟ ... یہ احساسات کیا ہیں جو ایک لمحے میں' میرے ارمانوں کا خون کر دیتے ہیں تو دوسرے لمحے دل میں نئی امنگوں اور آرزوؤں کی جوت جگا دیتے ہیں؟ میں کون ہوں؟ اور یہ ہستی "تو" کیا ہے' جسے میں "انا" کہتا ہوں حالانکہ وہ میرے لئے بالکل اجنبی ہے .... کیا میں آب حیات پی کر آدمی سے فرشتہ بن گیا ہوں کہ اسرار کی باریکیوں کو دیکھ اور سن رہا ہوں؟ یا یہ وسوسوں کی دو آتشہ شراب ہے جس کے زیر اثر میں اپنی حقیقت سے جان بوجھ کر اغماض برت رہا ہوں؟

اس نے ایک منٹ کے لئے سکوت اختیار کیا۔ پھر جب روح میں بلندی اور جذبات

میں بالیدگی پیدا ہوئی' تو دوبارہ کہنا شروع کیا۔ اے روح کو سنوارنے اور مجھ سے قریب کرنے والی! اے رات کی ظلمتوں کو چھپانے اور دور کرنے والی! اے میرے خوابوں کی فضا میں اڑنے والی حسین روح! تو نے میرے باطن میں ان جذبات کو بیدار کر دیا' جو برف کی تہوں میں چھپے ہوئے پھولوں کے بیج کی طرح خوابیدہ تھے ..... تو نے خوشبو سے بسی ہوئی قزح نسیم کی طرح' میرے پاس سے گزرتے ہوئے میرے حواس کو مس کیا اور وہ درخت کے پتوں کی طرح حرکت میں آ گئے۔

اگر تو مادی لباس میں ہے' تو خدارا .... مجھے اپنا جلوہ دکھا! اور اگر عناصر کی قید سے آزاد ہے تو نیند کو حکم دے کہ وہ میری آنکھوں میں سما جائے تاکہ میں خواب ہی میں تیرے دیدار سے فیض یاب ہو جاؤں !.... مجھے توفیق دے کہ میں تجھے چھو سکوں .... تیری آواز سن سکوں۔ اس پردے کو چاک کر دے' جو میرے اور میری ذات کے درمیان حائل ہے! اس دیوار کو ڈھا دے' جو میری الوہیت کو مجھ سے چھپا رہی ہے .... اگر تو عالم بالا کے سبزہ زاروں کی باسی ہے' تو مجھے بال و پر عطا کر تاکہ میں تیرے پیچھے پیچھے اڑ کر وہاں پہنچ جاؤں !..... اور اگر تو کوئی پری ہے' تو اپنا طلسمی ہاتھ میری آنکھوں پر رکھ دے تاکہ میں تیرے ساتھ جنوں کی بستی میں جا پہنچوں .... اگر میں تیری محبت کے قابل ہوں' تو اپنا مخفی ہاتھ میرے دل پر رکھ دے اور مجھے اپنا لے!

علی اپنے دل کی گہرائیوں میں مچلتے ہوئے ان نغموں کو بہ انداز سرگوشی رات کی تاریکی کے بہرے کانوں میں انڈیل رہا تھا .... ہیکل کی ٹوٹی پھوٹی اور شکستہ دیواروں پر بنتے بگڑتے سائے اور پرچھائیاں دیکھ کر اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے یہ اس کی آنکھ سے ٹپکے ہوئے گرم گرم آنسوؤں کے بخارات ہیں جنہوں نے ہیکل کی دیواروں پر پہنچ کر قوس قزح کے رنگ کی طلسمی تصویروں کا روپ دھار لیا ہے۔

ایک گھنٹہ گزر گیا.... علی بیٹھا آنسوؤں کے چھینٹے دے کر من میں لگی آگ کے شعلوں کو ٹھنڈا کرتا اور دل کی دھڑکنیں سنتا رہا..... اس کی آنکھیں اردگرد کے مناظر سے پرے خلاء میں جمی ہوئی تھیں.... لگتا تھا جیسے اس کی آنکھوں کے سامنے اس زندگی کے نقوش بتدریج فنا ہو رہے ہیں اور ان کی جگہ ایک ایسا خواب لے رہا ہے جو اپنی خوبیوں کی بنا پر انوکھا اور وسوسوں کی بنا پر ہولناک ہے.... وہ اس پیغمبر کی طرح' جو نزول وحی کے

انتظار میں ستاروں پر نگاہیں جمائے کھڑا ہو' وقت کے انجام کا انتظار کرنے لگا اسے محسوس ہوا جیسے اس کی روح اس کے جسم سے الگ ہو کر ان ویرانوں میں اپنی کسی گمشدہ متاع عزیز کی تلاش میں بھٹکتی پھر رہی ہے!

صبح کاذب نمودار ہوئی اور ہوا کی نرم و نازک موجوں سے خاموشی کا طلسم ٹوٹ گیا اب بنفشی' نور نے سارے عالم کو منور کر دیا اور فضا اس سونے والے شخص کی طرح مسکرانے لگی' جو خواب میں اپنے محبوب کا جلوہ دیکھ رہا ہو! شکستہ دیواروں کے شگافوں اور موکھوں سے پرندے نکلے اور اپنی چہکار سے آمد سحر کا مژدہ سناتے ہوئے ان ستونوں پر منڈلانے لگے... علی اپنی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر اٹھا... مخمور نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا اور جس طرح آدم علیہ السلام نے آنکھیں کھولنے کے بعد دنیا پر پہلی نظر ڈالی اور ششدر و حیران رہ گیا تھا اسی طرح علی کو بھی گرد و پیش کی ہر چیز بالکل نئی اور اجنبی سی معلوم ہوئی اور وہ ہر شے کو حیرت سے دیکھنے لگا... آخر کار وہ بھیڑوں کے ریوڑ کی طرف چلا اور انہیں اپنی مخصوص آواز میں پکارا.... بھیڑیں فوراً" لپکی چلی آئیں اور اس کے پیچھے خاموشی کے ساتھ سرسبز و شاداب چراگاہوں کی طرف روانہ ہو گئیں۔

علی اپنی بھیڑیں لئے جا رہا تھا... اس کی بڑی بڑی آنکھیں صاف و شفاف فضا پر جمی ہوئی تھیں اور اس کے جذبات جو ادراک و احساس کی حدود سے نکل چکے تھے اس پر ہستی کے راز اور باریکیاں منکشف کر رہے تھے.... وہ ایک ہی لمحے میں اسے زمانے کے مٹے ہوئے اور بچے کچھے نقوش بھی دکھا رہے تھے اور اسی لمحے ان سب کو بھلا کر اس کے دل میں شوق و تمنا کی آگ بھی بھڑکا رہے تھے۔

وہ بوجھل قدموں سے آہستہ آہستہ چلتا ہوا ایک چشمے کے کنارے پہنچا جس کے پانی کی روانی کا ترنم سبزہ زاروں کے من میں چھپے راز فاش کر رہا تھا.... وہ بید مشک کے درختوں کے سائے میں بیٹھ گیا جن کی شاخیں پانی پر اس طرح جھکی ہوئی تھیں جیسے اس کی ساری شیرینی چوس لینے کیلئے بیقرار ہوں.... بھیڑیں گردن جھکا کر ہری ہری گھاس چرنے لگیں... ان کے سفید جسم پر جمے ہوئے رات کی شبنم کے قطرے موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔

زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ علی نے محسوس کیا' اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئی ہیں

اور روح میں ہلچل سی مچ گئی ہے.... اس ماں کی طرح جو گہری نیند میں بچے کے رونے کی آواز سن کر چونک اٹھتی ہے اس کے جسم میں خفیف سی حرکت ہوئی اور اس نے ادھر ادھر دیکھا.... ایک دوشیزہ کندھوں پر گاگر رکھے' درختوں میں سے آہستہ آہستہ چشمے کی طرف آتی نظر آئی... شبنم نے اس کے ننگے پاؤں تر کر دیئے تھے.... چشمے کے کنارے پہنچ کر جب وہ پانی بھرنے کے لئے جھکی تو اس کی نگاہ سامنے والے کنارے کی طرف اٹھ گئی اور اس کی نظریں علی کی نظروں سے ملیں... وہ ایک دم چونک پڑی.... گاگر ہاتھ سے چھوٹ گئی اور وہ حیرت اور پریشانی کے عالم میں دو چار قدم پیچھے ہٹ کر اسے غور سے دیکھنے لگی جیسے کوئی راہ گم کردہ مسافر اپنے کسی آشنا کو دیکھتا ہے!

ایک منٹ اسی طرح گزر گیا جس کا ہر لمحہ گویا ایک چراغ تھا' جو دو دلوں کو مرکز اتصال کی راہ دکھا رہا تھا اور خاموشی کے سینے سے نت نئے نغمے پیدا کر کے' ان کے حافظے میں دبی بھولی بسری یاد کو غیر واضح اور مبہم نقوش ابھار رہا تھا اور انہیں پرچھائیوں کی مانند ان دھندلے مناظر کی یاد دلا رہا تھا' جو اس چشمے اور ان درختوں سے دور کہیں اور واقع تھے۔ محبت کی نگاہیں آپس میں ہمکلام تھیں.... وہ دونوں ایک دوسرے کو نہایت غور سے دیکھ رہے تھے اور آنکھوں میں آنسو لئے ایک دوسرے کے دل کی دھڑکنیں سن رہے تھے یہاں تک کہ جب دونوں دلوں میں محبت کا سویا ہوا جذبہ اچھی طرح بیدار ہو گیا اور ان کی روحیں آپس میں گھل مل گئیں' تو علی کسی نادیدہ قوت کے زیر اثر دوسرے کنارے پہنچا اور دوشیزہ کو اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا اور اس کے پیاسے ہونٹوں پر ایک طویل بوسہ دیا دوشیزہ بے حس و حرکت کھڑی رہی' گویا علی کے جسم کے لمس کی لذت نے اس کے ارادے کو سلب کر لیا ہے اور محبوب کے بوسے کی لطیف حلاوت نے اس کی ساری قوتیں چھین لی ہیں اس نے خود کو علی کے سپرد کر دیا جس طرح چنبیلی کا پھول اپنی خوشبو کو ہوا کی لہروں کے سپرد کر دیتا ہے.... تھکے ماندے مسافر کی طرح جسے بے شمار کلفتوں کے بعد ایک راحت میسر آ جائے اس نے اپنا سر علی کے سینے پر رکھ دیا اور ٹھنڈی آہیں بھرنے لگی جس سے ظاہر ہوتا تھا اس کے ٹوٹے ہوئے دل میں دوبارہ خوشی کی امنگ اور آرزوئیں جنم لے رہی ہیں۔

آخر کار اس نے اپنا سر اٹھایا اور علی کی آنکھوں کی طرف نگاہ کی... وہ نگاہ جو خاموشی

یعنی روح کی زبان کے مقابلے میں عام گفتگو کو ہیچ سمجھتی ہے... ہاں! وہ نگاہ... جو نہیں چاہتی کہ محبت رسمی الفاظ کا جامہ پہنے!

وہ دونوں بید مشک کے درختوں میں چلے گئے... ان کی تنہائی ایک زبان تھی جو ان کے یک جان و دو قالب ہونے کا افسانہ سنا رہی تھی... ایک کان تھا' جو محبت کی پکار پر لگا ہوا تھا اور ایک آنکھ تھی' جو کامیابی و کامرانی کی عظمتوں کو دیکھ رہی تھی... بھیڑیں بدستور گھاس چر رہی تھیں اور پرندے صبح کے نغمے گاتے اور چہچہاتے ان کے سروں پر منڈلا رہے تھے!

جب وہ وادی کے کنارے پہنچے' تو سورج طلوع ہو چکا تھا اور اس نے اپنی سنہری کرنوں کی چادر ٹیلوں پر بچھا دی تھی... ایک چٹان کے پاس پہنچ کر جس کے سائے میں بنفشہ کے پھول کھلے تھے... وہ دونوں بیٹھ گئے... ہوا کے نرم اور لطیف جھونکے دوشیزہ کے بالوں سے اس طرح کھیل رہے تھے' گویا مخفی لب ہیں جو اسے چومنے کے لئے بے قرار ہیں تھوڑی دیر کے بعد دوشیزہ نے علی کی سیاہ آنکھوں میں جھانکا... اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی غیر مرئی انگلیاں اس کی زبان اور ہونٹوں سے مس کر رہی ہیں... وہ بڑی نرم اور شیریں آواز میں بولی- میرے پیارے محبوب! عشتار دیوی نے ہماری روحوں کو اس دنیا میں دوبارہ واپس بھیج دیا ہے تاکہ ہم محبت کی لذتوں اور جوانی کی عظمتوں کے ثمر سے محروم نہ رہیں!

علی نے اپنی آنکھیں بند کر لیں... دوشیزہ کے الفاظ کی موسیقی اور ترنم نے اس خواب کے نقوش اس کے ذہن میں تازہ کر دیئے جو وہ نیند کے عالم میں مدتوں دیکھتا رہا تھا... اس نے محسوس کیا کہ غیر مرئی بازوؤں نے اسے وہاں سے اٹھا کر ایک عجیب وضع کے حجرے میں ایک پلنگ کے سرہانے کھڑا کر دیا ہے... اس پلنگ پر ایک حسین و جمیل عورت کی لاش پڑی ہے جس کا حسن اور ہونٹوں کی حرارت موت نے سلب کر لی ہے... منظر کی ہیبت ناکی سے خوف زدہ ہو کر وہ دردناک آواز میں چلایا اور آنکھیں کھول دیں... اس نے دیکھا کہ وہ حسینہ اس کے پہلو میں بیٹھی ہے... اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں زندگی کی شعاعیں مچل رہی ہیں... علی کا چہرہ دمک اٹھا اور دل میں اک ولولہ' تازہ دوڑ گیا... خواب کی بھیانک پرچھائیں بتدریج تحلیل ہوتے ہوتے بالکل غائب ہو گئی... یہاں تک کہ علی اپنا ماضی اور اس کی اندوہناکیاں بالکل بھول گیا۔

دو چاہنے والے آپس میں گلے مل گئے اور بوسوں کی شراب اس قدر پی کہ ان پر بے خودی طاری ہو گئی وہ دونوں ایک دوسرے سے لپٹ کر سو گئے اور اس وقت تک خواب شیریں کے مزے لوٹتے رہے جب تک کہ سائے طویل نہ ہو گئے اور سورج کی گرمی نے انہیں بیدار نہ کر دیا۔

---

(۱) آفتاب نگر سے مراد بعلبک یعنی بعل (سورج دیوتا) کا شہر ہے- اسے آفتاب نگر سے اس لئے موسوم کیا جاتا ہے- کہ سورج دیوتا کی پرستش کے لئے آباد کیا گیا تھا-

(۲) عشتار' قدیم فنیقیوں کے نزدیک ایک بہت بڑی دیوی تھی جس کی پوجا طیری' سیدون' سور اور بعلبک وغیرہ کے شہروں میں کی جاتی تھی' دوسری خصوصیات کے علاوہ فنیقیوں میں اس کے بارے میں مشہور تھا کہ یہ دیوی زندگی کے شعلے کو بھڑکانے والی اور جوانی کی نگران ہے' یونانی بھی اس کی پرستش کرتے تھے اور اسے حسن و محبت کی دیوی سمجھتے تھے' اہل روم اسے وینس کہتے ہیں-

(۳) ایام جاہلیت میں عربوں کا عقیدہ تھا کہ پری جب انسانوں میں کسی نوجوان پر فریفتہ ہو جاتی ہے' تو اسے شادی سے روک دیتی ہے اور اگر وہ شادی کر لیتا ہے' تو اس کی دلہن پر جادو کر دیتی ہے یا مار ڈالتی ہے-

(۴) حسینی- ایک قدیم عرب قبیلہ ہے جو آج بھی بعلبک کے میدانوں میں خیمہ لگا کر زندگی بسر کرتا ہے-

---

پرچھائیں

یہ ایک شخص کی کہانی ہے' جس نے برف سے دبی اور ہواؤں سے کانپتی رات میں ہمیں اپنے گھر بلایا' جو آبادی سے دور وادی قادیشا کے کنارے' تنہا واقع تھا۔

کیلی لکڑی سے ــــــ جو اس کے ہاتھ میں تھی ــــــ آتش دان کی راکھ کریدتے ہوئے اس نے کہا!

"میرے دوستو! تم چاہتے ہو کہ میں اپنے غم کا راز تم پر ظاہر کروں۔ وہ ٹریجڈی تمہیں سناؤں' جسے ایک تصور شب و روز میرے سینہ میں برپا کرتا رہتا ہے۔

تم میرے سکوت اور اخفائے راز سے اکتا چکے ہو۔ میری بے چینی اور ٹھنڈے سانسوں نے تمہیں پریشان کر دیا ہے اور تم ایک دوسرے سے کہتے ہو' جب یہ شخص ہمیں اپنے درد و غم کے ہیکل میں داخل نہیں ہونے دیتا تو ہم اس کی دوستی کے گھر میں کیسے داخل ہو سکتے ہیں۔

تم سچ کہتے ہو! میرے دوستو! جو کوئی ہمارے غم میں شریک نہیں ہوتا' وہ کبھی اور کسی حال میں ہمارا ساتھ نہیں دے سکتا۔

اچھا! تو اب میری کہانی سنو ــــــ! سنو' لیکن ہمدرد بننے کی کوشش نہ کرنا۔ اس لئے کہ ہمدردی کمزوروں کے لئے جائز ہوتی ہے اور میں اپنے غم کے بل پر ہنوز طاقت ور ہوں۔

ابھی میں نے جوانی کی منزل میں قدم رکھا ہی تھا کہ نیند اور بیداری کے خوابوں میں ایک انوکھی شکل اور نرالی وضع کی عورت کی پرچھائیں مجھے نظر آنے لگی۔ میں اسے رات کی تنہائیوں میں اپنے بستر کے قریب کھڑے دیکھتا اور تنہائی کی خاموشیوں میں اس کی آواز سنتا تھا۔ کبھی کبھی جب میں اپنی آنکھیں بند کر لیتا' تو مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ اس کی انگلیاں میری پیشانی کو مس کر رہی ہیں۔ میں گھبرا کر ایک دم آنکھیں کھول دیتا اور اپنی سماعت کی تمام تر قوتوں کے ساتھ "لاشئے" کی سرگوشیوں پر کان لگا دیتا۔

میں اپنے دل سے پوچھا کرتا: کیا میری آوارگی خیال مجھے کہیں گم کر کے ہی دم لے گی؟ کیا میں نے اپنے خوابوں کے بخارات سے ایک خوبصورت' خوش آواز اور نرم و نازک عورت بنائی ہے کہ وہ اس عالم مادی سے تعلق رکھنے والی جیتی جاگتی عورت کی جگہ لے لے؟ کیا میرا دماغ چل گیا ہے کہ میں نے عقل کی پرچھائیوں سے اپنے لئے ایک رفیقہ کی تخلیق کی ہے؟ جسے میں چاہتا ہوں' جس سے مجھے انس ہے' جس پر میں بھروسہ کرتا ہوں' جس سے قریب ہونے کے لئے میں لوگوں سے دور ہو رہا ہوں۔ جس کی صورت دیکھنے اور آواز سننے کے لئے میں دنیا کی ہر صورت اور ہر آواز کی طرف سے اپنی آنکھیں اور اپنے کان بند کر رہا ہوں؟ ــــــ تو کیا میں دیوانہ ہوں؟ سودائی ہوں؟ جس نے عزلت پسندی ہی پر اکتفا نہیں کی' بلکہ تنہائی کی پرچھائیوں سے اپنے لئے ایک رفیقہ ــــــ ایک شریکۂ حیات بھی پیدا کر لی۔

میں نے "شریکۂ حیات" کہا ہے اور تم لوگ اس لفظ پر تعجب کر رہے ہو۔ لیکن اس عالم ہستی سے ماوراء کچھ ایسی چیزیں بھی ہیں' جن سے ہم صرف متعجب ہی نہیں ہوتے بلکہ انکار بھی کرتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ ہمیں ناممکنات میں سے نظر آتی ہیں۔ لیکن ہمارا یہ تعجب اور انکار ان کی حقیقت کو محو نہیں کر سکتا جو ہمارے نفس میں ایک مستحکم عمارت کی طرح قائم ہے۔

یہ خیالی عورت میری شریکۂ حیات تھی' جو زندگی کی ہر خواہش' ہر کوشش' ہر خوشی اور ہر رغبت میں میرا ساتھ دیتی۔ میں صبح اٹھتا تو دیکھتا کہ وہ بستر کے تکیوں سے ٹیک لگائے' مجھے ان نگاہوں سے تک رہی ہے' جو بچپن کی پاکیزگی اور ماں کی ممتا سے لبریز ہیں۔ کوئی کام کرنا چاہتا' تو وہ میرا ہاتھ بٹاتی۔ کھانے کے لئے دسترخوان پر بیٹھتا' تو وہ میرے سامنے بیٹھ کر مجھ سے گفتگو کرتی اور جب شام ہوتی تو میرے قریب آتی اور کہتی:

"اب ہمیں یہاں بہت دیر ہو گئی۔ آؤ! ٹیلوں اور وادیوں کی سیر کریں۔"

میں فوراً کام چھوڑ دیتا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر سیر کے لئے چل کھڑا ہوتا یہاں تک کہ ہم جنگل میں جا پہنچتے' جس پر طلسم سکوت کے تاروں سے بنی ہوئی شام کی نقاب پڑی ہوتی اور ایک بلند چٹان پر پہلو بہ پہلو بیٹھ کر دور افق پر نگاہیں جما دیتے۔ وہاں کبھی تو وہ غروب

ہوتے سورج کی شعاعوں سے سنہری بادلوں کی طرف اشارہ کرتی اور کبھی اس پرندہ کی چہکار کی طرف توجہ دلاتی' جو شب گزاری کے لئے شاخوں پر پناہ لینے سے پہلے خدا کی حمد و تسبیح میں مشغول ہوتا۔

اکثر ایسا ہوا ہے کہ میں اپنے کمرہ میں بیقرار و مضطرب بیٹھا ہوں کہ وہ آ گئی اور جوں ہی میری نگاہ اس پر پڑی' بے قراری' سکون سے بدل گئی اور اضطراب انس و یگانگی سے۔

بارہا میں لوگوں سے دو چار ہوا ہوں اور میری روح باغیانہ انداز میں ان کی فطرت کے برے پہلوؤں کے خلاف صف آرا ہوئی ہے' لیکن جہاں ان کے چہروں میں مجھے اس کا چہرہ نظر آیا۔ میرے باطن کا تمام طوفان' ساوی نغموں میں تبدیل ہو گیا۔

بسا اوقات یہ واقعہ پیش آیا ہے کہ تنہا بیٹھا ہوں۔ میرے دل میں زندگی کے مصائب و آلام کی تلوار ہے اور گردن میں ہستی کی مشکلات اور دشواریوں کی زنجیر' لیکن مڑ کے جو دیکھتا ہوں' تو وہ میرے سامنے کھڑی مجھے ان نگاہوں سے دیکھ رہی ہے جن سے رونق و نور کی شعاعیں پھوٹ رہی ہیں۔ اسے دیکھتے ہی غم کے سارے بادل چھٹ گئے' دل خوشی کے راگ الاپنے لگا اور زندگی چشم بصیرت کے سامنے عشرت و مسرت کی جنت بن کر جلوہ گر ہو گئی۔

تم مجھ سے سوال کرو گے' میرے دوستو! کہ میں اس انوکھی حالت پر کیسے قانع رہا؟ پوچھو گے کہ انسان' عنفوان شباب میں اس چیز پر کیسے اکتفا کر سکتا ہے' جسے وہم اور خواب و خیال ——— بلکہ نفسی روگ سے تعبیر کیا جاتا ہے؟ تو اس کا جواب میں یہ دوں گا کہ اپنی عمر کے چند سال جو میں نے اس حالت میں گزارے' وہ اس حسن' سعادت' لذت اور اطمینان کا نچوڑ تھے' جن سے میں اپنی زندگی میں آشنا ہوا۔ کہوں گا کہ میں اور میری یہ اثیری رفیقہ ایک آزاد اور مجرد فکر تھے' جو سورج کی روشنی میں طواف کرتی ہے' سمندر کی سطح پر تیرتی ہے' چاندنی راتوں میں دوڑتی ہے اور وہ نغمے گنگناتی ہے' جنہیں کسی کان نے نہیں سنا' اس منظر کے سامنے کھڑی ہوتی ہے' جسے کسی آنکھ نے نہیں دیکھا۔

زندگی ——— تمام و کمال زندگی ——— ہمارے روحانی تجربات میں ہے۔ اور ہستی ——— تمام تر ہستی ——— وجود کے عرفان و تحقیق میں' جس سے ہم خوش ہوتے ہیں یا اس کی وجہ سے دردناک۔ اور مجھے ایک روحانی تجربہ ہو گیا تھا' شب و روز ہوتا رہتا تھا ——— یہاں تک کہ میں تیس برس کا ہو گیا۔

کاش! میں تیس برس کا نہ ہوتا! ——— کاش! اس عمر کو پہنچنے سے پہلے مجھے ایک ہزار ایک بار موت آ جاتی' جس نے میرا جوہر حیات سلب کر لیا اور میرے دل کا سارا خون نچوڑ کر مجھے شب و روز کے سامنے ایک تنہا' خشک اور بے برگ و بار درخت کی طرح کھڑا کر دیا' جس کی شاخیں نہ ہوا کے نغموں پر رقص کرتی ہیں نہ پرندے اس کے پتوں اور پھولوں کے درمیان اپنے آشیانے بناتے ہیں۔

وہ ایک لمحہ کے لئے خاموش ہو گیا۔ اس نے اپنا سر جھکا لیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ اس کی دونوں کلائیاں ڈھیلی پڑ کر کرسی کی ہتھیوں پر لٹک گئیں اور وہ یاس و نومیدی کا مجسمہ معلوم ہونے لگا۔ ہم سب خاموش بیٹھے' اس کی بات ختم ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے آنکھیں کھولیں اور ٹوٹتی ہوئی آواز میں' جو مجروح ہستی کی گہرائیوں سے نکل رہی تھی' کہا:

"بیس برس کا ذکر ہے' میرے دوستو! لبنان کے حاکم نے ایک علمی مہم کے سلسلہ میں مجھے وینس بھیجا اور وہاں کے محافظ کے نام ایک خط میرے ساتھ کر دیا' جس سے اس کی ملاقات قسطنطنیہ میں ہوئی تھی۔

میں لبنان کو خیرباد کہہ کے اطالوی جہاز میں سوار ہوا۔ اپریل کا مہینہ تھا۔ روح بہار ہوا کی تہوں میں سرسرا رہی تھی' سمندر کی موجوں کے ساتھ اٹھلا رہی تھی اور آسمان پر سفید بادلوں کے ہجوم میں قلابازیاں کھانے والی دلفریب صورتوں کے پیکر میں ظاہر ہو رہی تھی۔ ان شب و روز کی تعریف' جو میں نے جہاز میں گزارے' تم سے کس طرح بیان کروں؟ جو کلام انسان سمجھتا بوجھتا ہے' وہ اس کے ادراک و احساس کی حدوں سے متجاوز نہیں ہو سکتا اور روح میں ایک ایسی بات ہے' جو ادراک سے کہیں زیادہ بعید اور شعور سے کہیں زیادہ رقیق ہے۔ ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ میں اس زمانہ کی تصویر الفاظ میں کیسے کھینچ سکتا ہوں؟

وہ چند سال' جو میں نے اپنی اس اثیری رفیقہ کی معیت میں بسر کئے' انس و الفت سے ہمکنار تھے اور مسرت و سکون سے لبریز۔ چنانچہ کبھی خواب میں بھی مجھے یہ خیال نہیں

آیا کہ میری سعادت میں پردوں میں غم چھپا بیٹھا ہے اور میرے ساغر کی گہرائیوں میں تلخی
کی گاد! ــــــ نہیں! میں اس پھول کے مرجھانے سے کبھی نہیں ڈرا' جو بادلوں کے
ماوراء اگا تھا اور اس نغمہ کی موت سے کبھی خوف زدہ نہیں ہوا' جو صبح کی پریوں نے گایا
تھا۔

جب میں ٹیلوں اور وادیوں سے رخصت ہوا' تو میری رفیقہ اس گاڑی میں میرے
پہلو سے لگی بیٹھی تھی' جو مجھے ساحل پر چھوڑنے گئی تھی۔

وینس جانے سے پہلے میں تین روز بیروت میں مقیم رہا۔ اس دوران میری شریکہ
حیات مجھ سے ایک لمحہ کے لئے جدا نہیں ہوئی۔ جہاں میں جاتا' وہ میرے ساتھ جاتی اور
جب ٹھہرتا' وہ بھی ٹھہر جاتی۔ میں اپنے کسی دوست سے ملتا' تو اسے بھی اس سے مسکرا کر
پیش آتے دیکھتا۔ کسی تفریح گاہ میں جاتا' تو اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں محسوس کرتا اور اپنے
کمرہ کی کھڑکی میں بیٹھ کر شہر کی آوازوں پر توجہ صرف کرتا۔ تو وہ فکر و تامل میں میرا ساتھ
دیتی۔ لیکن جب کشتی نے مجھے بیروت کی بندرگاہ سے جدا کیا اور میں نے جہاز پر قدم رکھا'
تو اسی لمحہ اپنی فضائے روح میں ایک تغیر اور ایک طاقتور مگر مخفی ہاتھ کو اپنا بازو پکڑے
محسوس کیا۔ میں نے ایک گہری آواز سنی جو سرگوشی کے انداز میں مجھ سے کہہ رہی تھی۔
"واپس ہو جا ــــــ! جہاں سے آیا ہے' وہیں واپس ہو جا!! کشتی میں بیٹھ اور جہاز
چلنے سے پہلے اپنے ملک کے ساحل کی طرف لوٹ جا!"

آخر کار جہاز روانہ ہوا' اس کی پشت پر میری مثال کچھ ایسی ہی تھی' جیسے فضائے
بسیط میں اڑتے ہوئے باشہ کے چنگل میں چڑیا۔ شام ہونے پر' جب لبنان کی چوٹیاں
سمندر کی کہر کے پیچھے روپوش ہو گئیں' تو میں نے خود کو جہاز کے اگلے حصہ پر تنہا کھڑے
پایا۔ میرے خوابوں کی پری ــــــ وہ عورت' جسے میرا دل پیار کرتا تھا ــــــ
وہ عورت' جو میری رفیقہ شباب تھی' میرے ساتھ نہ تھی ــــــ وہ نوخیز حسینہ' وہ
شیریں کلام محبوبہ' جس کا چہرہ' جب بھی میں فضا پر نگاہیں جماتا تھا' مجھے نظر آتا تھا' جس کی
آواز' جب بھی میں خاموشی پر کان لگاتا تھا' مجھے سنائی دیتی تھی اور جس کا ہاتھ' جب بھی
میں آگے کی طرف بڑھاتا تھا' میرے ہاتھ سے مس ہوتا تھا' جہاز میں نہ تھی اور پہلی مرتبہ
ــــــ ہاں! بالکل پہلی مرتبہ میں نے خود کو رات' سمندر اور فضا کے سامنے یکہ و
تنہا محسوس کیا۔

جہاز ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتا رہا اور میں اپنی رفیقہ کو دل ہی دل میں
پکارتا رہا۔ ناگن کی طرح بل کھاتی موجوں کو تکتا رہا کہ شاید کف سمندر کی سفیدی ہی میں
مجھے اس کا چہرہ دکھائی دے جائے۔

جب رات بھیگی' تو جہاز کے مسافر اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے' لیکن میں جہاں
کھڑا تھا' سرگشتہ و تنہا' حیران و مضطرب' وہیں کھڑا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے گردن
موڑی تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ مجھ سے چند قدم کے فاصلہ پر کہر میں کھڑی ہے مجھے جھرجھری
سی آگئی اور میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھا کر بلند آواز میں کہا:
"مجھے نہ چھوڑ ــــــ! خدارا' مجھے اکیلا نہ چھوڑ!! تو کہاں چلی گئی تھی؟ تو کہاں
تھی؟ میری محبوبہ! میرے پاس آ! آ ــــ میری جان! میرے پہلو میں آ اور مجھے کبھی نہ
چھوڑ!!"

لیکن وہ میرے پاس نہ آئی۔ بلکہ بے حس و حرکت اپنی جگہ کھڑی رہی اس کا چہرہ
رنج و الم کی شدت سے اتنا بھیانک ہو گیا کہ اس سے زیادہ خوفناک منظر میں نے اپنی
زندگی میں کبھی نہیں دیکھا۔ گھٹی ہوئی پست آواز میں اس نے کہا:
"میں تجھے ایک نظر ــــــ ہاں صرف ایک نظر ــــــ دیکھنے کے لیے سمندر کی
گہرائیوں سے آئی ہوں اور اب پھر وہیں واپس جا رہی ہوں تو بھی جا اور اپنی خواب گاہ
میں آرام سے سو۔"

یہ کہہ کر وہ کہر میں تحلیل ہو گئی۔ میں اسے بھوکے بچے کی طرح لجاجت سے پکارتا
اور اس کو پکڑنے کے لیے ہر طرف بازو پھیلاتا رہ گیا۔ لیکن شبنم سے گراں بار ہوا کے
ا اور کچھ میرے ہاتھ نہ آیا۔

مجبور و مایوس میں اپنے کمرہ میں واپس آیا۔ عناصر میری روح میں برسرپیکار تھے کبھی
تے تھے' کبھی اٹھتے تھے۔ بالفاظ دیگر میں اس جہاز ایک دوسرا جہاز تھا' جو شک و شبہ
ا' یاس و نومیدی کے سمندر میں غوطے کھا رہا تھا۔ سب سے زیادہ حیرت مجھے اس بات پر
کہ جوں ہی میں نے تکیے پر سر رکھا' پلکوں پر ایک بوجھ اور جسم میں ایک کسل سا
س کیا۔ چنانچہ فوراً ہی میری آنکھ لگ گئی اور میں صبح تک گہری نیند سوتا رہا۔ اس

دوران میں' میں نے ایک خواب دیکھا کہ میری رفیقہ سیب کے پھولوں سے لدے ہوئے درخت میں پھانسی پر لٹکی ہوئی ہے۔ اس کے تلووں اور ہتھیلیوں سے خون کے قطرے بہہ بہہ کر درخت کی شاخوں اور تنے پر ٹپک رہے ہیں اور وہاں سے گھاس پر گر گر کے زمین پر بکھرے ہوئے پھولوں میں جذب ہو جاتے ہیں۔

جہاز روز و شب کی مسافتیں طے کرتا رہا۔ میں اس میں سوار تھا' لیکن اس سے بے خبر کہ میں انسان ہوں' جو ایک انسانی مہم کے سلسلہ میں اپنے طول طویل سفر پر جا رہا ہے یا ایک پرچھائیں' جو کہر کے سوا ہر چیز سے خالی فضا میں ماری ماری پھر رہی ہے۔ چنانچہ نہ میں نے اپنی رفیقہ کی قربت محسوس کی' نہ بیداری یا خواب میں مجھے اس کا چہرہ دکھائی دیا۔ میں بے سود مخفی قوتوں سے گڑگڑا کر دعائیں مانگتا تھا کہ مجھے اس کے منہ کی کوئی بات سنوا دیں یا اس کی ایک جھلک دکھوا دیں۔ اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو کم از کم مجھے اس قابل کر دیں کہ میں اپنی پیشانی پر اس کی انگلیوں کا لمس محسوس کر سکوں۔

چودہ دن تک میری یہی حالت رہی۔ بالآخر پندرھویں دن دوپہر کو دور سے اطالیہ ساحل نظر آیا اور اسی دن شام ہوتے جہاز وینس کی بندرگاہ میں داخل ہوا۔ لوگ مسافروں اور ان کے سامان کو جہاز سے اتار کر شہر میں پہنچانے کے لئے بہت سی کشتیاں لے آگئے' جو مختلف رنگوں اور طرح طرح کی تصویروں سے مزین تھیں۔

تم جانتے ہو' میرے دوستو! وینس بہت سے چھوٹے چھوٹے قریبی جزیروں پر قائم ہے اس کے مکانوں اور عمارتوں کی بنیاد پانی میں رکھی گئی ہے۔ وہاں سڑکوں کی بجائے نہریں ہیں اور گھوڑے گاڑیوں کا کام کشتیوں سے لیا جاتا ہے۔

جب میں جہاز سے اتر کر کشتی میں آیا' تو ملاح نے مجھ سے پوچھا:

"کہاں جائیں گے؟ حضور!"

میں نے شہر کے محافظ کا نام لیا' تو اس نے نہایت اہتمام و احترام کے ساتھ مجھے دیکھا اور کشتی کھینے لگا

کشتی مجھے لے کر روانہ ہوئی۔ اس وقت رات ہو چکی تھی اور اس نے سارے شہر کو اپنی چادر میں لپیٹ لیا تھا۔ عظیم الشان عمارتوں' عبادتگاہوں اور عشرتکدوں کی کھڑکیاں بجلی کی روشنی سے جگمگا رہی تھیں اور اس روشنی کا عکس متحرک پانی میں پڑ کر ایک دلفریب منظر پیش کر رہا تھا کہ وینس شاعر کا خواب معلوم ہونے لگا تھا۔

کشتی ابھی پہلی ہی نہر کے موڑ پر پہنچی تھی کہ میں نے بے شمار گھنٹوں کی جھنکار سنی' جو فضا کو غمناک اور ڈراؤنی آوازوں سے لبریز کر رہے تھے گو اس وقت میری ذہنی بے خبری نے مجھے تمام خارجی مظاہر سے بے تعلق کر رکھا تھا' لیکن گھنٹوں کا وہ شور' میخوں کی طرح میرے سینہ کو چھیدے ڈال رہا تھا۔

کشتی ایک سنگین زینہ کے پاس جا کر رک گئی۔ جس کی سیڑھیاں سطح آب سے شروع ہو کر ایک پختہ راستہ پر تمام ہوتی تھیں۔ ملاح نے مجھے مڑ کر دیکھا اور ایک شاندار مکان کی طرف اشارہ کر کے' جو باغ کے وسط میں تھا' کہنے لگا:

"یہی ہے وہ جگہ!"

میں کشتی سے اترا اور آہستہ آہستہ سیڑھیاں طے کرنے لگا۔ ملاح اپنے کندھے پر میرا سوٹ کیس رکھے' پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ جب میں مکان کے دروازہ پر پہنچا' تو ملاح کو اس کی اجرت دے کر رخصت کیا اور اس کے بعد دروازہ کھٹکھٹایا۔ دروازہ کھلا تو خمیدہ سر خادموں کا ایک گروہ میرے سامنے تھا جو رو رہا تھا' نالہ و ماتم کر رہا تھا' گھٹی گھٹی آہیں بھر رہا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر میں حیرت میں رہ گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک بوڑھا خادم میری طرف بڑھا اور مجھے مجروح نگاہوں سے دیکھ کر ٹھنڈا سانس بھرتے ہوئے پوچھنے لگا:

"فرمایئے! کیا ارشاد ہے؟"

میں نے کہا:

"وینس کے محافظ صاحب کا دولت خانہ یہی ہے؟"

اس نے ایجابی طور پر اپنا سر جھکا دیا۔

میں نے حاکم لبنان کا خط نکال کر اسے دیا۔ پہلے تو اس نے خاموشی سے اس کا پتہ پڑھا۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ اس دروازہ کی طرف چلا جو ایوان کے آخری سرے پر

[illegible]

... سب کچھ ہوا' لیکن جہاں تک فکر و ارادہ کا تعلق ہے' میں بالکل خالی الذہن تھا۔

... کے بعد میں ایک نوجوان خادمہ کے قریب گیا اور ان لوگوں کے نوحہ و ماتم کا سبب

دریافت کیا۔ دردناک لہجہ میں اس نے جواب دیا:
"تعجب ہے! آپ نے نہیں سنا کہ آج محافظ صاحب کی صاحبزادی کا انتقال ہو گیا۔"
اس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکی اور دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا کر زاروقطا
رونے لگی۔

میرے دوستو! اس شخص کی حالت پر غور کرو' جس نے ایک مبہم فکر کی مثال سمند
کا سفر طے کیا اور اس فکر کو ایک قہرمانی قوت نے کف آگیں موجوں اور خاکستری کہر
تلف کر دیا۔ اس نوجوان کی کسمپرسی و بے چارگی کا اندازہ کرو' جو یاس و نومیدی کی آ
زاری اور سمندر کی چیخ پکار کے درمیان دو ہفتہ تک مصروف سفر رہا اور جب منزل مقص
پر پہنچا تو خود کو ایک ایسے مکان کے دروازہ پر دیکھا' جس کے گوشوں میں درد و الم
پرچھائیاں رینگ رہی تھیں اور جس کی فضا' رنج و غم کی آہ و کراہ سے لبریز تھی۔ ا
غریب الوطن انسان کا تصور کرو' میرے دوستو! جو ایک ایسے محل میں مہمان ہونے
لئے پہنچا' جس پر موت کے سیاہ بازو سایہ فگن تھے۔

وہ نوکر' جو میرا خط لے کر آقا کے پاس گیا تھا' واپس آیا اور سر جھکا کر کہنے لگا:

"تشریف لائیے! سرکار آپ کا انتظار فرما رہے ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ میرے آگے آگے ہو لیا۔ جب ہم اس دروازہ پر پہنچے جہاں راست
ہوتا تھا' تو اس نے مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا اور میں ایک وسیع کمرہ میں داخل ہ
جس کی چھت اونچی اور فضا شمعوں سے روشن تھی۔ وہاں کچھ پادری اور معزز و
حضرات بیٹھے تھے۔ جن پر گہرا سکوت طاری تھا۔ میں بمشکل دو چار ہی قدم چلنے پایا
صدر سے ایک سفید ریش بوڑھا' جس کی کمر فرط غم سے جھک گئی تھی' اور جس
شدت الم سے بے رونق ہو گیا تھا' اٹھا اور میری طرف بڑھ کر یہ کہتے ہوئے میرا ہا
لیا:

"مجھے سخت اذیت ہے کہ آپ اتنا طول طویل سفر طے کر کے یہاں تشریف لا
ہمیں اپنی عزیز ترین متاع کے غم میں مبتلا پایا۔ لیکن مجھے امید ہے کہ ہماری یہ اہتما
غرض کی تکمیل میں حائل نہ ہو گی جس کے لئے آپ نے اتنی زحمت گوارا فرمائی
لہٰذا آپ کو بالکل پریشان نہ ہونا چاہئے۔"

میں نے چند بے ربط الفاظ میں اس کی مصیبت پر اظہار افسوس کرتے ہوئے اس
مہربانی کا شکریہ ادا کیا۔

اس کے بعد وہ مجھے ایک کرسی کی طرف لے گیا' جو دیوان کے قریب رکھی تھی اور
میں بھی حاضرین کی طرح ساکت و صامت بیٹھ گیا۔ نگاہیں بچا کر کبھی تو میں ان کے غمگین
چہروں کو دیکھتا تھا اور کبھی ان کی سرد آہیں سنتا تھا' جو میرے دل کے پرخچے اڑائے دیتی
تھیں۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک ایک کر کے لوگ وہاں سے چلے گئے اور اس خاموش کمرہ
میں میرے اور غمزدہ باپ کے سوا' اور کوئی نہ رہا۔ اس وقت میں کھڑا ہوا اور اس کی
طرف بڑھ کر کہا:

"اب مجھے اجازت دیجئے!"

انتہائی لہجہ میں اس نے جواب دیا:

"عجلت نہ فرمائیے! تشریف رکھئے! اگر آپ ہمارے رنج و غم کے دیکھنے اور ہماری آہ
و فریاد کو سننے کی تاب رکھتے ہیں' تو ہمارے مہمان رہئے!"

اس کے ان الفاظ نے مجھے شرمندہ کر دیا اور میں نے امتثال امر کے طور پر سر جھکا
دیا۔ اس نے اپنا سلسلہ کلام جاری رکھا:

"اس میں کوئی شک نہیں کہ مہمان نوازی میں اہل لبنان دنیا کے ہر ملک اور ہر قوم
سے ممتاز ہیں' تاہم میں چاہتا ہوں کہ آپ یہاں قیام فرمائیں تاکہ ہم بھی
———— مگر پورے طور پر نہ سہی' لیکن آپ کے لئے وہ آسائش بہم پہنچانے کی
کوشش کریں' جو ایک پردیسی کو آپ کے ملک میں ملتی ہے۔"

تھوڑی دیر بعد غمزدہ بوڑھے نے نقرئی گھنٹی بجائی اور ایک ملازم زرکار لباس پہنے کمرہ
میں داخل ہوا۔ بوڑھے نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

"ہمارے معزز مہمان کو مشرقی کمرہ میں پہنچا دو اور آپ کے اکل و شرب کا خیال
رکھو۔ دیکھو! آج سے تمہارا کام بس یہی ہے کہ آپ کے راحت و آرام میں رتی بھر خلل
نہ آنے پائے!"

ملازم مجھے ایک کشادہ اور خوش وضع کمرہ میں لے گیا' جس میں قیمتی فرش بچھا تھا اور
جس کی دیواریں' تصویروں اور ریشمی پردوں سے مزین تھیں۔ وسط میں ایک نفیس مسہری

تھی اور مسہری پر ایک قیمتی کمبل اور کڑھے ہوئے خوشنما تکیئے رکھے تھے۔

دو گھنٹے اسی بیقراری کے عالم میں گزر گئے کہ میں کبھی تو کمرہ میں ٹہلنے لگتا اور کبھی کھڑکی کے پاس کھڑے ہو کر فضا کو تکنے لگتا' یا ملاحوں کی آوازوں اور پانی میں چپوؤں کی جنبشوں پر کان لگا دیتا۔ یہاں تک کہ بیداری نے مجھے تھکا دیا اور میری فکر زندگی کے مظاہر و اسرار میں گم ہو گئی۔ میں مسہری پر گر پڑا اور خود کو ایک نیم شعوری کیفیت کے حوالے کر دیا' جو نیند کی مدھوشی اور بیداری کی ہوشیاری سے مرکب تھی' جس میں یاد اور فراموشی اس طرح کروٹیں لے رہی تھی' جیسے ساحل پر سمندر کا مدوجزر! اس وقت میں ایک خاموش میدان کارزار کی مثال تھا' جس میں فوجیں خاموشی کے ساتھ برسرپیکار تھیں۔ موت کا دیو سپاہیوں کو برابر زمین پر دے مار رہا تھا اور وہ خاموشی سے اپنی جان' جان آفریں کے سپرد کر دیتے تھے۔

میرے دوستو ———! مجھے معلوم نہیں کہ میں نے اس حالت میں کتنے گھنٹے گزارے۔ زندگی میں بہت سے میدان ہیں جنہیں ہماری روحیں طے کرتی ہیں۔ لیکن ہم انہیں مادی پیمانوں سے نہیں ناپ سکتے' جن کی ایجاد انسانی فکر و نظر کی مرہون ہے۔

نہیں! میں نہیں جانتا کہ میری یہ حالت کب تک رہی۔ مجھے تو اس وقت بھی صرف اتنا ہی معلوم تھا اور آج بھی صرف اتنا ہی معلوم ہے کہ اس نیم شعوری کیفیت کے دوران' میں نے اپنے بستر کے قریب ایک زندہ ہستی محسوس کی ——— ایک قوت محسوس کی' جو کمرہ کی فضا میں مرتعش تھی ——— ایک اثیری وجود محسوس کیا' جو بغیر کسی آواز کے مجھے پکار رہا تھا اور بغیر کسی اشارہ کے مجھ میں جوش و ہیجان پیدا کر رہا تھا میں اٹھ کھڑا ہوا اور ایک ہمہ گیر و قوی اثر کے تحت کمرہ سے نکل کر باہر آ گیا۔ میرے قدم غیر ارادی طور پر اٹھ رہے تھے۔ میں اس شخص کی طرح چل رہا تھا' جو سوتے میں چلتا پھرتا ہے اور اس عالم میں چل رہا تھا جو وقت اور فاصلہ کی قیدوں سے یکسر آزاد تھا۔ یہاں تک کہ میں نے ساری ڈیوڑھی طے کر لی اور ایک بہت بڑے کمرہ میں داخل ہو گیا۔

کمرہ کے وسط میں ایک لاش رکھی تھی' جس کے دائیں بائیں دو لیمپ روشن تھے اور چاروں طرف پھولوں کے ڈھیر لگے تھے۔ میں نے قدم بڑھایا اور جھک کر دیکھا ——— اف! وہ میری محبوبہ کا چہرہ تھا ——— میرے خوابوں کی پری کا چہرہ تھا' جس پر موت نے

اپنی باریک نقاب ڈال رکھی تھی ——— آہ! میری آنکھوں کے سامنے وہ عورت تھی' جس سے میں محبت سے بڑھ کر محبت کرتا تھا۔ سفید پھولوں کے درمیان' سفید کفن میں' وہ سفید و بے جان جسم تھا' جس پر زمانے کی خاموشی اور ازل کی دہشت طاری تھی۔

اے خدا! ——— اے محبت' زندگی اور موت کے مالک!! تو ہی ہے' جس نے ہماری روحوں کو پیدا کیا اور نور و ظلمت کے اس ہجوم میں پھینک دیا ——— تو ہی ہے' جس نے ہمارے دلوں کی تخلیق کی اور انہیں امید و الم کی دھڑکنیں عطا فرمائیں ——— ہاں! تو ہی ہے جس نے میری رفیقہ کو مجھ سے ملایا' لیکن اس وقت' جب اس کا تاب ناک جسم سرد و بے جان ہو چکا تھا ——— تو ہی ہے' جس نے مجھ پر یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ موت' زندگی سے کیا چاہتی ہے' اور غم' خوشی سے کیا غرض رکھتا ہے' مجھے ایک ملک سے دوسرے ملک میں پہنچایا ——— تو ہی ہے' جس نے میری وحدت و تنہائی کے جنگل کو ایک سفید چنبیلی کے پھول سے زینت بخشی اور اس کے بعد مجھے دور ——— ایک وادی میں ——— پھینک دیا' تاکہ میں وہاں اس پھول کو مرجھایا ہوا دیکھوں!

ہاں! میرے دوستو! ——— میری غربت وطن اور تنہائی کے رفیقو!! ——— اللہ نے چاہا اور اپنی مشیت کے لئے مجھے اندرائن کا تلخ جام پلا دیا۔

ہم انسان ——— ہم لامحدود فضا کے مرتعش ذرے' اطاعت و فرماں برداری کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔ ہم اگر محبت کرتے ہیں' تو وہ محبت ہمارے لئے نہیں ہوتی' بلکہ ہماری طرف سے ہوتی ہے۔

ہم اگر خوش ہوتے ہیں' تو وہ خوشی ہماری ذات میں نہیں ہوتی' بلکہ نفس حیات میں ہوتی ہے ——— اسی طرح اگر ہم دردناک ہوتے ہیں' تو وہ درد ہمارے زخموں سے نہیں پھوٹتا' بلکہ احشائے فطرت سے پھوٹتا ہے۔

دوستو! ——— میں نے تمہیں یہ کہانی "شکایتاً" نہیں سنائی۔ اس لیے کہ جو کوئی شکایت کرتا ہے' وہ زندگی پر شک کرتا ہے اور میں صاحب ایمان ہوں۔ اس تلخی کی صلاحیت پر ایمان رکھتا ہوں' جس کا حاصل' ہر وہ گھونٹ ہے' جو میں ساغر شب کے ذریعہ پیتا ہوں۔ ان میخوں کے حسن و دلکشی پر ایمان رکھتا ہوں' جو میرے سینہ کو چھیدے ڈالتی

ہیں۔ ان فولادی انگلیوں کی نرمی و ملائمت پر ایمان رکھتا ہوں' جو میرے دل کے پردہ کو جھیر جھیر کئے دیتی ہیں۔

دوستو! ---------- یہ ہے میری کہانی! میں اس کا انجام کیا بیان کروں' جب کہ اس کی کوئی انتہا ہی نہیں ہے۔ مختصر یہ کہ میں اس نوخیز حسینہ کی میت کے سامنے گردن جھکائے بیٹھا رہا' جسے میرا دل خواب و خیال کی دنیا میں چاہتا تھا اور میری نگاہ ایک لمحہ کے لیے اس کے چہرے سے نہ ہٹی' یہاں تک کہ صبح نے اپنا ہاتھ کھڑکی کے شیشوں پر رکھ دیا۔ اب میں اٹھا اور اپنے کمرہ میں واپس چلا گیا۔ اس عالم میں کہ میری کمر ابدیت کی گراں باریوں سے دوہری ہوئی جارہی تھی اور میرے ہاتھ میں انسانیت کے دوردو غم کا عصا تھا۔

تین ہفتہ وینس میں ٹھہر کر میں لبنان واپس آگیا۔ اس شخص کی طرح' جو زمانہ کی گہرائیوں میں ایک ہزار صدیاں گزار کر واپس ہوا ہو۔ اور ہر اس لبنانی کی طرح' جو پردیس سے پردیس کی طرف لوٹتا ہے۔

مجھے معاف کرنا' میرے دوستو!! کہ میری داستان بہت طویل ہو گئی۔

پرچھائیاں

شب نے تاریکی کا لبادہ اوڑھا اور نیند نے زمین پر اپنا آنچل پھیلا دیا تو میں اپنے بستر سے اٹھا اور سمندر کی سمت روانہ ہوا----- اور اپنے دل میں دھراتا رہا۔

"سمندر کبھی نہیں سوتا اور اس کی بیداری محروم خواب نفس کے لئے سکون آور ہے!"

جب میں ساحل پہ پہنچا تو گردوپیش کی ہرشے پر کہرے کے آنچل بکھر چکے تھے اور لگتا تھا کائنات ایک حسین و جمیل دوشیزہ ہے جس کے رخ انور پر خاکستری نقاب ڈال دی گئی ہے۔

میں ساحل پر استادہ رہا اور ایک دوسری کے تعاقب میں بھاگتی ہوئی موجوں کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ میری ساعت ان کے نغمہ ہائے عبودیت سے محظوظ ہو رہی تھی اور ذہن ان لازوال قوتوں پر غور کر رہا تھا۔ جو ان کے سینہ ہائے عمیق میں روپوش تھیں---- وہ قوتیں جو طوفان کے ساتھ ابھرتی' آتش فشاؤں کے ساتھ پھٹتی اور پھولوں کے سنگ مسکراتی اور ندیوں کے ساتھ گنگناتی ہیں-----

تھوڑی دیر کے بعد میں نے مڑ کے دیکھا تو قریب کی ایک چٹان پر تین پرچھائیاں نشستہ تھیں' جنہیں کہر کے لطیف آنچل چھپانے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔

میں دھیرے دھیرے ان کی سمت چلا۔ گویا ان کے وجود میں سحر آفریں قوت تھی جو غیرارادی طور پر مجھے اپنی جانب کھینچ رہی تھی۔

جب میرے اور ان کے درمیان چند قدموں کا فاصلہ رہ گیا' تو میں ٹھہر گیا اور اپنی نگاہیں ان پر مرکوز کر دیں---- گویا اس جگہ کوئی فسوں کارفرما تھا۔ جس نے میرے ارادے کو سلب اور میرے روحانی تصورات کو جگا دیا تھا۔

اسی وقت ایک پرچھائیں اپنی جگہ سے اٹھ کے کھڑی ہوئی اور ایک ایسی آواز میں جو

سمندر کی سرگوشیوں سے مشابہہ تھی' اس نے کہا:

"زندگی' محبت کے بغیر ایسی ہے جیسے وہ پیڑ جس میں پھول ہوں اور نہ پھل---- اور محبت' بغیر حسن کے ایسی ہے' جیسے پھول جن میں مہک نہ ہو اور پھل جو بیج سے محروم ہوں---- زندگی' محبت' اور حسن---- یہ ایک مستقل ذات کے تین جوہر ہیں۔

وہ مستقل ذات' جو تغیرو انفعال سے ماورا ہے----"

پھر دوسری پرچھائیں کھڑی ہوئی اور ایک ایسی آواز میں جو کسی آبشار سے مشابہہ تھی' کہنے لگی:

"زندگی' بغاوت کے بغیر اس موسم کی مثال ہے جو محروم بہار ہو' اور بغاوت بغیر صداقت کے ایسی ہے جیسے بہار صحرا بے آب و گیاہ میں---- زندگی' بغاوت' اور صداقت---- ایک لازوال وجود کے تین جوہر ہیں۔

وہ لازوال وجود' جو تغیرو انفعال سے آزاد ہے!"

اس کے بعد تیسری پرچھائیں اٹھی اور رعد سے مشابہہ آواز میں بولی:

زندگی' آزادی کے بغیر روح سے محروم وجود کی طرح ہے' اور آزادی بغیر فکر کے ایسی ہے جیسے روح گمراہی کا شکار ہو۔ زندگی' آزادی اور فکر' ایک تنہا ازلی ذات کے تین جوہر ہیں۔

وہ مستقل ذات' جو زوال و فنا سے ماوراء ہے----"

اس کے بعد تینوں پرچھائیاں ایک ساتھ ا-ستادہ ہوئیں اور پرجلال لہجے میں کہنے لگیں:

"محبت اور اس کی تخلیقات
بغاوت اور اس کے نتائج
آزادی اور اس کے عواقب
خدائے لازوال کے تین مظاہر ہیں
اور خدا دنیائے فکرو دانش کا سر عظیم ہے!"

اور ماحول پر ایک ایسا سکوت چھا گیا جو غیر مری پروں کی سرسراہٹ اور اثیری اجسام کے تموج سے لب ریز تھا---- میں نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور شنیدہ اسرار کی بازگشت سننے لگا۔

اور جب میں نے آنکھوں کے پٹ کھولے اور دوبارہ اسی سمت میں دیکھا تو کہر آلود سمندر کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ میں اس چٹان کے قریب گیا جہاں تینوں پرچھائیاں بیٹھی تھیں لیکن وہاں بھی کچھ نہ پایا---- سوائے دھوئیں کے اس ستون کے' جو سوئے فلک محو پرواز تھا----!!!

دوست

میرے دوست! میں وہ نہیں ہوں جو میں دکھائی دیتا ہوں۔ میرا ظاہر تو صرف ایک لباس ہے‘ ہاں فکر و الم سے بنا ہوا ایک لباس۔ جو مجھے تیرے سوالوں سے محفوظ رکھتا ہے اور تجھے میری بے اعتنائی کا گلہ مند نہیں ہونے دیتا۔

میرا من خاموشی کے پردوں میں مستور ہے اور ہمیشہ وہیں مستور رہے گا۔ کوئی اسے دیکھ نہ سکے گا۔ کوئی اس تک نہ پہنچ سکے گا۔

میرے دوست!

(میں یہ نہیں کہتا۔ کہ جو کچھ میں کہوں تم اسے سچ مانو۔ اور جو کچھ میں کروں اس کی تائید کرو۔ کیونکہ میری باتیں میری نہیں۔ بلکہ تیرے ہی خیالات کی بازگشت ہیں۔ اور میرے افعال تیری ہی امیدیں ہیں) جو لباس مجاز میں ظاہر ہوتی ہیں میرے دوست۔

جب تو کہتا ہے کہ "ہوا کا رخ مشرق کو ہے" تو میں کہتا ہوں کہ "ہاں ہوا کا رخ مشرق کو ہے۔ کیونکہ میں تجھے یہ نہیں بتانا چاہتا کہ اس وقت میرے دل میں ہوا کی بجائے سمندر کا خیال موجزن ہے۔ تو میرے متلاطم خیالات کی تہہ تک نہیں پہنچ سکتا اور نہ میں چاہتا ہوں کہ تو ان کی تہہ تک پہنچے۔ کیونکہ میں سمندر پر اکیلا ہی رہنا چاہتا ہوں۔

میرے دوست!

جب تیرے لئے دن ہوتا ہے تو میرے لئے رات ہوتی ہے لیکن پھر بھی میں اس وقت دوپہر کی ان سنہری کرنوں کی باتیں کرتا ہوں جو پہاڑ پر رقص کرتی ہیں اور اس ارغوانی سائے کی باتیں کرتا ہوں جو وادی پر آہستہ آہستہ چھا جاتا ہے کیونکہ تو میری تاریکیوں کے گیت نہیں سن سکتا اور نہ ستاروں کے پاس میرے پروں کو پھڑپھڑاتے ہوئے دیکھ سکتا ہے اور میرا بھی یہی دل چاہتا ہے کہ تو میرے گیتوں کو نہ سن سکے اور نہ میرے پروں کو پھڑپھڑاتے ہوئے دیکھ سکے۔ کیونکہ میں رات کی تنہائی میں اکیلا ہی رہنا پسند کرتا

ہوں۔

میرے دوست!

جب تو اپنی بہشت کی طرف پرواز کرتا ہے تو میں اپنے دوزخ کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہوں۔ اس وقت بھی تو مجھے ایک ناقابل عبور خلیج کے پار سے پکارتا ہے۔ میرے ہمدم! میرے رفیق! تو میں تجھے میرے رفیق میرے ہمدم کہہ کر جواب دیتا ہوں۔ کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ تو میرے دوزخ کو دیکھے‘ کیونکہ اس کے شعلے تیری بینائی کو سلب کر دیں گے۔ اور اس کا دھواں تیرے سانس کو روک دے گا۔

مجھے اپنے دوزخ سے اتنی محبت ہے کہ میں نہیں چاہتا۔ تو وہاں آئے میں اپنے دوزخ میں اکیلا ہی زندگی بسر کرنا پسند کرتا ہوں۔

میرے دوست!

تجھے صداقت‘ حسن اور راست بازی سے محبت ہے اور میں بھی تیری خاطر یہی کہتا ہوں کہ ان چیزوں سے محبت کرنا بجا اور مستحسن ہے لیکن میں دل میں تیری اس محبت پر ہنستا ہوں۔ اس کے باوجود میں یہ نہیں چاہتا کہ تو میری ہنسی کو دیکھے‘ کیونکہ میں ہنسنے کے لئے بھی علیحدگی پسند کرتا ہوں۔

میرے دوست!

تو نیک‘ محتاط اور جہاندیدہ ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تو ہر بات میں یگانہ ہے میرے دوست!---- اس لئے میں بھی تجھ سے سوچ سمجھ کر باتیں کرتا ہوں۔ اس کے باوجود میں ایک دیوانہ ہوں‘ اور اپنی دیوانگی کو چھپائے رکھتا ہوں۔ کیونکہ میں اپنی دیوانگی سے علیحدہ رہنا پسند نہیں کرتا۔ میرے دوست!

تو فی الحقیقت میرا دوست نہیں ہے۔ میرے دوست---- لیکن میں تجھے یہ کیسے سمجھاؤں کہ میرا راستہ تیرے راستے سے مختلف ہے پھر بھی ہم دونوں ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے اکٹھے چل رہے ہیں۔

جب طوفان گزر گیا

لہلہاتے ہوئے کھیتوں کو زمین پر بچھا دینے اور بڑے بڑے درختوں کی مضبوط شاخوں کو توڑ دینے کے بعد طوفان تھم گیا اور اس طرح سناٹا چھا گیا۔ جیسے قدرت ہمیشہ سے پر امن رہی ہو۔ ستارے دوبارہ نظر آنے لگے۔

اسی وقت ایک نوجوان عورت اپنے کمرے میں داخل ہوئی اور اپنے بستر کے قریب گھٹنوں کے بل جھک گئی۔ وفور غم سے اس کا دل بھر آیا تھا۔ لیکن پھر بھی اس کی زبان سے یہ الفاظ نکلے۔

"میرے مالک اسے مجھ تک بخیریت پہنچا دے۔ میرے آنسو خشک ہو چکے ہیں۔ اب میں مزید آنسو نہیں بہا سکتی۔ اے مالک اے رحمٰن۔ اے رحیم۔ میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔ اور صدمہ نے میرے دل میں گھر کر لیا ہے۔ میرے مالک اسے جنگ کی ہولناکیوں سے بچا۔ تو اسے بے رحم موت سے محفوظ رکھ وہ کمزور ہے اور طاقتور لوگوں کے بس میں ہے۔ اے مالک۔ میرے محبوب کو بچا۔ اسے اس دشمن سے بچا جو تیرا بھی دشمن ہے۔ اسے زبردستی کی موت سے بچا۔ مجھے اس سے ملا دے۔ یا ایسا ہو کہ وہ یہاں آجائے اور مجھے اپنے ساتھ لے کر چلا جائے۔"

اسی وقت ایک نوجوان مرد بڑی خاموشی سے کمرہ میں داخل ہوا۔ اس کے جسم پر جگہ جگہ پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔

وہ اس عورت کے قریب پہنچ گیا اور غم اور خوشی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ اس نے عورت کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور پھر اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔ پھر ایک ایسی آواز کے ساتھ جس میں ماضی کا غم اور حال کی خوشی شامل تھی۔ اس نے کہا "مجھ سے مت ڈرو۔ میں تمہاری دعاؤں کا مرکز ہوں۔ مسکراؤ۔ اس لئے کہ اس نے مجھے بخیریت تمہارے پاس پہنچا دیا ہے اور انسانیت نے ہمیں وہ چیز واپس دلا دی ہے۔ جسے

دوسروں کی خود غرضی اور لالچ نے ہم سے چھیننا چاہا تھا۔ اس لئے اب رنج نہ کرو بلکہ مسکراؤ۔ میری پیاری اب خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں اس لئے کہ محبت ایسی طاقت ہے۔ جو موت کو شکست دے دیتی ہے۔ ایسا جادو ہے جو دشمن کو مغلوب کر لیتا ہے۔ ادھر دیکھو یہ میں ہوں۔ تمہارا محبوب۔ میں ایک تصور یا خواب نہیں جو موت کی وادی سے نکل کر آیا ہوں۔ میں حقیقت میں زندہ ہوں۔ ادھر دیکھو میری طرف۔

گھبراؤ نہیں۔ ادھر دیکھو میں ایسی بیج ہوں جو تلواروں اور توپوں کے بھیانک ماحول سے نکل کر آیا ہوں۔ میں لوگوں کو جنگ پر محبت کے غلبہ کی داستان سناؤں گا۔"

وہ اس سے زیادہ کچھ نہ بول سکا۔ اس کا دل بھر آیا۔ اس کے آنسو دل کا پیغام سنانے لگے۔ اور مسرت کے فرشتے اس عمارت پر اپنا سایہ ڈالنے لگے اور پھر ان دونوں دلوں نے اس یکجائی کو دوبارہ پا لیا۔ جو ان سے چھین لی گئی تھی۔

اگلی صبح کو وہ دونوں ایک میدان میں کھڑے ہوئے قدرت کے اس حسن کا نظارہ کر رہے تھے۔ جسے کل کا طوفان کسی حد تک زخمی کر چکا تھا۔

اطمینان کا ایک گہرا سانس لینے کے بعد سپاہی نے مشرق کی طرف دیکھا اور اپنی محبوبہ سے مخاطب ہوا۔

"پیاری ادھر دیکھو تاریکی نئے سورج کو جنم دے رہی ہے۔"

اسرار حیات

ایک پرشکوہ عمارت خاموش رات کی پنہاںیوں میں اس طرح کھڑی تھی جس طرح زندگی موت کے سایہ میں ------!

اس مقام عالی میں ہاتھی دانت کی مسند پر ایک دوشیزہ اپنے نرم و نازک ہاتھ سے اپنا خوبصورت سر سنبھالے بیٹھی تھی۔

یوں معلوم ہوتا تھا کہ مرجھایا ہوا کنول اپنی بڑی بڑی پتیوں پر جھک گیا ہے اس نے اپنے اردگرد اس بدنصیب قیدی کی طرح دیکھا جو زندان کی دیواروں میں اپنی نگاہیں چیر کر آزاد زندگی کی روشنی دیکھنا چاہتا ہو

رات کے لمحے ارواحِ شبینہ کی طرح گزر رہے تھے جو جلوس در جلوس غم و اندوہ میں مرثیے گاتے جا رہے تھے ----

------ اور اس دوشیزہ نے اس درد انگیز تنہائی میں آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگا کر ایک دلچسپ اطمینان حاصل کیا۔

جب اس دوشیزہ نے یہ محسوس کیا کہ وہ درد و کرب کے ہیجان کو اب زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکتی اور اس پر یہ انکشاف بھی ہو گیا کہ اس کا دل اسرار حیات کے خزانوں سے بھرپور ہو گیا ہے تو اس نے قلم ہاتھ میں لیا اور سیاہی میں اپنے آنسوؤں کی آمیزش کی اور الفاظ کا یہ ٹکڑا لکھا ------!

"میری محبوب بہن!

جب دل کی گہرائیوں میں اسرار کی بھرمار ہو' آنکھیں آنسوؤں کی جلن سے تاباک ہو جائیں اور دل سینے کی ہڈیوں کی قید و بند سے آزاد ہونا چاہتا ہو تو پھر ان بھول بھلیوں سے باہر نکلنے کے لئے صرف جذبات کا سیلاب ہی کام آ سکتا ہے۔

غم زدہ لوگ سوگوار رہ کر ہی نشاط و سرور حاصل کیا کرتے ہیں اور عشاق خوابوں کی دنیا میں رہ کر دل و جگر کے لئے اطمینان اور تسلی تلاش کرتے ہیں اور مظلوم کے کان میں ہمدردی کا اگر ایک لفظ پڑ جائے تو وہ شاداں ہو جاتا ہے۔

میں نے اس لئے قلم اٹھایا ہے کیونکہ اس شاعر کی طرح میرے سینے میں جذبات امڈ آئے ہیں جو قوت یزداں کے فیضیات سے لبریز ہو کر ماحول کے حسن کو اپنے شعروں میں سمو دیتا ہے۔

میں اس فاقہ کش انسان کے بچے کی طرح ہوں جو بھوک سے بیتاب ہو کر بلبلا اٹھا ہو اور جسے قطعاً" اس امر کا احساس نہ ہو کہ اس کی ماں تو کئی دنوں سے فاقہ کشی کر رہی ہے اور زندگی کے میدان میں مات کھا چکی ہے۔

بہن! میری الم انگیز کہانی سنو اور میرے ساتھ مل کر آنسو بہاؤ اشک ریزی بھی تو ایک عبادت ہے اور وہ آنسو جن میں رحم کی آمیزش ہو ایک عالی مرتبہ خیرات کے مانند ہے کیونکہ وہ ایک حساس' زندہ اور ارفع روح کی گہرائیوں سے امڈ کر آتے ہیں اور یہ آنسو کبھی رائیگاں نہیں جاتے۔

میں نے ایک دولت مند شخص سے شادی کی۔ یہ میرے باپ کی رضا تھی۔

میرا باپ ان باثروت لوگوں سے تھا جن کی ہمیشہ یہ آرزو ہوتی ہے کہ اپنی تجوریوں میں سونے اور چاندی کی اینٹوں کا اضافہ کیا جائے تاکہ کسی وقت افلاس سے دوچار نہ ہونا پڑے۔ یہ لوگ اپنے اعلیٰ رتبے میں ہمیشہ شان و شوکت کی آمیزش کرتے ہیں کہ کہیں سیاہ بختی ان پر وار نہ کر بیٹھے۔

محبت اور خوابوں کی دنیا میں رہتے ہوئے بھی آج میں دولت و ثروت کے بڑے بت کے سامنے بھینٹ چڑھا دی گئی ہوں۔ جس سے میں انتہائی نفرت کرتی ہوں۔ شوکت و عظمت قدم بوسی کر رہی ہے۔ جس کو میں حقارت کی نگاہ سے دیکھتی ہوں۔

میں اپنے خاوند کا احترام کرتی ہوں کیونکہ وہ بخشندہ ہے اور ہر ایک کے ساتھ تلطف سے پیش آتا ہے وہ مجھے شاداں رکھنے کے لئے بڑی کوشش کرتا ہے۔ وہ میری خوشی کے لئے سونے کے انبار لٹا دیتا ہے لیکن میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ ایسی حرکتوں سے سچی اور مقدس محبت کا ایک لمحہ بھی معرض وجود میں نہیں آ سکتا۔

میری بہن مجھے نشانہ تضحیک نہ بناؤ۔ میرے دل میں وہ کرن بیدار ہو چکی ہے جو اس

حقیقت کو روشن کرتی ہے کہ عورت کا دل کون سی باتوں کا محتاج ہے ـــــ عورت کا وہ ننھا سا دل جو ایک نازک سے پرندے کے مانند ہوتا ہے جو محبت کے آسمانوں کی وسعتوں میں پرواز کر رہا ہو۔

ــــــ وہ دل جو ایک ایسی صراحی کی طرح ہے جس میں ازمنہ قدیم کی شراب لبریز ہو اور جس سے صرف روحیں جرعہ آشامی کر سکیں۔

وہ دل ایک ایسے صحیفے کے مانند ہے جس کے اوراق میں مسرت اور الم' شادمانی اور درد' قہقہہ اور گریہ زاری کے ابواب بھرپور ہوں۔

اس صحیفے کے الفاظ صرف وہی شخص پڑھ سکتا ہے جو دل نواز دوست ہو اور عورت کے دل کا ایک حصہ اس کے دل میں ہو اور جو ازل ہی سے اس عورت کے لئے معرض وجود میں آیا ہو۔

روح کے مطالب اور دل کے معانی کی گہرائی تک پہنچ جانے کے بعد میں یہ محسوس کر رہی ہوں کہ تمام عورتوں سے زیادہ زندگی کا اوراک مجھ میں پیدا ہو گیا ہے۔

یہ راز میں نے پا لیا ہے۔ میرے عظیم الشان گھوڑے' خوبصورت گاڑیاں' زر و جواہرات سے بھرپور چمکتی ہوئی تجوریاں اور نجابت عالیہ اس غریب نوجوان کی ایک نگاہ کی قدر و قیمت کے برابر نہیں جو زمانے کے ہاتھوں درد و کلفت میں گھرا ہوا زندگی بسر کر رہا ہو۔

ــــــ وہ نوجوان جس کو میرے باپ کی رضائے ظلم و ستم کا نشانہ بنایا گیا اور وہ زندگی کے تنگ و تاریک زنداں میں اس وقت بدبختی کے ایام بسر کر رہا ہے۔

میری عزیز بہن! مجھے تمہاری طرف سے تسلی کی ضرورت نہ ہو گی۔ کیونکہ آفت اور مصیبت کی جس منزل سے میں گزر رہی ہوں اس میں میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ صرف محبت ہی سب سے بڑی طمانیت بخش چیز ہے۔

آج میں آنسوؤں کی رات میں کھڑے ہو کر بہت دور دیکھ رہی ہوں اور اس امر کی منتظر ہوں کہ کب موت اس راستے کی طرف رہنمائی کرے جہاں میں اپنی روح کے ساتھی سے ملاقات کروں اور اس سے اسی طرح بغلگیر ہوں جیسا کہ اس اجنبی دنیا میں داخل ہونے سے پہلے ہوتے تھے۔

میرے متعلق کوئی برا خیال اپنے دل میں جاگزیں نہ کرنا۔ میں ایک وفا شعار بیوی کی طرح اپنا فرض ادا کر رہی ہوں اور خاموشی اور تحمل سے مرد کے بنائے ہوئے قوانین پر عمل پیرا ہوں۔

میں اپنے حواس کے ساتھ اپنے خاوند کی عزت کرتی ہوں۔ دل سے اس کا احترام کرتی ہوں اور اپنی روح سے اس کی تعظیم کرتی ہوں۔ لیکن ایک دیوار راستے میں حائل ہے ــــ خدائے قدوس نے میری زندگی میرے محبوب کے لئے وقف کر دی تھی ــــ!

یہ مشیت ایزدی تھی کہ میں ایسے شخص کی معیت میں زندگی بسر کروں جو میرے لئے نہیں اور میں اسی مشیت کے مطابق خاموشی سے اپنے دنوں کو برباد کر رہی ہوں۔

اگر حیات جاوید کے دروازے میرے لئے نہ کھلے تو اپنی روح کے نصف حسن زوال کے ساتھ زندگی بسر کروں گی اور صرف ماضی کی طرف میری نگاہیں جمی رہیں گی اور وہ ماضی حقیقت میں حال ہے'

ــــ میں زندگی پر اس طرح نگاہیں دوڑاؤں گی جس طرح بہار خزاں کی طرف دیکھتی ہے۔

میں زندگی کی رکاوٹوں کو اس شخص کی نگاہوں سے دیکھوں گی جو کٹھن پہاڑی خارزار راستے طے کر کے پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ چکا ہے ــــ!"

اس حد تک پہنچ کر دوشیزہ نے اپنا قلم پرے پھینک دیا اور اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ کر زار و قطار رونے لگی۔

اس کا دل اس امر کی اجازت نہیں دے سکتا کہ مقدس ترین رازہائے محبت قلم کے حوالے کر دئے جائیں۔ البتہ آنسوؤں کے ذریعے ہی یہ راز افشا کیا جا سکتا ہے۔ یہ آنسو غم کی گہرائیوں سے پیدا ہوئے اور برس کر فضا میں تحلیل ہو گئے وہ فضا جو عشاق اور پھولوں کی روحوں کی آماجگاہ ہے۔

ایک لمحہ کے بعد اس نے قلم ہاتھ میں لیا۔

"کیا تمہیں وہ نوجوان یاد ہے؟ کیا تمہیں اس کی وہ کرنیں یاد ہیں جو اس کی آنکھوں

سے نکلا کرتی تھیں؟ کیا تمہیں اس کے وہ غم انگیز آثار بھی یاد ہیں جو اس کے چہرے پر پھیل جایا کرتے تھے؟

تم نے وہ قہقہہ بھی فراموش نہیں کیا ہو گا جو اس ماں کے آنسوؤں کے مانند تھا۔ جس سے اس کا اکلوتا بچہ چھین لیا جائے۔

کیا تمہیں اس کی وہ شفاف آواز بھی یاد ہے جو ایک دور دراز وادی میں گونج کی مانند تھی؟

تمہیں یہ بات بھی یاد ہو گی جب کہ وہ گہری سوچ میں پڑ جاتا تھا اور کائنات کی طرف آرزو انگیز لیکن خاموش نگاہوں سے دیکھتا اور پھر اجنبی سے الفاظ اس کی زبان پر آ جاتے۔ پھر وہ اپنے سر کو جھکا کر سرد آہ بھرتا اس خوف سے کہ اس کے دل کے اسرار و رموز عیاں نہ ہو جائیں۔

تمہیں اس کے خواب اور عقیدے بھی یاد ہوں گے؟ کیا تمہیں اس نوجوان کی یہ تمام باتیں یاد ہیں جس کو فطرت اپنے بیٹوں میں شمار کرتی ہے اور میرا باپ اس کو اس لئے حقارت سے دیکھتا تھا کیونکہ وہ اس ارضی خواہشات اور طمع میں اس سے بلند تھا اور وہ اپنے آپ کو اس سے نجابت اور شرافت میں ارفع خیال کرتا تھا۔

میری عزیز بہن! تم پر یہ راز تو منکشف ہو چکا ہو گا کہ میں اس محدود تر دنیا میں ایک شہید کی مانند ہوں اور جہالت کا شکار!

کیا تم اس بہن سے ہمدردی کا اظہار کر سکو گی جو خوفناک رات کی تاریکی میں اپنے دل کے تمام رازہائے سربستہ سے تم کو آگاہ کر رہی ہے؟

مجھے یقین ہے تم مجھ سے اظہار ہمدردی کرو گی۔ کیونکہ میں جانتی ہوں کہ تمہارا دل بھی محبت کی آماجگاہ ہے!"

صبح کی پہلی کرن بیدار ہوئی تو دوشیزہ ابدی نیند سے بغلگیر ہو گئی۔ محض اس خیال سے کہ وہ اس نیند میں زیادہ سہانے اور رسیلے سپنے دیکھ کر تلافی مافات کر سکے گی---!

رفیقہ حیات

پہلی نظر

یہ وہ ساعت ہے، جو زندگی کی بے خبری اور ہوشیاری کے درمیان خط فاصل ہے۔ یہ وہ اولین شعلہ ہے، جو زندگی کی خلاؤں کو روشن کر دیتا ہے۔ یہ سرود قلب انسانی کے پہلے تار کی پہلی طلسمی جھنکار ہے۔ یہ وہ مختصر سا لمحہ ہے، جو گوش روح میں بیتے ہوئے دنوں کے واقعات دہراتا ہے، اس کی بصارت پر اعمال شب واضح کرتا ہے، اس کی بصیرت کو اس دنیا کے وجدانی کارناموں سے آگاہی بخشتا ہے اور آنے والے عالم کی دائمی زندگی کا راز اس پر فاش کرتا ہے۔ یہ وہ بیج ہے جسے عشتروت(ا) بلندی سے پھینکتی ہے اور آنکھیں دل کے کھیت میں ڈال دیتی ہیں۔ جذبات اس بیج کو سینچتے ہیں اور روح اس کے پھل کھاتی ہے۔

محبوبہ کی پہلی نظر اس روح سے مشابہ ہے، جو اتھاہ سمندر کی سطح پر منڈلایا کرتی تھی اور جس سے زمین و آسمان پیدا ہوئے ہیں۔

رفیقہ حیات کی پہلی نظر خدا کے قول "کن" کی مانند ہے!

پہلا بوسہ

یہ اس جام کا پہلا گھونٹ ہے، جسے دیوتاؤں نے محبت کی شراب سے لبریز کیا تھا۔ یہ شک---- جو دل کو بہکا سکھا کر اسے غمگین کرتا ہے---- اور یقین---- جو دل کی خلاؤں کو پر کر کے اسے مسرت بخشتا ہے---- کے درمیان حد فاصل ہے۔ یہ روحانی زندگی کے قصیدہ کا مطلع اور معنوی انسان کی داستان حیات کا پہلا باب ہے۔ یہ وہ حلقہ ہے، جو ماضی کے دھندلکے کو مستقبل کی روشنی سے ہم رشتہ اور احساسات کی خاموشی کو ان کے نغموں سے ہم آہنگ کرتا ہے۔ یہ وہ کلمہ ہے جسے چار ہونٹ، دل کے تخت، محبت

کے بادشاہ اور وفا کے تاج ہونے کا اعلان کرتے ہوئے ادا کرتے ہیں۔ یہ وہ لطیف لمس ہے' جو گلاب کی پتیوں پر سے' نسیم کی انگلیوں کے گزرنے سے مشابہت رکھتا ہے۔۔۔۔۔۔

وہ انگلیاں جن کی گرفت میں طویل و لذیذ آہیں اور تلخی و شیریں کراہیں ہیں۔ یہ ان طلسمی لرزش کا آغاز ہے' جو دو چاہنے والوں کو اس جہان آب و گل سے نکال کر' وحی اور خوابوں کو دنیا میں لے جاتا ہے۔ یہ گل لالہ کا گل انار سے اتحاد' اور ایک تیسرے' نئے وجود کے لئے ان کا باہمی ازدواج ہے۔

اگر پہلی نظر اس بیج سے مماثلت رکھتی ہے' جسے محبت کی دیوی قلب انسانی کے میدان میں ڈالتی ہے' تو پہلا بوسہ شجر حیات کی پہلی شاخ کے کنارے کے' پہلے پھول سے مشابہت رکھتا ہے۔

وصال

یہاں محبت زندگی کے منتشر اجزا کو جمع کرنا شروع کرتی ہے اور مطالب زندگی کے زیر اثر' ان صورتوں کی شکل میں نمو پاتی ہے جنہیں دن خوش آوازی کے ساتھ پڑھتے اور راتیں ترنم سے دہراتی ہیں۔

یہاں شوق زمانہ گزشتہ کی چیستانوں سے مشکلات کے پردے اٹھاتا ہے اور لذتوں کے اجزا سے وہ سعادت پیدا کرتا ہے' جس پر کسی کو امتیاز حاصل نہیں' سوائے' نفس کی سعادت کے' جب وہ اپنے پروردگار سے ہم آغوش ہو جائے!

وصال' زمین پر ایک تیسری الوہیت کو وجود پزیر کرنے کے لئے دو الوہیتوں کا اتحاد ہے۔ وہ کمزور زمانہ کے بغض و عناد کا مقابلہ کرنے کے لئے' دو طاقتور ہستیوں کا اپنی محبت کے ذریعہ پیمان ہمدوشی ہے وہ قرمزی شراب میں زرد شراب کی آمیزش ہے تاکہ اس سے وہ نارنجی شراب(۲) وجود میں آئے' جو شفق صبح کے رنگ سے ملتی جلتی ہے وہ دو روحوں کی نفرت سے نفرت اور دو نفوس کا اتحاد سے اتحاد ہے۔ وہ اس زنجیر کی سنہری کڑی ہے' جس کا پہلا سرا نگاہ ہے اور آخری سرا سرمدیت۔ وہ پاک آسمان سے فطرت کی مقدس زمین پر شفاف بادلوں کی تراوش ہے تاکہ کھیتوں کی مبارک قوتیں ابھریں۔

اگر محبوبہ کے چہرے پر پہلی نگاہ اس بیج کی مثال ہے' جسے محبت دل کے کھیت میں

ڈالتی ہے اور اس کے لبوں کا پہلا بوسہ شاخ حیات کے پہلے پھول کی مانند' تو اس کا وصال پہلے بیج کے پہلے پھول کا پہلا پھل ہے۔

(۱) عشتروت' فنیقیا اور لبنان کے قدیم باشندوں کے نزدیک حسن و محبت کی دیوی ہے۔ یہی ہے جسے یونانی افرودائتی کے نام سے پکارتے ہیں اور رومی وینس کے نام سے (جبران)

(۲) نارنجی رنگ کیمیاوی طور پر سرخ اور زرد رنگ سے پیدا ہوتا ہے (جبران)

بارگاہ جمال

میں اجتماعی زندگی سے بھاگا اور وسیع وادی میں بھٹکنے لگا۔ کبھی تو میں نہروں کے کنارے کنارے چلنے لگتا اور کبھی چڑیوں کی چہکار سننے لگتا' یہاں تک کہ ایک ایسی جگہ پہنچا' جسے گھنے درختوں نے سورج کی نگاہوں سے محفوظ کر رکھا تھا۔ وہاں بیٹھ کر میں اپنی تنہائی سے باتیں اور روح سے سرگوشیاں کرنے لگا——— اس پیاسی روح سے' جس نے جہاں نظر ڈالی' اس شے کو دیکھا' جو شراب(ا) نہیں' سراب نظر آتی ہے۔

جب میرا ذہن مادی قیود سے آزاد ہو کر فضائے خیال میں پرواز کرنے لگا تو میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا! ایک نوخیز حسینہ میرے پاس کھڑی تھی——— وہ نوخیز حسینہ' جو انگور کی شاخوں کے سوا——— جن سے اس کے جسم کا کچھ حصہ چھپ گیا تھا——— ہر قسم کے لباس اور زیور سے بے نیاز تھی' جس کے سنہری بالوں کو گل لالہ کے تاج نے سمیٹ رکھا تھا۔

جب اسے میری نگاہوں سے یہ معلوم ہوا کہ میں حیرت کا شکار ہوں تو بولی:

"ڈرو نہیں! میں جنگل کی شہزادی ہوں!"

اس کے لہجہ کی شیرینی نے مجھ میں کچھ ہمت پیدا کی اور میں نے کہا:

"کیا تم جیسی حسین شخصیت جنگل میں رہ سکتی ہے' جو تنہائی اور درندوں کا مسکن ہے؟ تمہیں اپنی زندگی کا واسطہ! مجھے سچ سچ بتاؤ! تم کون ہو اور کہاں سے آئی ہو؟"

وہ گھاس پر بیٹھ گئی اور کہا:

"میں فطرت کا راز ہوں! میں وہ دوشیزہ ہوں' جس کی پرستش تمہارے آباؤ اجداد کرتے تھے اور جس کے لئے انہوں نے بعلبک' افقا اور جبل میں ہیکل اور قربان گاہیں بنائیں۔"

میں نے کہا:

"وہ ہیکل مسمار ہو گئے اور میرے اجداد کی ہڈیاں مٹی میں مل ملا گئیں اب ان کے دیوتاؤں اور مذاہب کے نشانات کتابوں کے چند اوراق میں باقی رہ گئے ہیں اور بس!"

اس نے جواب دیا:

"کچھ دیوتا ایسے ہیں' جو اپنے حلقہ بگوشوں کے ساتھ زندہ رہتے اور انہی کے ساتھ مر جاتے ہیں اور کچھ ایسے ہیں' جو ازلی و ابدی الوہیت کے ساتھ زندہ رہتے ہیں۔ رہی میری الوہیت' سو وہ اس جمال کی مرہون منت ہے' جسے تو ہر طرف جلوہ فرما دیکھتا ہے——— وہ جمال جو تمام فطرت ہے' جو ٹیلوں کے درمیان چرواہے کے لئے' کھیتوں کے درمیان کاشتکار کے لئے اور پہاڑوں اور ساحلوں کے درمیان خانہ بدوش قبائل کے لئے سعادت کا سرچشمہ ہے۔ وہ جمال' جو حکیم کے لئے عرش حقیقت کا زینہ ہے!"

ایسی حالت میں کہ میرے دل کی دھڑکنیں وہ کچھ کہہ رہی تھیں' جس سے زبان نا آشنائے محض ہے' میں نے کہا:

"بیشک جمال ایک قوت ہے' خوفناک اور ڈراؤنی!"

اس کے ہونٹوں پر پھولوں کا تبسم تھا اور نگاہوں میں زندگی کے اسرار۔ اس نے کہا:

"تم انسان ہر چیز سے ڈرتے ہو' یہاں تک کہ اپنی ذات سے بھی۔ تم آسمان سے ڈرتے ہو' حالانکہ وہ امن و سلامتی کا سرچشمہ ہے' فطرت سے ڈرتے ہو' حالانکہ وہ اطمینان و راحت کا گہوارہ ہے' خداؤں کے خدا سے ڈرتے ہو' اور عداوت و غضب کو اس کی ذات سے منسوب کرتے ہو حالانکہ وہ اگر محبت و رحمت نہیں ہے تو کچھ نہیں ہے!"

تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد' جس میں لطیف خواب گھلے ملے تھے۔ میں نے اس سے پوچھا:

"یہ جمال کیا ہے؟ کیونکہ لوگ تو اس کی تعریف و تحدید میں مختلف الرائے ہیں بالکل اسی طرح' جیسے اس کی محبت و تکریم میں!"

اس نے جواب دیا:

"جمال وہ ہے' جس کی طرف تو خود بخود کھنچے——— جسے دیکھ کر تو اسے دینا چاہے اس سے لینا نہ چاہے۔ ——— جسے اجسام مصیبت اور ارواح عطیہ

سمجھیں ——— جو رنج اور خوشی کے درمیان رشتہ اتحاد ہو ——— جسے تو روپوشی میں جلوہ فرما دیکھے' لاعلمی میں آشنا پائے اور خاموشی میں بولتے سنے ——— جو ایک قوت ہے' جس کا آغاز تیری ذات کی انتہائی پاکیزگی سے ہوتا ہے۔ اور انتہا اس نقطہ پر' جو تیرے تصورات سے ماوراء ہے۔"

جنگل کی شہزادی میرے قریب آئی اور اپنا معطر ہاتھ میری آنکھ پر رکھ دیا' جب اس نے اپنا ہاتھ میری آنکھ سے ہٹایا تو میں نے خود کو اس وادی میں تنہا پایا۔ میں وہاں سے لوٹ آیا' دل ہی دل میں کہتا ہوا' اور بار بار کہتا ہوا:

"جمال وہ ہے' جسے دیکھ کر تو اسے دینا چاہے' لینا نہ چاہے!"

———O———

(۱) یہاں شراب سے مراد وہ شراب نہیں جو نشہ آور ہے بلکہ ہر وہ چیز مراد ہے جو پی جاتی ہے۔ (مترجم)

ملاقات

جب رات آسمان کے لباس میں تاروں کے جواہر ٹانک چکی' تو وادی نیل سے ایک پری' اپنے غیر مرئی پروں کو پھڑپھڑاتے ہوئے بلند ہوئی اور بحر روم پر چھائے ہوئے ان بادلوں کے تخت پر بیٹھ گئی جو چاند کی شعاعوں سے نقرئی معلوم ہو رہے تھے۔ فضا میں تیرتی ہوئی روحوں کا ایک جھلڑ اس کے سامنے سے گزرا جو بلند آواز میں کہہ رہا تھا:

"پاک ہے! پاک ہے! پاک ہے! مصر کی وہ بیٹی' جس کی عظمت سارے خطہ ارض کو محیط ہے!!"

اس چشمہ کے منبع کی بلندیوں سے' جو صنوبری جھنڈ کو گھیرے ہوئے تھا' ایک نوجوان کا سایہ' سارو فیم(۱) کے ہاتھوں میں لپٹا ہوا' ابھرا اور پری کے پہلو میں تخت پر بیٹھ گیا۔ روحیں پھر آئیں اور یہ چلاتی ہوئی ان کے سامنے سے گزر گئیں!

"پاک ہے! پاک ہے! پاک ہے' لبنان کا وہ نوجوان' جس کی بزرگی سے زمانہ لبریز ہے!!"

جب عاشق نے محبوبہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں تو موجوں اور ہواؤں نے ان کی اس سرگوشی کو دنیا کے گوشہ گوشہ میں پہنچا دیا۔

"ایسس کی بیٹی! تیرا حسن کس قدر مکمل ہے' اور میری محبت کتنی بے پناہ!"

"عشروت کے بیٹے! تو نوجوانوں میں کتنا حسین ہے' اور میرا جذبہ شوق کس درجہ وافر!"

"میری محبت تیرے اہرام کی مثال ہے' میری محبوبہ! جسے زمانہ مسمار نہیں کر سکتا!"

"اور میری محبت تیرے صنوبر کے درختوں سے مشابہ ہے' میرے حبیب! جس پر عناصر غلبہ نہیں پا سکتے!"

"مختلف اقوام کے فلسفی مشرق و مغرب سے آتے ہیں؟ میری محبوبہ! تاکہ تیری

حکمت سے نفع اندوز ہوں اور تیرے اسرار و رموز معلوم کریں۔"

"دنیا کی بڑی بڑی ہستیاں مختلف ملکوں سے وارد ہوتی ہیں' میرے حبیب! تاکہ تیرے جمال کی شراب سے مخمور اور تیرے معانی کے طلسم سے مسحور ہوں!"

"میری پیاری! تیری ہتھیلی ان بے شمار نیکیوں کا کھیت ہے' جن سے مودی خانے بھرے جاتے ہیں۔"

"میرے پیارے! تیرے بازو شیریں پانی کا سرچشمہ ہیں اور تیرے سانس نشاط آفریں ہوائیں!"

"نیل کے محل اور ہیکل' میری پیاری! تیری عظمت کا ڈنکا بجاتے ہیں اور ابو الہول تیری بزرگی کی داستان سناتا ہے!"

"تیری چھاتی کے یہ صنوبری درخت' میرے پیارے! تیری شرافت و نجابت کی نشانیاں ہیں اور تیرے گردوپیش کے یہ قلعے تیری عظمت و شجاعت کے ترجمان!"

"آہ! میری محبوبہ! کتنی حسین ہے تیری محبت! اور کتنی شیریں ہے وہ امید' جو تیرے ارتقا سے وابستہ ہے!!"

"آہ تو کتنا محترم دوست اور کتنا وفادار شوہر ہے۔ تیرے تحفے کتنے حسین اور تیری بخششیں کتنی نفیس ہیں! تو نے میرے پاس ان نوجوانوں کو بھیجا' جو گہری نیند کے بعد کی بیداری تھے۔ تو نے مجھے تحفہ میں وہ شہسوار عطا کیا' جو میری قوم کی کمزوری پر غالب آگیا۔ تو نے ہدیہ کے طور پر مجھے وہ ادیب دیا جس نے میری قوم کو بیدار کیا اور وہ نجیب مرحمت فرمایا' جس نے اس کی غیرت قومی کو بھڑکایا۔"

"میں نے تیرے پاس بیج بھیجے اور تو نے انہیں پھول بنا دیا' میں نے تیرے پاس پودے بھیجے اور تو نے انہیں درخت بنا دیا۔ تو وہ اچھوتا باغ ہے' میری پیاری! جو گلاب اور سوسن میں جان ڈالتا ہے سرو اور صنوبر کو بلندی عطا کرتا ہے!"

"مجھے تیری آنکھوں میں غم نظر آ رہا ہے' میرے حبیب! کیا تو میرے پہلو میں ہوتے ہوئے بھی غمگین ہے؟"

"میرے پیارے! کاش! مجھے بھی تیرے ہی جیسا غم مل جاتا اور خوف و ہراس کا کوئی اثر میرے دل پر باقی نہ رہتا!"

"نیل کی بیٹی! کیا تو قوموں کی پیاری ہوتے ہوئے بھی خوف زدہ ہے؟"

"میں اس شیطانی جماعت سے ڈرتی ہوں' جو اپنی مکاریوں کی طلاوت کے ذریعے میرے قریب آ رہی ہے' جو اپنے بازوؤں کی قوت سے میری باگیں سنبھال رہی ہے!"

"اقوام کی زندگی میری پیاری! افراد کی زندگی سے مشابہ ہے—— اس زندگی سے' جسے امید عزیز رکھتی ہے' جس سے خوف قریب تر ہے' جس کے گرد آرزوئیں منڈلاتی ہیں اور جس پر مایوسی نگاہیں جمائے رہتی ہے!"

محب و محبوب ہم آغوش ہو گئے اور بوسوں کے پیالوں میں معطر شراب پینے لگے۔

اسی دوران میں روحوں کا جھلڑ گاتے ہوئے گزرا:

"پاک ہے! پاک ہے! پاک ہے! وہ محبت' جس کی عظمت و بزرگی نے زمین و آسمان کو گھیر رکھا ہے۔"

(ا) سارو فیم۔ ایک فرشتہ کا نام ہے۔ (مترجم)

مادام

اس آدمی پر ترس آتا ہے جو کسی عورت سے پیار کرے' اسے بیوی بنائے' اس کے قدموں میں دل و جان رکھے' ان قدموں پر اپنے بدن کا لہو پسینہ نچوڑے۔ اپنی محنتوں کا ثمر اور جفاکشی کا صلہ اس کے ہاتھ میں دھرے اور پھر جب ہولے ہولے جاگے تو دیکھے کہ جس دل کو اس نے خریدنا چاہا وہ نہایت خلوص اور آزادی سے کسی دوسرے کے حوالے کر دیا گیا ہے تاکہ وہ اس کے سربستہ اسرار اور گہرے پیار سے لطف اندوز ہو۔

اس عورت پر ترس آتا ہے جو اپنی جوانی کی بے قراری اور بے نیازی سے بیدار ہو جائے اور خود کو ایسے گھر میں پائے جو اس پر چمکتے دمکتے سونے اور قیمتی تحائف کی برکھا کرے' احترام و اعزاز' نوازش اور سامان تفریح ارزاں کرے لیکن جنت کی اس شراب سے اس کی روح کو تسکین دینے سے قاصر رہے جسے خدا مرد کی آنکھ سے عورت کے دل پر ٹپکاتا ہے۔

میں بچپن ہی سے رشید بے نعمان کو جانتا ہوں۔ وہ لبنانی تھا۔ بیروت میں پیدا ہوا اور وہیں پل کر بڑا ہوا۔ وہاں کے ایک قدیم متمول خاندان سے تعلق رکھتا تھا جس نے آباؤ اجداد کی شان و شوکت اور روایتیں سنبھال رکھی تھیں۔ اسی لئے رشید ایسے واقعات بیان کرنے کا شوقین تھا جو زیادہ تر اس کے بزرگوں کی امارت سے تعلق رکھتے۔ روزمرہ کی زندگی میں وہ ان عقیدوں اور رسموں ریتوں کی پیروی کرتا جو اس کے زمانے میں مشرق وسطیٰ میں مروج تھیں۔

وہ مخیر اور نیک دل تھا لیکن بیشتر شامیوں کی طرح صرف سطحی چیزوں پر نظر رکھتا' حقیقت پر توجہ نہ دیتا۔ اس نے کبھی دل کی بات نہیں سنی' بس گردوپیش کی آوازوں ہی کا حکم مانا۔ اس نے ان چمکنے دمکنے والی چیزوں سے جی بہلایا جنہوں نے اس کی آنکھوں پر پردے ڈالے اور اس کے دل کو زندگی کے اسرار سے بے خبر رکھا۔ اس کی روح فطرت کے قانون کی سوجھ بوجھ سے ہٹ گئی اور عارضی تسکین ذات پر مائل رہی۔ وہ ان آدمیوں میں سے تھا جو فوراً ہی لوگوں کے سامنے اپنے پیار یا اپنی ناامیدی کا اعتراف کر لیتے ہیں۔ پھر جب اس سے پھر جانے کا وقت نہیں رہتا تو اپنے اضطرار پر اظہار افسوس کرتے ہیں۔ اب معذرت یا جواز کی جگہ شرمساری اور تضحیک سے پالا پڑتا ہے۔

رشید بے نعمان کے کردار کی یہی خصوصیات تھیں جن کی بناء پر اس نے روز ہنی سے اس وقت بیاہ رچایا کہ ابھی سچے پیار کے زیر سایہ ہنی کی روح نے اس کی روح سے وصل نہیں کیا تھا' جنت جس کا حاصل ہوتی ہے۔

چند سال کی غیر حاضری کے بعد میں بیروت لوٹ آیا۔ رشید بے نعمان کو ملنے گیا تو میں نے اسے زرد رو اور مریل پایا۔ اس کے چہرے پر تلخ مایوسی کی پرچھائیں تھیں۔ اس کی یاس انگیز آنکھیں اس کے خستہ دل اور غمناک روح کا افسانہ بیان کر رہی تھیں۔ مجھے اس قابل رحم حالت کا سبب جاننے کا اشتیاق ہوا۔ میں نے بلاتامل اسے اظہار حال

کے لئے کہا۔

میں نے پوچھا' "تمہیں کیا ہوا رشید؟ بچپن سے جس مسکراہٹ اور مسرت انگیز چہرے نے تمہارا ساتھ دیا تھا وہ کہاں ہے؟ کیا تم سے کالی راتوں نے وہ سونا چھین لیا ہے جو تم نے روشن دنوں میں اکٹھا کیا تھا؟ میری خاطر دل کی غمزدگی اور بدنی نقاہت کا سبب بتاؤ!"

اس نے مجھے یاس انگیز انداز سے یوں دیکھا جیسے میں نے اس کے حسین دنوں کی چند ایسی یادیں تازہ کر دی ہوں جو اس کی خلوت سے تعلق رکھتی تھیں۔ اس نے افسردہ اور لرزتی ہوئی آواز میں جواب دیا' "آدمی اپنا دوست گنوا بیٹھے تو گرد و پیش کے متعدد دوسرے دوستوں سے تسکین پا لیتا ہے' سیم و زر کھو بیٹھے تو تھوڑی سی دیر کے لئے فکر مند ہوتا اور پھر دل سے اپنی بد نصیبی کا خیال نکال دیتا ہے خصوصاً" جبکہ وہ تندرست ہو اور ہنوز اپنے اندر ولولہ پائے لیکن جب دل کا چین گنوا بیٹھے تو پھر کہاں سے راحت لائے اور اس کی خانہ پری کرے؟ کون سا ذہن اس صورت حال پر قابو پا سکے گا؟ جب رات دن گزر جائیں اور زندگی کی نرم و نازک انگلیوں کا لمس محسوس کرتے رہو تو تم مسکراؤ گے اور لطف پاؤ گے۔"

قیامت جھٹ آجاتی اور غم لاتی ہے۔ وہ تمہیں بھیانک نگاہوں سے دیکھتی ہے' تیکھی انگلیوں سے تمہارا گلا پکڑتی ہے' تمہیں زمین پر پٹختی ہے اور آہنی جوتوں والے پاؤں سے روند ڈالتی ہے۔ پھر ہنستی ہنستی چلی جاتی ہے' لیکن بعد میں اپنے کئے پر پچھتاتی اور تمہاری نیک بختی سے معافی مانگتی ہے۔ وہ اپنے ریشمی ہاتھ پھیلاتی' امید کے گیت گاتی اور تمہیں رنج و غم بھول جانے کو کہتی ہے۔ اعتماد اور امنگ کے لئے تم میں نیا شوق پیدا کرتی ہے۔ اگر زندگی میں حسین پرندہ لکھا ہے جسے تم شدت سے پیار کرتے ہو تو تم بخوشی اسے اپنے اندر کے دانے چگاؤ گے' دل کو پنجرہ اور روح کو اس کا آشیانہ بناؤ گے لیکن جب بڑے چاؤ سے اس کی تعریف کر رہے اور اسے پیار بھری نظروں سے دیکھ رہے ہوتے ہو تو وہ تمہارے ہاتھوں میں سے اڑ جاتا اور بڑی اونچی اڑان لیتا ہے۔ اس کے بعد نیچے اترتا' دوسرے پنجرے میں چلا جاتا اور کبھی لوٹ کر نہیں آتا۔

ایسے میں تم کیا کر سکتے ہو؟ صبر اور حرف تسکین کہاں پاؤ گے؟ تم اپنی امیدوں اور اپنے خوابوں میں کیونکر جان ڈالو گے؟ کون سی طاقت تمہارے دل بے قرار کو قرار بخشے گی؟"

بھرائی ہوئی آواز اور زخم خوردہ روح سے یہ الفاظ کہنے کے بعد رشید بے نعمان باد شمال اور باد جنوب کے لرزتے لرزتے ہوئے تنکے کی طرح ڈولتے ڈولتے کھڑا ہوا۔ اس نے یوں ہاتھ بڑھایا جیسے خمیدہ انگلیوں سے کچھ پکڑنا اور اسے تباہ کرنا چاہے۔ اس کا جھریالہ چہرہ بے رونق تھا۔ کچھ لمحے نظریں گاڑ کر دیکھا تو اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ایسا لگا کہ اس نے عدم سے وجود میں آنے والا کوئی بھوت دیکھ لیا ہو جو اسے دور لے جانا چاہے۔ پھر اس نے مجھ پر نظریں جما دیں۔ اس کا چہرہ ایک دم بدل گیا۔ اس کی انگلی سراسر کرب اور دل شکستگی کی علامت بن گئی۔ اس نے چلا کر کہا' "یہ عورت افلاس کے پنجوں میں جکڑی تھی۔ میں نے اسے ان سے چھڑایا۔ میں نے اس کے لئے خزانوں کے دروازے کھول دیئے۔ اس کے خوشنما ملبوسات' قیمتی جواہرات اور تند گھوڑوں والی گاڑیاں دیکھ کر عورتیں اس پر رشک کرتیں۔ میں نے اسے دل سے چاہا اس کے قدموں پر محبت کے پھول نچھاور کئے۔ میں اس عورت کا سچا دوست بنا' مخلص ساتھی اور وفا شعار شوہر بنا۔ اس نے مجھے فریب دیا' مجھے چھوڑ کر دوسرے آدمی کے پاس چلی گئی۔ اس کے افلاس میں شریک ہوئی' اس کے ساتھ ایسی گندھی روٹی کھانے لگی جسے بے شرمی سے گوندھا گیا اور جس میں ذلت کے ذرے شامل کئے گئے تھے۔

میں نے اس عورت سے پیار کیا۔ اس حسین پرندے کو کھلایا پلایا' دل کو پنجرہ اور روح کو اس کا آشیانہ بنایا۔ وہ میرے ہاتھوں میں سے اڑ گیا اور دوسرے پنجرے میں چلا گیا ہے۔ وہ پاکیزہ حور جو میری محبت کی جنت میں رہتی تھی اب مجھے بھوت لگتی ہے۔ وہ اپنے گناہ کی سزا بھگتنے اندھیرے میں چلی گئی ہے اور مجھے اپنے جرم کی سزا دینے زمین پر چھوڑ گئی ہے۔"

اس نے یوں ہاتھ سے چہرہ چھپا لیا جیسے خود کو اس سے بچانا چاہے اور لمحے بھر کے لئے چپ ہو گیا۔ پھر اس نے آہ بھری اور کہا' "بس یہی کچھ تمہیں بتا سکتا ہوں۔ براہ کرم مجھ سے اور کچھ مت پوچھنا۔ میری تباہی پر چیخنا چلانا نہیں۔ بس اسے خاموش بد نصیبی بن کر رہنے دو! شائد یہ خاموشی میں پنپ کر مجھے ہلاک کر ڈالے اور میں آخر کار سکون

سے موت کی آغوش میں چلا جاؤں۔"

میں آنکھوں میں آنسو لئے اٹھا' دل میں رحم کا جذبہ تھا۔ میں نے چپکے سے اسے الوداع کہا۔

میرے لفظوں میں اتنی جان نہ تھی کہ اس کے زخمی دل کو تسکین ہوتی' اس کی تاریک زندگی میں روشنی بکھیرنے کے لئے میرے علم میں مشعل نہ تھی۔

(۲)

چند دنوں کے بعد میں پہلی بار مادام روزہنی کو ایک معمولی سے گھر میں ملا جو پھولوں اور پیڑوں میں گھرا ہوا تھا۔ اس نے رشید بے نعمان سے میرا ذکر سنا تھا۔ یہی وہ شخص تھا جس کا دل اس نے پامال کیا' اسے روندا اور زندگی کے خوفناک سموں تلے ڈال کر چھوڑ دیا تھا۔ میں نے اس کی حسین تابدار آنکھوں پر نظر ڈالی اور اس کی پرخلوص آواز سنی۔ میں نے اپنے آپ سے کہا' "کیا یہی گندی عورت ہے؟ کیا یہ نکھرا ستھرا چہرہ بدنما روح اور مجرمانہ دل کو چھپا سکتا ہے؟ کیا یہی بے وفا بیوی ہے؟ کیا یہی وہ عورت ہے میں نے جس کی برائی کی تھی اور جسے میں نے خوبصورت جانور کے بھیس میں سانپ تصور کیا تھا؟"

پھر میں نے اپنے آپ سے کہا' "کیا یہی وہ حسین مکھڑا ہے جس نے رشید بے نعمان کو تباہ حال کیا؟ کیا سنا نہیں کہ ظاہری حسن کتنی ہی پوشیدہ مایوسیوں اور شدید رنج و الم کا سبب بنتا ہے؟ کیا دلفریب چاند جو شاعروں کو مائل بہ تخلیق کرتا ہے خوفناک شور بپا کرتے ہوئے سمندر کے غضب کو پرسکون نہیں کر دیتا؟"

ہم جب بیٹھ گئے تو ایسا لگا جیسے اس نے میرے افکار سن لئے اور پڑھ لئے ہوں اور میرے شبہات کو طول نہ دینا چاہتی ہو۔ اس نے اپنا دل آویز سر ہاتھوں میں رکھا اور ساز سے زیادہ شیریں آواز میں بولی' "میں تم سے کبھی نہیں ملی لیکن میں نے لوگوں کی زبانی تمہارے خیالوں اور خوابوں کی بازگشت سنی ہے۔ انہوں نے مجھے باور کروایا ہے کہ تم رحم دل ہو اور ان عورتوں کے بارے میں فہم رکھتے ہو جو کھنڈر ہوئی ہوں' جن کے پوشیدہ راز تم نے دریافت کئے اور جن کے پیار کو تم جانتے ہو۔ مجھے دل کی ساری باتیں ظاہر کرنے دو تاکہ تم جان سکو کہ روزہنی ہرگز ہرگز بے وفا عورت نہیں نکلی۔

میں بمشکل اٹھارہ سال کی تھی کہ تقدیر مجھے رشید بے نعمان کے پاس لے گئی جو اس وقت چالیس سال کا تھا۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ مجھ پر فریفتہ ہوا اور مجھے بیوی بنا کر اپنے شاندار گھر لے گیا۔ اس نے میری خدمت کے لئے غلام اور کنیزیں رکھ دیں۔ مجھے قیمتی ملبوسات اور جواہرات پہنائے۔ اس نے اپنے دوستوں اور کنبے کے سامنے مجھے نادر و نایاب شے بنا کر پیش کیا۔ جب اس کے ہمعصروں نے مجھے تحسین و حیرت کی نظروں سے دیکھا تو وہ فاتحانہ انداز سے مسکرایا۔ پھر جب خواتین نے میرے بارے میں تعریف اور پیار بھری باتیں کیں تو انہیں سن کر اس نے اپنی ٹھوڑی فخر سے اونچی کی لیکن اس نے سرگوشیاں نہیں سنیں۔ لوگ زیر لب کہتے' "یہ رشید بے نعمان کی بیوی ہے یا لے پالک لڑکی؟"

دوسرا شخص ان الفاظ میں تبصرہ کرتا۔ "اگر اس نے مناسب عمر میں شادی کی ہوتی تو اس کا پہلا بچہ روزہنی سے بھی بڑا ہوتا۔"

ابھی میری زندگی جوانی کی گہری نیند سے بیدار نہیں ہوئی تھی' خدا نے میرے دل کو محبت کی مشعل سے شعلہ افروز نہیں کیا تھا اور میرے پیار کے بیج پروان نہیں چڑھے تھے کہ یہ سب کچھ ہو گزرا۔۔۔۔ جی ہاں' یہ سب کچھ اس زمانے میں ہوا جب میں سمجھتی تھی کہ حقیقی مسرت خوشنما ملبوسات اور عالیشان عمارات سے حاصل ہوتی ہے۔ میں بچپن کے خواب سے بیدار ہوئی تو میں نے محسوس کیا کہ میرے دل میں مقدس آگ کے شعلے بھڑک رہے ہیں اور میری جان کو روحانی بھوک کاٹ رہی ہے اور اس کی وجہ سے روگ لگ رہا ہے۔ جب میں نے آنکھیں کھولیں تو میں نے محبت کے وسیع و عریض آسمان پر اڑنے کے لیے اپنے شہپروں کو دائیں بائیں پھڑپھڑاتے پایا۔ پھر انہیں قانون کی ان زنجیروں تلے کانپتے اور دم توڑتے پایا جس نے ایک آدمی سے مجھے باندھ دیا تھا۔ میں نے ابھی اس قانون کے صحیح معنی نہ جانے تھے۔ میں نے یہ سب باتیں محسوس کیں اور جان لیا کہ عورت کی خوشی نہ تو مرد کی شان و شوکت اور عزت سے حاصل ہوتی ہے اور نہ اس کی سخاوت اور مہر و کرم سے بلکہ یہ تو اس پیار سے حاصل ہوتی ہے جو دونوں کے دلوں اور ان کی لگن کو شیر و شکر کر دے' جسم و جان کو ایک کر دے اور ہونٹوں سے ایک ہی لفظ

ابھرے۔ جب صداقت نے مجھے اپنا چہرہ دکھایا تو میں نے اس چور کی طرح خود کو قانون
کے تحت رشید بے نعمان کے محل میں اسیر پایا جو روٹی چرا رہا اور رات کے مہربان تاریک
گوشوں میں چھپ کر بیٹھا ہو میں جان گئی کہ اس کے ساتھ گزرنے والا ہر لمحہ خوفناک
جھوٹ تھا جو میری پیشانی پر زمین و آسمان کے روبرو آتشیں حروف میں لکھا تھا۔ اس کی
سخاوت اور خلوص کے عوض میں اسے پیار نہیں دے سکی۔ میں نے بیکار اسے چاہنے کی
کوشش کی۔ پیار تو وہ طاقت ہے جو دل کو دل بناتی ہے لیکن ہمارے دل یہ طاقت پیدا
نہیں کر سکے۔ میں رات کی خاموشی میں خدا کے حضور دعاؤں پر دعائیں مانگتی رہی کہ
میرے دل کی گہرائیوں میں ایسی روحانی چاہت پیدا کر دے جو مجھے اس آدمی کے قریب تر
لے جائے جس نے مجھے زندگی بھر کا ساتھی منتخب کیا ہے۔

میری دعائیں قبول نہیں ہوئیں کیونکہ خدا کے حکم سے دل پر پیار کا نزول ہوتا ہے
نہ کہ آدمی کے مطالبے یا استدعا سے۔ میں اس آدمی کے گھر دو سال تک رہی۔ کھیتوں
میں آزادی سے اڑتے پھرتے پرندوں پر رشک کرتی رہی اور میرے دوست میری تکلیف
دہ طلائی زنجیروں کو رشک کی نظر سے دیکھتے رہے۔ میں وہ عورت ہوں جو بچپن ہی سے
پرزہ پرزہ کی گئی تھی' میں رونے والا ایسا دل تھی جسے پیار سے محروم رہ کر جینا پڑے' میں
انسانی قانون کے تشدد کا بے گناہ شکار تھی۔ روحانی پیاس اور بھوک نے مجھے موت کے
پہلو میں لا کھڑا کیا۔

ایک تاریک دن کی بات ہے۔ میں گہرے آسمان کے پیچھے جھانک رہی تھی کہ میں
نے زمانے کی بے پروائی کے مارے ہوئے ایک آدمی کو زندگی کی ڈگر پر چلتے دیکھا۔ اس کی
آنکھوں سے روشنی کی نرم نرم کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور
اپنے آپ سے کہا "اے میری روح! قبر کی تاریکی تیری تقدیر ہے' اس روشنی کی حرص نہ
کر!"

پھر میں نے آسمان کی بلندیوں سے ایک دل آویز نغمہ سنا جس نے اپنی پاکیزگی سے
میرے زخمی دل کو تندرست کر دیا لیکن میں نے کان بند کر لئے اور کہا "اے میری روح!
اتھاہ سمندر کی چیخ تیری تقدیر ہے' آسمانی نغموں کی حرص نہ کر!"
میں نے پھر اپنی آنکھیں اور اپنے کان بند کئے لیکن میری بند آنکھیں ہنوز وہ ملائم
روشنی دیکھ رہی تھیں اور میرے کان ہنوز وہ پاکیزہ صدا سن رہے تھے۔ پہلے تو میں ڈر گئی
اور میں نے اس گداگر کی طرح محسوس کیا' جسے امیر کے محل کے پاس ہیرا ملا ہو اور
مارے خوف کے اسے اٹھا نہ سکا ہو یا افلاس کی وجہ سے اسے چھوڑ گیا ہو۔ میں چیخی۔ یہ
اس پیاسی روح کی چیخ تھی جو درندوں سے گھری ہوئی ندی دیکھے اور زمین پر گر جائے۔ پھر
انتظار کرے اور خوف زدہ ہو کر ندی کو دیکھے۔"

پھر اس نے مجھ سے یوں آنکھیں پھیر لیں جیسے اسے ماضی یاد آ گیا ہو اور اب وہ
شرم کے مارے میرا سامنا نہ کر سکتی ہو تاہم اس نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا'
"وہ لوگ جو حقیقی زندگی کا ذائقہ چکھے بغیر ابدیت کو لوٹ جائیں عورت کے دکھ کا مطلب
سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ پھر اس عورت کا غم کون جانے جو خدا کے حکم سے اپنی روح
اس آدمی پر نچھاور کر دے جسے وہ چاہتی ہو اور اپنا بدن دوسرے کے حوالے کرے جسے وہ
انسانی قانون کے دباؤ تلے رہ کر پیار کرے۔ یہ ایسا المیہ ہے' جسے عورت کے لہو اور
آنسوؤں سے لکھا گیا ہو لیکن آدمی اسے پڑھ کر اس کا مذاق اڑاتا ہو کیونکہ وہ اسے سمجھتا
ہی نہیں۔ پھر اگر وہ سمجھ ہی لے تو اس کا ایک قہقہہ اس فعل کو ملامت اور گالی میں بدل
دے گا اور یہ عورت کے دل پر آگ بن کر جلے گا۔ کالی راتیں یہ ناٹک اس عورت کی
روح کے اسٹیج پر کھیلتی ہیں جس کا بدن شادی کے خدائی قانون کا مطلب سمجھنے سے قبل
ایسے آدمی سے باندھ دیا گیا ہو جسے وہ اپنا شوہر سمجھتی ہو۔ وہ اپنی روح کو اس آدمی کے ارد
گرد منڈلاتے دیکھتی ہو جسے وہ تمام پاکیزہ اور سچے پیار اور خوبصورتی سے سراہتی ہو۔ یہ
کیسا خوفناک عذاب ہے جس کا آغاز عورت میں کمزوری پیدا کرنے اور مرد کو طاقت بخشنے
سے شروع ہوا۔ جب تک کمزور پر طاقت ور کی برتری اور حکمرانی کا دور تمام نہیں ہوتا یہ
دکھ دور نہیں ہو گا۔ یہ آدمی کے بگڑے ہوئے قانون اور مقدس پیار اور دل کے متبرک
مقصد کے درمیان ہولناک جنگ ہے۔ کل تک میں اس محاذ جنگ پر چت پڑی تھی۔ پھر
میں نے اپنی بچی کھچی طاقت جمع کی' اپنی بزدلی کی زنجیریں کھولیں' اپنے بازوؤں سے ناتوانی
کے بندھن کھولے اور محبت اور آزادی کے فراخ آسمان پر اڑ گئی۔"

"آج میں اس آدمی کے پاس ہوں جسے میں پیار کرتی ہوں۔ ہم دونوں خدا کے ہاتھ
سے وہ مشعل لئے اٹھے جو دنیا کے آغاز سے قبل بھی روشن تھی۔ روئے زمین پر ایسی کوئی

طاقت نہیں جو مجھ سے میری مسرت چھین سکے ــــــ یہ مسرت دو روحوں کے وصال سے معرض وجود میں آتی ہے' باہمی سوجھ بوجھ سے پھوٹی ہے اور پیار کی جوت سے روشن ہوئی ہے۔ آسمان اس کی حفاظت پر مامور ہے۔"

اس نے مجھے یوں دیکھا جیسے اس کی نگاہیں میرے دل میں اترنا چاہیں تاکہ مجھ پر اس کی باتوں کا جو اثر ہوا ہو وہ اسے دیکھ لیں اور وہ میرے باطن میں سے اپنی آواز کی بازگشت سن پائے' لیکن میں چپ رہا' وہ بولتی رہی۔ اس کی آواز یادوں کی تلخی' خلوص اور آزادی کی مٹھاس سے لبریز تھی جب اس نے کہا' "لوگ تم سے کہیں گے کہ روزہبی کافر تھی' بے وفا بھی جو اپنی خواہشوں کے پیچھے لگ کر ایسے آدمی کو چھوڑ گئی جس نے اپنی روح میں اسے رفعت بخشی اور اس سے اپنے گھر کو جمال افروز کیا۔ وہ تم سے یہ بھی کہیں گے کہ روزہبی زانیہ ہے' رنڈی ہے جس نے اپنے گندے ہاتھوں سے متبرک شادی کا ہار پامال کیا اور اس کی جگہ ایسے ناپاک وصل کو دی جسے جہنم کے کانٹوں سے آراستہ کیا گیا تھا۔ اس نے نیکی کا لباس اتار پھینکا اور گناہ و ذلت کا چغہ پہن لیا۔ وہ تمہیں اس سے بھی زیادہ بتائیں گے کیونکہ ان کے جسموں میں ابھی تک ان کے آباؤ اجداد کی روحیں بھٹک رہی ہیں۔ وہ پہاڑوں کے متروکہ غاروں کے مانند ہیں جن میں ایسی آوازیں گونجتی ہیں جن کا مطلب سمجھا نہیں جا سکتا۔ وہ نہ تو خدا کے قانون کو سمجھتے ہیں' نہ حقیقی مذہب کے صحیح معنی پا سکتے ہیں اور نہ گناہگار اور بے گناہ میں تمیز کر سکتے ہیں۔ وہ چیزوں کے اسرار و رموز کو جانے بغیر ان کی سطح پر نظر رکھتے ہیں۔ وہ جانے بغیر فتویٰ صادر کرتے ہیں' آنکھیں بند کر کے فیصلہ دیتے ہیں۔ مجرم اور معصوم' نیک اور بد کو مساوی درجہ دیتے ہیں۔ افسوس ان پر جو لوگوں پر مقدمہ چلاتے اور تعزیر لگاتے ہیں.........

جب میں رشید بے نعمان کے گھر میں تھی تو میں خدا کی نظروں میں بے وفا اور زانیہ تھی کیونکہ اس سے قبل کہ محبت اور چاہت کے روحانی قانون کے مطابق آسمان اسے میرا بناتا۔ اس نے مروجہ رسم و رواج اور روایات کے بل بوتے پر عجلت میں مجھے اپنی بیوی بنا لیا۔ جب میں اس کا کھانا کھاتی اور اس کی سخاوت کے عوض اپنا جسم پیش کرتی تو میں اپنے خدا اور اپنی نظروں میں گناہگار رہتی' لیکن اب میں بالکل پاک صاف ہوں کیونکہ محبت کے دستور نے مجھے آزاد کر دیا ہے۔ مجھے باوقار اور باوفا کر دیا ہے۔ میں نے پناہ لینے کے عوض اپنا جسم اور کپڑوں کے عوض اپنے ایام کی فروخت ترک کر دی ہے۔ بے شک' جب لوگ مجھے نہایت باوقار اور باوفا بیوی سمجھتے تھے تب میں زانیہ تھی' ایک مجرم عورت تھی لیکن اپنی نظر میں آج روحانی طور پر میں پاکباز اور قابل احترام ہوں' ویسے لوگوں کے خیال میں ناپاک ہوں کیونکہ وہ تو جسم سے جو عیاں ہوتا ہے اس کے لحاظ سے روحانیت کا اندازہ لگاتے ہیں اور مادی معیار سے روح کو ناپتے تولتے ہیں۔"

اس کے بعد اس نے کھڑکی میں سے باہر جھانکا اور دائیں ہاتھ سے شہر کی جانب یوں اشارہ کیا جیسے اس نے اس کی عالیشان عمارتوں میں فساد کے بھوت اور بے حیائی کا سایہ دیکھ لیا ہو۔ اس نے رحمدلانہ انداز میں کہا' "ان پر شکوہ ایوانوں اور رفیع الشان محلات کو دیکھو جہاں ریاکاری شکوت پذیر ہے۔ ان عمارتوں اور ان کے خوشنما اور چمکیلے در و دیوار میں بساند اور سرانڈ کے علاوہ ساز شوق کے گھروندے ہیں۔ پگھلے ہوئے سونے سے لپی پتی ہوئی چھتوں تلے فریب کے علاوہ جھوٹ کا مسکن ہے۔ ذرا جاہ و جلال والے ان گھروں کو دیکھو تو سہی جو مسرت' رفعت اور فرمان روائی کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان میں بے چارگی اور دل شکستگی کے سوا کچھ نہیں۔ یہ وہ مقبرے ہیں جن پر استرکاری کی گئی ہے اور جہاں ناتواں عورت کی سرمئی آنکھوں اور ارغوانی ہونٹوں کے پیچھے سازشیں چھپی بیٹھی ہیں۔ ان حویلیوں کے گوشے گوشے میں خود غرضی کے ڈیرے ہیں۔ یہاں آدمی کی حیوانیت اس کے سیم و زر کی جھنکار میں حکمرانی کرتی ہے۔"

اگر یہ فلک بوس اور ناقابل تسخیر عمارتیں نفرت' فریب اور تخریب کا احساس کر لیں تو ان میں دراڑیں پڑ جائیں اور یہ ڈھے جائیں۔ غریب گنوار ان محلوں کو نم آلود آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ لیکن جب اسے پتہ چلتا ہے کہ یہاں رہنے والوں کے دل اس پیار کی دولت سے محروم ہیں جو اس کی شریک حیات کے دل میں ہے اور جس سے اس کی کائنات لبریز ہے تو وہ مسکرا پڑتا ہے اور اطمینان سے اپنے کھیتوں کو لوٹ جاتا ہے۔

اس نے میرا ہاتھ تھاما اور مجھے کھڑکی کے پاس لے گئی اور بولی' "آؤ' میں تمہیں ان لوگوں کے راز ہائے سربستہ بتاؤں جن کی ڈگر پر چلنے سے میں نے انکار کیا۔ ان عظیم الشان ستونوں والے ایوان کو دیکھو! یہاں ایک رئیس رہتا ہے جسے باپ کی طرف سے ورثے میں سیم و زر ملا۔ گندی اور گھناؤنی زندگی بسر کرنے کے بعد اس نے ایسی عورت

سے شادی کی جس کے بارے میں وہ صرف اتنا جانتا تھا کہ اس کا باپ سلطان کے عمائدین میں سے تھا۔ جونہی شادی کا مرحلہ طے ہوا وہ مایوس ہوا اور اس نے ان عورتوں سے تعلقات قائم کئے جو چاندی کے چند ٹکڑے لے کر اپنے جسم بیچ دیتی ہیں۔ اس کی بیوی ایوان میں یوں تنہا رہ گئی جیسے کسی شرابی کی چھوڑی ہوئی خالی بوتل۔ وہ زندگی میں پہلی بار چیخی اور رنجیدہ ہوئی۔ پھر اس نے جان لیا کہ اس کے آنسو اس کے بدکار شوہر سے کہیں زیادہ قیمتی ہیں۔ پس اب وہ ایک جوان آدمی پر محبت کے پھول نچھاور کرنے میں منہمک ہے۔ وہ اپنی زندگی کی پر مسرت ساعتیں اس کی نذر کرتی ہے اور اس کے دل میں پر خلوص پیار کا جوہر ٹپکاتی ہے۔

آؤ! اب میں تمہیں اس پر سطوت محل میں لے چلوں جو دلفریب باغات میں گھرا ہوا ہے۔ یہ ایسے شخص کا مسکن ہے جو اس خانوادے کا چشم و چراغ ہے جس نے نسلوں اس ملک پر حکمرانی کی لیکن جس کے اونچے معیار' دولت اور وقار کو پاگل پن سے روپیہ لٹانے اور کاہلی کے سبب سے زوال آیا۔ چند سال پہلے اس شخص نے ایک بدصورت عورت سے اس لئے بیاہ کیا کہ وہ دولت مند تھی۔ جب اس کا مال ہتھیا چکا تو اسے نظر انداز کر کے ایک دلکش جوان عورت سے رغبت کرنے لگا۔ آج اس کی بدنصیب بیوی اپنا وقت بال سنوارنے' ہونٹوں پر سرخی جمانے اور بدن کو خوشبوؤں میں بسانے میں صرف کرتی ہے۔ قیمتی سے قیمتی لباس زیب تن کرتی ہے اور یہی امید رکھتی ہے کہ ایک دن کوئی جوان آدمی اسے دیکھ کر مسکرائے گا اور اس کے پاس آئے گا لیکن یہ سب فضول ہے۔ وہ کبھی اس میں کامیاب نہ ہوگی۔ کامیاب ہوگی تو بس اس حد تک کہ اپنی بدنما ذات کی جانب سے آئینے میں اس کا عکس پائے گی۔

اس بڑی حویلی کو دیکھو جسے ترشے ہوئے سنگ مرمر نے احاطہ کر رکھا ہے۔ یہ ایک ایسی حسین عورت کا گھر ہے جو عجیب و غریب کردار رکھتی ہے۔ جب اس کے پہلے شوہر نے وفات پائی تو اسے اس کی ساری دولت اور جائیداد ملی۔ پھر اس نے ایک کند ذہن اور نحیف و نزار مرد کا انتخاب کیا اور کالی زبان والوں سے بچنے اور اپنی قابل نفرت حرکتوں کے لئے ڈھال بنانے کی غرض سے اس کی بیوی بن گئی۔ اب وہ اپنے قدر دانوں کے درمیان شہد کی مکھی کے مانند ہے جو شیریں ترین اور لذیذ ترین پھولوں کو چوستی ہے۔

اس کے برابر والے مکان کو صوبے کے عظیم ترین معمار نے بنایا تھا۔ یہ ایسے حریص اور بگڑے آدمی کی ملکیت ہے جو اپنا سارا وقت سیم و زر جمع کرنے اور غریبوں کو پامال کرنے میں گزارتا ہے۔ اس کی بیوی کے بدن اور روح کا جمال بہشتی حوروں سے بڑھ کر ہے لیکن وہ بھی کمسنی کی شادی کے عذاب کا شکار ہے۔ اس کے باپ نے یہ جرم کیا کہ لڑکی ابھی سن شعور کو نہ پہنچی تھی کہ اسے مرد کے حوالے کر کے خانہ خراب شادی کا بوجھل طوق اس کے گلے میں ڈال دیا۔ بے چاری مرجھا اور زرد رو ہو کر رہ گئی ہے۔ اور اپنی مجبور و محبوس محبت کے لئے راہ نجات نہیں پاتی۔ دھیرے دھیرے ڈوبتی دھنستی جا رہی ہے' غلامی کا پھندا چھڑانے اور ایسے آدمی سے نجات پانے کے لئے مرنے کا اہتمام کر رہی ہے جو اپنی زندگی سیم و زر بٹورنے اور اس ساعت کو کوسنے میں صرف کر رہا ہے' جب اس نے بانجھ عورت سے بیاہ کیا جو اس کا نام زندہ رکھنے والا اور اس کی دولت کا وارث نہ جن سکی۔

اس مکان میں ایک مثالی شاعر رہتا ہے جو باغات میں گھرا ہے۔ اس نے جاہل عورت سے بیاہ کیا۔ وہ اس کی تخلیقات کا مذاق اڑاتی ہے کیونکہ یہ اس کی فہم سے بالاتر ہیں' اس کے چلن پر ہنستی ہے کیونکہ وہ اس کے ارفع اسلوب حیات سے خود کو ہم آہنگ نہیں کر سکی۔ شاعر نے دوسری بیاہتا عورت سے پیار کر کے مایوسی سے چھٹکارا حاصل کر لیا جو اس کی ذہانت کو سراہتی ہے' اس کے دل میں پیار کی شمع جلا کر اس میں جذبہ تخلیق ابھارتی ہے' اپنی دل آویزی اور خوبصورتی سے اس پر حسین ترین ابدی کلام اتارتی ہے۔"

چند لمحوں کے لئے سکوت چھا گیا۔ مادام ہنی اس انداز سے کھڑکی کے پاس صوفے پر جا بیٹھی جیسے اس کی روح ان ایوانوں میں گھومتے گھومتے اکتا گئی ہو۔ پھر اس نے دھیرے دھیرے سلسلہ کلام جاری کرتے ہوئے کہا' "یہی وہ گھر ہیں جن میں رہنے سے میں نے انکار کیا' یہ وہ مقبرے ہیں جن میں میری روح دفن ہو گئی تھی۔ میں نے جن لوگوں سے نجات حاصل کی وہ بدن کی طرف جاتے تھے اور روح انہیں ٹھکراتی تھی۔ محبت اور حقیقی حسن کے بارے میں کچھ نہ جانتے تھے۔ ان کے اور خدا کے درمیان صرف ایک ثالث تھا اور وہ خدا کا ترس تھا' جو خدائی قانون سے بے خبری کے باعث ان پر آتا۔ میں فیصلہ نہیں کر سکتی کیونکہ میں ان میں سے ایک تھی لیکن صدق دل سے ان سے ہمدردی کرتی

ہوں۔ مجھے ان سے نفرت نہیں۔ مجھے تو ناتوانی اور جھوٹ کی اطاعت کرنے پر ان سے نفرت ہے۔ یہ سب کچھ اس لئے کہا ہے تاکہ تم پر ان لوگوں کی اصلیت ظاہر کر دوں جن سے میں ان کی مرضی کے خلاف بھاگ کر آئی ہوں۔ میں تم پر ان لوگوں کی زندگی کی حقیقت واضح کرنا چاہتی تھی جو میرے خلاف زہر اگلتے رہتے ہیں کیونکہ میں ان کی دوستی ترک کر چکی اور آخرکار اپنے آپ کو پا چکی ہوں۔ میں ان کی اندھیری کوٹھڑی میں سے نکل آئی ہوں اور میں نے اپنی نظریں اس روشنی کی سمت کر لی ہیں جہاں خلوص' صداقت اور انصاف کی حکمرانی ہے۔ میں خوش ہوں کہ انہوں نے مجھے اپنے حلقے سے خارج کر دیا ہے۔ انسانیت صرف اسے جلا وطن کرتی ہے جس کی روح مطلق العنانی اور ظلم کے خلاف بغاوت کرتی ہے۔ جو غلامی پر ترک وطن کو ترجیح نہیں دیتا وہ آزادی' صداقت اور فرض کے کسی پیمانے سے بھی آزاد کہلانے کا مستحق نہیں۔

کل تک میں ایسا طباق تھی جس پر ہر قسم کے لذیذ کھانے چنے تھے اور رشید بے نعمان اس وقت تک میرے پاس نہیں پھٹکتا تھا جب تک اسے کھانے کی اشتہا نہ ہوتی۔ ہماری روحیں دو عاجز مگر ذیشان خدام کی طرح ہم سے دور دور رہیں۔ میں نے اس سے صلح و آشتی کی کوشش کی جسے لوگ بدقسمتی کہتے ہیں۔ لیکن میری روح نے زندگی بھر میرے ساتھ اس ہولناک بت کے سامنے جھکے رہنے سے انکار کیا جسے ازمنہ وسطیٰ کے تاریک زمانے میں تراشا گیا تھا اور جس کا نام قانون رکھ دیا تھا۔ میں زنجیریں پہنے رہی تاآنکہ میں نے محبت کو اپنی طرف آتے سنا اور اپنی روح کو پرواز کی تیاری کرتے دیکھا۔ پھر میں نے زنجیریں توڑ دیں' اس پرندے کی طرح رشید بے نعمان کا محل چھوڑ دیا جسے آہنی پنجرے سے رہائی ملی ہو۔ میں اپنے پیچھے جواہرات' ملبوسات اور غلام چھوڑ آئی۔ میں اپنے محبوب کے ہمراہ رہنے آگئی کیونکہ جانتی تھی کہ جو کچھ کر رہی ہوں دیانتداری سے کر رہی ہوں۔ فلک نہیں چاہتا کہ میں آنسو بہاؤں اور رنج سہوں۔ بارہا رات کو میں نے صبح کے طلوع ہونے کی دعا مانگی اور جب دن چڑھا تو میں نے اس کے ختم ہونے کی دعا مانگی۔ میرا خدا نہیں چاہتا کہ میں بیچارگی کی زندگی بسر کروں کیونکہ اس نے میرے دل کی گہرائیوں میں محبت کی آرزو رکھ دی ہے۔ اس کی شان میری دلی مسرت سے ہے۔

یہ داستان میری ہے اور یہی زمین و آسمان کے روبرو میری صدائے احتجاج ہے۔ میں پیار کے گیت گاتی ہوں' اسی کو دہراتی ہوں جبکہ لوگ اس ڈر سے کان بند کر لیتے ہیں کہ کہیں مجھے سن نہ پائیں اور ان کی روح بغاوت پر نہ اتر آئے اور پھر ان کے کانپتے لرزتے ہوئے معاشرے کی بنیادیں نہ اکھڑ جائیں۔

یہ ناہموار راستہ ہے جسے میں نے تراشا اور میں مسرت کی چوٹی پر پہنچ گئی۔ اب اگر موت مجھے لینے آئے تو میں خوف اور شرم کے بغیر خوشی خوشی رفیع الشان تاجدار آسمانی کے حضور خود کو پیش کر دوں گی۔ میں یوم حساب کے لئے بالکل تیار ہوں۔ میرا دل صاف ہے' سفید برف کی مانند۔ میں نے اپنے ہر عمل میں حکم ربی تسلیم کیا اور آسمانی فرشتوں کی آواز پر کان دھر کر اپنے دل کے اذن پر چلتی رہی۔ یہ میری زندگی کا ناٹک ہے جسے بیروت کے لوگ "لب حیات پر ثبت کی ہوئی لعنت" اور "معاشرے کے جسم میں چھپی ہوئی بیماری" کہتے ہیں۔ ایک دن محبت ان کے دلوں کو سورج کی کرنوں کی طرح عیاں کرے گی جو گلی سڑی زمین میں سے بھی پھول اگاتی ہیں۔ ایک دن راہ گیر میری قبر کے پاس آکر رکیں گے اور اس مٹی کا خیر مقدم کریں گے جو میرے جسم کو ملفوف کئے ہوگی' وہ کہیں گے' "یہاں روز ہنی استراحت کر رہی ہے جس نے محبت کے پاکیزہ خدائی قانون پر چلنے کی غرض سے خود کو بوسیدہ انسانی قوانین سے رہا کیا۔ اس نے اپنا چہرہ سورج کی جانب کر لیا تاکہ اپنے بدن کے سائے کو کھوپڑیوں اور کانٹوں میں نہ دیکھ سکے۔"

دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ایک آدمی داخل ہوا۔ اس کی آنکھیں سحر انگیز کرنوں سے چمک رہی تھیں اور اس کے ہونٹوں سے بھرپور مسکراہٹ عیاں تھی۔ مادام ہنی کھڑی ہوئی۔ اس نے نوجوان کا بازو تھاما' مجھ سے اس کا تعارف کروایا اور تعریفی کلمات کے ساتھ اس کے سامنے میرا نام لیا۔ میں جان گیا کہ یہی وہ ہستی ہے جس کی خاطر اس نے ساری دنیا کو ٹھکرا دیا اور زمین کے قوانین و روایات سے بغاوت کی۔

ہم بیٹھ گئے۔ خاموشی چھا گئی۔ ہم میں سے ہر ایک گہری سوچ کی لپیٹ میں آگیا۔ خاموشی و احترام کے چند لمحے گزرے تو میں نے جوڑے کو ایک دوسرے کے پہلو میں بیٹھے دیکھا۔ میں نے کچھ ایسی چیز دیکھی جو اس سے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ میں فوراً ہی مادام ہنی کی کہانی کا مفہوم پا گیا۔ میں نے معاشرے کے خلاف اس کے احتجاج کا راز جان لیا جو بغاوت کے سبب کا تعین کرنے سے پہلے ان باغیوں کو سزا دیتا ہے جو رسم و رواج اور

قوانین کے خلاف بغاوت کرتے ہیں۔ میں نے اپنے سامنے آسمانی روح کو دیکھا جو دو حسین اور متحد انسانوں پر مشتمل تھی۔ درمیان میں محبت کا دیوتا انھیں کالی زبان والوں سے بچانے کے لئے اپنے شہپر پھیلائے کھڑا تھا۔ میں نے دونوں مسکراتے ہوئے چہروں میں سے کامل طور پر ایک سوچ کو عیاں ہوتے دیکھا۔ یہ چہرے خلوص سے تاباں اور خیر میں گھرے ہوئے تھے۔ میں نے زندگی میں پہلی بار مرد اور عورت کے درمیان مسرت کی پرچھائیں دیکھی جسے مذہب نے ملعون قرار دیا اور قانون نے جس کی مخالفت کی۔ میں کھڑا ہوا۔ انھیں الوداع کہا اور اس غریبانہ گھروندے سے رخصت ہوا۔ جسے پیار نے خلوص اور فہم و دانش کے دیوتا کی قربان گاہ کے طور پر استوار کیا تھا۔ میں ان ایوانوں کے پاس سے گزرا جن کی طرف مادام ہنی نے اشارہ کیا تھا۔ جب میں ان کے آخری سرے پر پہنچا تو مجھے رشید بے نعمان یاد آیا۔ میں نے اپنے آپ سے کہا "وہ پامال ہوا ہے۔ اگر اس نے کبھی مادام ہنی کے بارے میں شکوہ کیا تو کیا آسمان کبھی اس کی شنوائی کرے گا؟ کیا اس عورت نے اسے چھوڑ کر اور اپنی دلی آزادی کی راہ پر چل کر کوئی غلطی کی ہے؟ یا پھر اس شخص نے محبت کے ذریعے اس کے دل پر قابو پانے سے پہلے اس کے جسم کو زیر کر کے کسی جرم کا ارتکاب کیا ہے؟ دونوں میں کون ظالم ہے اور کون مظلوم؟ کون مجرم ہے اور کون معصوم؟"

چند لمحوں کی گہری سوچ کے بعد میں دوبارہ اپنے آپ سے باتیں کرنے لگا۔ "بارہا عورت نے دھوکا کھایا اور دولت کی حرص میں اپنے شوہر کو چھوڑا کیونکہ سیم و زر اور خوشنما ملبوسات کے پیار نے اس کی آنکھیں اندھی کر دیں اور اسے بے حیائی تک پہنچا دیا۔ مادام ہنی اپنے مالدار شوہر کا محل چھوڑ کر مفلس کے جھونپڑے میں چلی گئی تو کیا وہ گرفتار فریب ہوئی تھی؟ بارہا لاعلمی عورت کے وقار کو ہلاک اور اس کی خواہش کو زندہ کر دیتی ہے۔ وہ اکتا جاتی ہے اور اپنی خواہشوں کی تحریک پر اپنے شوہر کو چھوڑ دیتی اور ایسے آدمی کا پیچھا کرتی ہے جس کے سامنے وہ سرنگوں ہو جاتی ہے۔ کیا مادام ہنی ایک انجان عورت تھی جس نے جسمانی خواہشوں کو لبیک کہا' سب کے سامنے اپنی آزادی کا اعلان کیا اور اپنے محبوب نوجوان سے جا ملی؟ وہ اپنے شوہر کے گھر میں رہ کر بھی رازداری سے اپنی تسلی کر سکتی تھی کیونکہ کتنے ہی لوگ اس کے حسن کا غلام بننے اور اس کے پیار کی خاطر جام شہادت نوش کرنے کے لئے تیار تھے۔ مادام ہنی ستم رسیدہ عورت تھی۔ اسے صرف مسرت کی جستجو تھی جسے اس نے پالیا اور گلے سے لگالیا۔ "یہی اصل صداقت ہے معاشرہ جس کا احترام نہیں کرتا۔"

پھر میں نے خلاء میں سرگوشی کی اور اپنے آپ سے سوال کیا' "کیا کسی عورت کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ اپنے شوہر کی تباہی و بربادی کے عوض اپنی خوشی خریدے؟"

میری روح نے لقمہ دیا' "کیا کسی مرد کے لئے جائز ہے کہ اپنی بیوی کی محبت کو اسیر بنائے جبکہ وہ سمجھتا ہو کہ وہ کبھی اسے پا نہ سکے گا؟"

میں چلتا گیا' مادام ہنی کی آواز ہنوز میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔ اسی عالم میں میں شہر کے آخری سرے پر پہنچ گیا۔ سورج چھپ رہا تھا۔ کھیتوں اور گیاہ زاروں پر خاموشی کا راج تھا۔ پرندے شام کی عبادت کے گیت گانے لگے تھے۔ میں وہاں کھڑے کھڑے سوچ میں پڑ گیا۔ پھر میں نے آہ بھری اور کہا' "پیڑ خدائے آزادی کے تخت کے روبرو کھنڈری معطر ہوا سے مسرور اور آفتاب و ماہتاب کی شعاعوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ پرندے آزادی کے دیوتا کے کانوں میں چپکے چپکے باتیں کرتے اور اس کے گرد ندیوں کے سازینے کی سنگت میں پھڑپھڑاتے پھرتے ہیں۔ یہ پھول آسمان آزادی پر اپنی خوشبوئیں اڑاتے ہیں۔ جب صبح طلوع ہوتی ہے تو وہ خداوندِ آزادی کے سامنے مسکراتے ہیں۔

روئے زمین پر ہر شے قانون فطرت کے مطابق رہتی ہے۔ اس قانون سے آزادی کی شان و شوکت اور مسرت پھوٹتی ہے لیکن آدمی اس خوش بختی سے محروم ہے کیونکہ وہ خدا کی عطا کردہ روح کی جگہ اپنا محدود اور ارضی قانون نافذ کرتا ہے۔ اس نے اپنے لئے قوانین تراشے' اپنے لئے تنگ اور اذیت بخش قید خانہ تعمیر کیا اور اسے اپنی خواہشوں اور پیار کا خلوت کدہ بنالیا۔ اس نے گہری قبر کھودی اور اس میں اپنا دل اور اس کے مفہوم کو دفن کر دیا۔ اگر کوئی فرد اپنے دل کی ہدایت پر معاشرے سے پیچھے ہٹ جاتا اور قانون شکنی کرتا ہے تو اس کے ہم جنس اسے ایسا باغی قرار دیتے ہیں جو جلا وطنی کے لائق ہو یا پھر بدنام انسان کہتے ہیں جو سزا کا مستحق ہو۔ کیا آدمی دنیا کے خاتمے تک اپنے قید خانے کا غلام بنا رہے؟ یا وہ وقت گزرنے پر آزادی حاصل کر لے اور روح کی خاطر روح کے اندر رہے؟ کیا آدمی زمین کے نیچے یا پیچھے ہی دیکھنے پر مصر رہے؟ یا وہ سورج کی جانب نظریں کرے تاکہ کھوپڑیوں اور کانٹوں کے درمیان اپنے بدن کا سایہ نہ دیکھ پائے۔

شاعر اعظم

۱

(جلبک: سنہ [illegible] ق۔م)

بادشاہ تخت زر نگار پر جلوہ افروز تھا۔ جس کے چاروں طرف شمعیں اور عود و لوبان کی انگیٹھیاں روشن تھیں۔ دائیں بائیں درباری امیر اور مذہبی پیشوا بیٹھے تھے۔ اور سامنے غلام اور سپاہی اس طرح کھڑے تھے' جیسے سورج کے سامنے مجسمے!

تھوڑی دیر کے بعد' جب مطربوں کے نغمے ختم ہو کر رات کے سیاہ لباس کی تہوں میں گم ہو گئے' تو وزیر اعظم اٹھا اور بادشاہ کے سامنے دست بستہ کھڑے ہو کر' بڑھاپے کی ناتواں آواز میں رک رک کر کہنے لگا۔

"جہاں پناہ! ہندوستان کا ایک عجیب و غریب فلسفی کل شہر میں وارد ہوا ہے' اس کی تعلیمات ایسی انوکھی ہیں کہ آج تک سننے میں نہیں آئیں۔ اس کا عقیدہ ہے کہ روح ایک جسم سے دوسرے جسم میں اور انسان ایک صدی سے دوسری صدی میں منتقل ہوتا رہتا ہے' یہاں تک کہ وہ درجہ کمال کو پہنچ کر' دیوتاؤں کی صف میں شامل ہو جاتا ہے۔ اپنے اسی مذہب کی تبلیغ کے لئے وہ یہاں آیا ہے اور چاہتا ہے کہ آج کی رات شرف باریابی حاصل کر کے حضور کے سامنے اپنے عقائد کی وضاحت کرے!"

بادشاہ نے سر ہلایا اور مسکرا کر کہا:

"ہندوستان سے ایسی ہی نرالی چیزیں آتی ہیں۔ اچھا! اسے حاضر کرو!! ما بدولت اس کے دلائل سننا چاہتے ہیں۔"

اسی لمحہ ایک ادھیڑ عمر کا انسان' دربار میں حاضر کیا گیا' جس کا رنگ گندمی' چہرا پروقار' آنکھیں بڑی بڑی' اور شگفتہ خدوخال' زبان بے زبانی میں گہرے رازوں اور انوکھی رغبتوں کے ترجمان تھے۔ آداب بجا لانے کے بعد' اجازت پا کر' اس نے اپنا سر اٹھایا' اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی اور وہ اپنے نئے عقیدہ کا اظہار کرنے لگا۔ اس نے بتایا کہ روح اپنے اختیار کردہ درمیانی واسطوں اور حاصل کردہ تجربات کی تاثیرات کے ذریعہ درجہ بدرجہ ترقی کرتے ہوئے' رفعت و قوت عطا کرنے والی عظمتوں کے ساتھ جھومتے ہوئے اور سعادت و شقاوت سے ہمکنار کرنے والی محبت کے ساتھ نشوونما پاتے ہوئے کس طرح ایک جسم سے دوسرے جسم میں منتقل ہوتی ہے۔ پھر اس نے بیان کیا کہ انسان' کمالیاتی ضرورتوں کی ٹوہ لگاتے ہوئے' دور موجود میں عہد ماضی کے گناہوں کا کفارہ ادا کرتے ہوئے' اور ایک جون کی بوئی ہوئی کھیتی دوسری جون میں کاٹتے ہوئے' کس طرح نقل مکان کرتا ہے۔

جب تقریر نے طول کھینچا اور بادشاہ کے چہرے پر بے چینی اور تکان کی علامات ظاہر ہونے لگیں تو وزیر اعظم نووارد فلسفی کے قریب آیا اور اس کے کان میں چپکے سے کہا:

"بس! بحث کو اب کسی اور فرصت کے لئے اٹھا رکھو!!"

فلسفی الٹے پاؤں لوٹا اور مذہبی پیشواؤں کی صف میں بیٹھ گیا' اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں' گویا ہستی کے رموز و اسرار کو غور سے دیکھتے دیکھتے تھک گیا ہے۔

تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد' جو پیغمبرانہ سکر و بے خبری سے مشابہ تھی بادشاہ نے دائیں بائیں دیکھ کر پوچھا:

"ہمارا شاعر کہاں ہے؟ ہم نے اسے مدت سے نہیں دیکھا۔ اس پر کیا بیتی؟ وہ تو ہر رات ہماری مجلس میں حاضر رہتا تھا۔"

ایک پادری نے عرض کی۔

"ایک ہفتہ گزرا' میں نے اسے ہیکل عشروت کے آستانے پر بیٹھے دیکھا تھا' وہ اپنی جامد اور غمزدہ نگاہوں سے دور' شفق کو دیکھ رہا تھا' گویا اس کا کوئی قصیدہ بادلوں میں گم ہو گیا ہے!"

ایک درباری بولا:

"کل میں نے اسے بید اور سرو کے درختوں میں بیٹھے دیکھا تھا' میں نے سلام کیا' لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا اور بدستور اپنے افکار و خیالات کے سمندر میں غرق رہا۔"

خواجہ سراؤں کے داروغہ نے کہا:

"آج وہ مجھے محل کے باغیچہ میں نظر آیا تھا۔ میں اس کے قریب گئی تو دیکھا رنگت پیلی پڑ گئی ہے' چہرہ غم و ملال کی تصویر بنا ہوا ہے' پلکوں پر آنسو مچل رہے ہیں اور سانس گھٹ گھٹ کر آ رہا ہے!"

افسوسناک لہجہ میں بادشاہ نے حکم دیا۔

"جاؤ اسے فوراً تلاش کر کے لاؤ!! ما بدولت کی طبع مبارک اس کے لئے بے چین ہے۔"

غلام اور سپاہی شاعر کی تلاش میں چلے گئے اور بادشاہ سمیت سارا دربار خاموش' حیران اور منتظر بیٹھا رہا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ سب کمرہ کے وسط میں کھڑے ہوئے ایک غیر مرئی سائے کا وجود محسوس کر رہے ہیں۔

تھوڑی دیر کے بعد خواجہ سراؤں کا داروغہ آیا اور بادشاہ کے قدموں پر گر پڑا اس پرندہ کی طرح' جسے صیاد کے تیر نے گرا لیا ہو۔ بادشاہ بے اختیار چلایا:

"کیا بات ہے؟------- کیا ہوا؟"

حبشی نے سر اٹھایا اور لرزتے ہوئے کہنے لگا:

"شاعر محل کے باغیچہ میں مردہ پڑا ہے!"

بادشاہ ایک دم کھڑا ہو گیا' اس کا چہرہ رنج و غم سے مرجھا گیا' وہ آہستہ آہستہ باغ کی طرف چلا' اس طرح کہ آگے آگے غلاموں کے ہاتھوں میں شمعیں تھیں اور پیچھے پیچھے درباری اور پادری' باغ کے احاطہ کے پاس' جہاں بادام اور انار کے درخت ہیں' شمعوں کی زرد شعاعوں کی روشنی میں ایک بے جان جسم دکھائی دیا' جو گلاب کی سوکھی ہوئی ٹہنی کی طرح گھاس میں پڑا تھا۔

ایک درباری نے کہا:

"دیکھنا ستار کو کس طرح گلے لگا رکھا ہے۔ گویا وہ ایک حسین دوشیزہ ہے' جس سے اسے محبت تھی اور جو اس سے محبت کرتی تھی اور اسی محبت کی بنا پر انہوں نے عہد کر لیا تھا کہ ہم دونوں ساتھ مریں گے۔"

ایک سپہ سالار بولا:

"حسب عادت اب بھی فضا کی گہرائیوں کو غور سے دیکھ رہا ہے' گویا ستاروں میں جیسے انجان خدا کی پرچھائیں نظر آ رہی ہے۔"

کاہن اعظم نے بادشاہ سے مخاطب ہوتے ہوئے عرض کی:

"کل ہم اسے مقدس عشتوت کے ہیکل کے سائے میں دفن کریں گے۔ شہر کا ہر چھوٹا بڑا اس کی میت کے ساتھ ہوگا' نوجوان اس کے قصیدے گائیں گے اور نوخیز لڑکیاں اس کے تابوت پر پھول برسائیں گی۔ چونکہ یہ ہمارے ملک کا سب سے بڑا شاعر تھا اس لئے اس کی تدفین کا جلوس بھی شاندار ہونا چاہئے!"

بادشاہ نے شاعر کے چہرے سے نگاہیں ہٹائے بغیر' جس پر موت کی نقاب پڑی تھی' سر ہلایا اور آہستہ آہستہ کہنے لگا:

"نہیں! جب یہ زندہ تھا اور ملک کے گوشہ گوشہ کو اپنی روح کی تابشوں سے منور اور فضا کے ذرہ ذرہ کو اپنے سانس کی عطر بیزیوں سے معطر کر رہا تھا' ہم نے اسے فراموش کر دیا۔ اس لئے اگر ہم اب مرنے کے بعد' اس کی عزت کریں گے تو دیوتا ہمارا مذاق اڑائیں گے اور وادیوں اور سبزہ زاروں کی پریاں ہم پر ہنسیں گی۔ بہتر یہی ہے کہ اسے یہیں دفن کرو' جہاں اس کی روح اس کے جسم سے علیحدہ ہوئی ہے' اس کے ستار کو اس کے جسم سے چمٹا رہنے دو! اگر تم میں سے کوئی اس کی عزت کرنی چاہتا ہے تو وہ گھر جائے اور اپنے اہل و عیال کو بتائے کہ بادشاہ نے اپنے شاعر سے بے اعتنائی برتی اور وہ تنہائی و غم کے عالم میں مر گیا۔"

اس کے بعد اس نے چاروں طرف دیکھ کر پوچھا:

"ہندی فیلسوف کہاں ہے؟"

فلسفی آگے بڑھا اور کہا:

"جہاں پناہ! حاضر ہوں!"

بادشاہ نے پوچھا:

"بتا! اے حکیم! کیا دیوتا مجھے ایک بادشاہ اور اسے ایک شاعر کی حیثیت سے پھر اس دنیا میں بھیجیں گے؟ کیا میری روح کسی شہنشاہ ہفت اقلیم کے ولی عہد اور اس کی روح ایک بڑے شاعر کا قالب اختیار کرے گی؟ کیا قانون فطرت اسے دوبارہ تجلیات الٰہی کی جلوہ

گاہ میں حاضر کرے گا؟ تاکہ یہ زندگی کو شعر کا جامہ پہنائے! اور کیا ابدی ناموس مجھے پھر اس جہان آب و گل میں پہنچے گا؟ تاکہ میں اس پر اپنے انعام و اکرام کی بارش اور اس کے دل کو اپنی بخشش و عطا سے خوش کروں!"

فلسفی نے جواب دیا:

"روح جو کچھ چاہتی ہے' اسے ملتا ہے۔ وہ ناموس جو موسم سرما کے خاتمہ پر بہار کی عشرت فروشیوں کو لوٹاتا ہے' ضرور آپ کو باجبروت شہنشاہ اور اسے شاعر اعظم بنا کر اس دنیا میں واپس بھیجے گا۔"

بادشاہ کا چہرہ کھل اٹھا' اس کی روح میں ایک تازگی ——— ایک شادابی' کروٹیں لینے لگی' اور وہ اپنے محل کی طرف روانہ ہو گیا' اس کا دماغ' ہندی فیلسوف کے اقوال پر غور کر رہا تھا اور اس کا دل اس کے ان الفاظ کو دہرا رہا تھا۔

"روح جو کچھ چاہتی ہے' اسے ملتا ہے!"

———○———

۲

(قاہرہ ——— مصر ——— ۱۹۱۲ء)

چاند طلوع ہوا اور اپنی سیمیں چادر شہر پر ڈال دی۔ اس وقت والئی سلطنت اپنے محل کے دریچہ میں بیٹھا' صاف ستھری فضا کو دیکھ رہا تھا' ان قوموں کے آغاز و انجام پر غور کر رہا تھا' جو یکے بعد دیگرے نیل کے کنارے سے گزریں' ان بادشاہوں اور فاتحوں کے اعمال کا جائزہ لے رہا تھا' جو ابو الہول کے دبدبہ و جلال کے سامنے ٹھٹک کر کھڑے ہو گئے اور اپنے تصور میں ان قبیلوں اور نسلوں کے جلوس عظمت کا تماشہ دیکھ رہا تھا۔ جنہیں زمانہ نے اہرام مصر کے اطراف سے نکال کر قصر عابدین میں پہنچایا۔

جب اس کے افکار کا دائرہ وسیع ہوا' اور اس کے خیالات کی نزہت گاہوں میں کشادگی پیدا ہو گئی تو وہ اپنے ندیم کی طرف متوجہ ہوا' جو اس کے قریب بیٹھا تھا اور کہا:

"آج کی رات مابدولت کی خاطر عاطر' شعر و سخن کی طرف مائل ہے اس لئے کچھ سناؤ!"

ندیم نے تعمیل حکم کے لئے سر جھکایا اور عہد جاہلیت کے کسی شاعر کا قصیدہ مترنم آواز میں پڑھنا شروع کیا۔

"کسی جدید شاعر کا کلام!" بادشاہ نے اسے روک دیا۔

ندیم نے دوبارہ سر جھکایا اور ایک مخضرمی شاعر کا کلام سنانے لگا۔

"جدید ترین دور کا! جدید ترین دور کا!!" بادشاہ نے پھر روکا۔ ندیم نے تیسری بار پھر سر جھکایا اور موشح اندلسی کے اشعار پڑھنے لگا۔

"کسی ہم عصر شاعر کا قصیدہ سناؤ!" بادشاہ نے حکم دیا۔

ندیم نے اپنی پیشانی پکڑی' گویا شعرائے عصر کے تمام کارناموں کو اپنے حافظہ میں تازہ کر رہا ہے۔ یکایک اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی' چہرہ پر خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی اور وہ زمانہ حاضر کے ایک بہت بڑے شاعر کے اشعار ترنم سے پڑھنے لگا' جن میں خیال کی گہرائی' آہنگ کا طلسم' معانی کی باریکی اور اچھوتا پن اور وہ لطیف و نادر کنائے تھے' جو ذہن میں سما کر اسے روشن کر دیتے اور دل کے گرد محیط ہو کر اسے شدت جذبات سے پگھلا دیتے ہیں۔

بادشاہ نے ندیم کو غور سے دیکھا۔ اشعار کی معنویت اور خوش آہنگی نے اسے بے قابو کر دیا تھا اور وہ ایک ایسے مخفی ہاتھ کا وجود محسوس کر رہا تھا' جو اسے ایک اور ہی عالم ——— دور دراز عالم ——— کی طرف کھینچ رہے تھے۔ اس نے پوچھا:

"یہ اشعار کس کے ہیں؟"

"بعلبکی شاعر کے!" ندیم نے جواب دیا۔

"بعلبکی شاعر!"

بعلبکی شاعر ——— دو عجیب و غریب کلمے تھے' جو بادشاہ کے کانوں میں گونجے اور اس کے شفاف ذہن میں ان خواہشوں کی پرچھائیاں چھوڑ گئے جو اپنی وضاحت کی بنا پر مبہم اور اپنی باریکیوں کی بنا پر جان دار تھیں۔

طلسمی شاعر۔۔۔۔ ایک نیا پرانا نام' جس نے بادشاہ کے دماغ میں بھولے ہوئے دنوں کے نقوش تازہ کر دیئے' اس کے سینے کی گہرائیوں میں سوئی ہوئی یاد کی پرچھائیوں کو نمایاں کر دیا اور ان خطوط میں' جو بادلوں کے کنارے سے مشابہ تھے' اس نوجوان کی تصویر اس کی آنکھوں کے سامنے کھینچ دی' جو ستار کو اپنے گلے سے لگائے مردہ پڑا تھا اور اس کے چاروں طرف سپہ سالاران افواج' پیشوایان مذہب اور امرائے سلطنت کھڑے تھے۔

یہ منظر بادشاہ کی آنکھوں کے سامنے سے چھپ گیا' جس طرح خواب' طلوع سحر کے وقت روپوش ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور اپنے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ کر ٹہلنے لگا۔ وہ بار بار پیغمبرؐ اسلام کی یہ آیت دہرا رہا تھا:

"تم مردہ تھے' اس نے تمہیں زندہ کیا۔ اب وہ تمہیں مارے گا' پھر جلائے گا اور تم آخر کار اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔"(۱)

اس کے بعد بادشاہ نے ندیم کی طرف متوجہ ہو کر کہا:

"ہمارے ملک میں طلسمی شاعر کا وجود' ہماری خوشی کا سبب ہوا' ہم اس کے پاس جا کر اس کی عزت افزائی کریں گے۔"

ایک منٹ کے بعد دھیمی ہوئی آواز میں اس نے پھر کہا۔

"شاعر ایک انوکھا پرندہ ہے' جو عالم قدس کے سبزہ زاروں سے اڑ کر چہچہاتا ہوا اس دنیا میں آتا ہے۔ اس لئے اگر ہم نے اس کی عزت نہ کی تو وہ پر تولے گا اور پھر اپنے وطن چلا جائے گا۔"

رات گزر گئی۔ فضا نے اپنا وہ لباس اتار دیا جس میں ستارے ٹکے ہوئے تھے اور صبح کی شعاعوں سے بنی ہوئی قمیض پہن لی۔ لیکن بادشاہ کا ذہن اب بھی ہستی کی نیرنگیوں اور زندگی کے اسرار و رموز میں سرگرداں تھا۔

---

(۱) اس آیت کو مسئلہ تناسخ کی تائید میں پیش کرنا فکر و نظر کی گمراہی ہے۔ (مترجم)

تلاش ناکام

شب کے سناٹے میں جب دیوار پر سائے متحرک ہو جاتے ہیں جیسے جنات ہیولانی چل پھر رہے ہوں اور شیشم کے درخت ہم آواز ہو کر چیخنا شروع کر دیتے ہیں۔

زرد چاند اک کفن میں لپٹی ہوئی نعش کی طرح نظر آتا ہے اور ستارے پردہ سحاب ہٹا کر مغموم انداز سے جھانکتے ہیں۔

تو میری روح عالم خیال کے راستوں پر پرواز کرنے کو بے قرار ہو جاتی ہے اور غیر مرئی وادیوں میں تمہاری تلاش کرتی پھرتی ہے۔

پر آہ! تم اسے وہاں نظر نہیں آتیں نہ ہی کوئی نشان خاک پا ملتا ہے جس سے تمہارے قیام کا کچھ اندازہ ہو سکے۔

آہ! میری روح!! ملول و ناکام!!! بھٹکتی ہوئی واپس آجاتی ہے

پھر! جب خواب کی حسین ملکہ مجھے اپنے لبادے میں چھپا لیتی ہے تاکہ کشاکش حیات کو کچھ دیر کے لئے بھول جاؤں اور اس کی تلخیوں کو فراموش کر سکوں۔

لیکن آہ! میری شوریدہ بختی!! کہ مایوس تمنا روح کو تو اب بھی قرار نہیں۔ وہ تمہاری جستجو میں فضاؤں میں چکر کاٹتی ہے اس غریب الوطن پرند کی طرح! جس کا کہیں مسکن ہو نہ ٹھکانا۔

وہ ایک ایک کنج میں ڈھونڈتی پھرتی ہے۔ پر آہ! تم تو کہیں بھی نظر نہیں آتیں اور نہ ہی تمہاری کوئی یادگار! اپنی حرماں نصیبی پر وہ اس طرح بے چین ہو جاتی ہے جیسے ساز کے پر سکوت تاروں میں متلاطم نغمہ!

اور پھر! میری مایوس و افسردہ روح!! وہ ناکام واپس آجاتی ہے۔

محض تمہاری شیریں یاد کا سہارا لئے اور بازیافت کے بھروسے پر۔

"تمہارے بعد"

اپریل کی حسین اور چمکیلی صبح ہے۔ آفتابی کرنیں نو شگفتہ غنچوں کے ساتھ کھیل رہی ہیں اور ساکنان چمن' نسیم سحر کے عطر بیز جھونکوں سے مخمور ہیں۔

ہر چہار طرف طمانیت کا دور دورہ ہے اور حیات نو کی حلاوت

لیکن میں۔ آہ! میری زندگی تو اب بھی ایک بے رونق صبح کی طرح ہے۔ خاموش اور افسردہ' جیسے حد سے بڑھ کر کھلے ہوئے پھول کی پنکھڑیاں بکھر جاتی ہیں۔

تمہارے بعد! مجھے حسن چمن پھیکا نظر آتا ہے اور صبح کا پیارا پیارا چہرہ مرجھایا ہوا۔

کائنات پر شام کی سرخی چھا گئی۔ آفتاب کھجور کے درخت کے پیچھے غروب ہو رہا ہے اور فضا پر غلبہ کیف و سرور ہے۔

ہر شے پر لرزش حیات طاری ہے جیسے ہوا کے جھونکوں سے اشجار کی نرم شاخیں جھوما کرتی ہیں۔

لیکن میرے لئے تو یہ شام بھی۔ خزاں کی افسردہ سہ پہر سے کم نہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ذرہ ذرہ غرق محن ہے۔ اور دنیائے چمن بے رونق ...... غنچے سسک رہے ہیں اور پتے محو فغاں

تمہارے بعد مجھے ہر لذت۔ ہم آغوش درد معلوم ہوتی ہے اور نالۂ احساس سے پاش پاش۔

نیلگوں آسمان پر شوخ ستارے چمک رہے ہیں چاند سمندری لہروں سے آنکھ مچولی کھیل رہا ہے اس کی چاندنی سکون آمیز ہے اور روح پرور ...... پر نہ معلوم کیوں؟ مجھے محفل انجم مدھم نظر آتی ہے اور چاند کا حسین چہرہ زرد زرد' رات خاموشیوں کی بستی ہے اور اداسیوں کا مسکن۔

تمہارے بعد تو میرا جذبہ احساس ہی کچل کر رہ گیا۔ اب ایک بیکار وجود ہے اور دیوانے کے خواب کی طرح پریشان روح۔

———O———

ملکۂ خیال

میں تدمر(۱) کے کھنڈروں میں پہنچا اور تھک کر گھاس پر بیٹھ گیا' جو ان ستونوں کے درمیان اگی ہوئی تھی' جنہیں زمانے نے اکھیڑ کر' گڑھوں میں پھینک دیا تھا اور جو ایسے معلوم ہوتے تھے' گویا کسی خوفناک جنگ میں کام آنے والے سپاہیوں کے ڈھانچے ہیں۔ میں اس شہر کی بڑی بڑی عمارتوں کی تباہی پر غور کرنے لگا' جو صحیح و سالم اور سرسبز آثار سے الگ مسمار ہوئی پڑی تھیں۔

جب رات ہوئی اور مختلف الجنس مخلوقات نے خاموشی کا لباس پہننے میں ساجھا کر لیا' تو میں نے محسوس کیا کہ ایتھر میں جو میرا احاطہ کئے ہوئے ہے' ایک سیال ہے' جو خوشبو میں عود و لوبان سے اور فعل میں شراب سے مشابہ ہے۔ کسی نامعلوم قوت کے زیر اثر' میں نے اسے پینا شروع کر دیا اور مجھے ان مخفی ہاتھوں کا احساس ہوا' جو میری عقل کو بانٹ رہے تھے' میری آنکھوں کو بند کئے دیتے تھے اور میری روح کو اس کی بندشوں سے آزاد کر رہے تھے۔ اس کے بعد زمین میں تناؤ کی سی اور فضا میں لرزش کی سی کیفیت پیدا ہوئی۔ ایک طلسمی قوت سے مغلوب ہو کر میں نے جست لگائی اور خود کو ایک ایسے باغ میں پایا' جس کا تصور بھی انسان کی قدرت سے باہر ہے۔ میرے ساتھ نوخیز لڑکیوں کا جمگھٹ تھا' جن کا جسم' حسن کے سوا ہر لباس سے عاری تھا۔ جو میرے گرد و پیش مصروف خرام تھیں لیکن ان کے پاؤں گھاس سے مس نہ ہوتے تھے۔ جو نغمۂ عبودیت الاپ رہی تھیں' جس کی ترکیب محبت کے خوابوں سے ہوئی تھی اور ہاتھی دانت کے سرود بجا رہی تھیں' جن کے تار سنہری تھے۔ ایک کشادہ مقام پر پہنچ کر' جس کے وسط میں جڑاؤ تخت بچھا تھا اور چاروں طرف وہ نظر فریب سبزہ زار تھے' جن سے قوس قزح کے رنگ کی روشنیاں پھوٹ رہی تھیں' وہ لڑکیاں دائیں بائیں کھڑی ہو گئیں' ان کی آوازوں میں مقابلتاً" بلندی پیدا ہو گئی اور وہ اس سمت دیکھنے لگیں جہاں سے مر اور لوبان کی لپٹیں چلی

آ رہی تھیں۔ اچانک پھولوں سے لدی ہوئی شاخوں میں سے ایک ملکہ نمودار ہوئی' جو آہستہ آہستہ تخت کی طرف آ رہی تھی۔ تمکنت اور وقار کی ایک عجیب شان سے وہ تخت پر جلوہ افروز ہوئی اور برف کی مانند سفید کبوتروں کا ایک جھلڑ آسمان سے اتر کر اس کے قدموں میں بہ شکل ہلال بیٹھ گیا۔

یہ سب کچھ ہوا' اس حال میں کہ دوشیزگان جمال ملکہ کی عظمت کے راگ گا رہی تھیں اور عود و لوبان کا دھواں اس کی تکریم و تعظیم کے لئے ستونوں کی طرح اٹھ رہا تھا۔ میں حیرت و استعجاب کا مارا ملکہ کے سامنے کھڑا' وہ کچھ دیکھ رہا تھا' جو انسان کی آنکھ نے کبھی نہیں دیکھا اور سن رہا تھا' جس سے ابن آدم کے کان کبھی آشنا نہیں ہوئے۔

ملکہ نے ہاتھ کا اشارہ کیا اور ہر حرکت سکون سے بدل گئی۔ اس کے بعد ایک ایسی آواز میں' جو میری روح کو اس طرح حرکت میں لے آئی' جس طرح موسیقار کا ہاتھ عود کے تاروں کو حرکت میں لے آتا ہے اور جس نے اس طلسمی دائرہ کو اس طرح متاثر کر دیا' گویا ہر شے سراپا گوش و قلب ہے' اس نے کہا:

"اے آدم زاد! میں نے تجھے بلایا ہے' کہ میں خیال کی نزہت گاہوں کی پروردگار ہوں!! میں نے تجھے اپنے حضور طلب کیا ہے! کہ میں خوابوں کے جنگل کی ملکہ ہوں!! میری باتیں غور سے سن کر انہیں اپنے ہم جنسوں کے سامنے بلند آواز میں دہرائیو!

کہیو! خیال کی مملکت' خانہ شادی ہے' جس کی دربانی ایک سرکش دیو کرتا ہے' اس مکان میں کوئی داخل نہیں ہو سکتا' جب تک شادی کا لباس پہنے ہوئے نہ ہو۔

کہیو! وہ ایک جنت ہے' جس کی حفاظت محبت کے فرشتے کرتے ہیں۔ اس جنت کو وہی دیکھ سکتا ہے' جس کی پیشانی پر محبت کا نشان ہو! وہ تصورات کا ایک سرسبز باغ ہے' جس کی نہریں شراب کی طرح خوشگوار ہیں' جس کے پرندے فرشتوں کی طرح اڑتے ہیں اور جس کے پھولوں سے مشک و عنبر کی خوشبوئیں پھوٹتی ہیں۔ اس باغ میں خیال پرست کے علاوہ کوئی قدم نہیں رکھ سکتا۔

انسان سے کہیو! کہ میں نے اسے سرور سے بھرا جام عطا کیا لیکن اس نے اپنی جہالت کی وجہ سے اسے انڈیل دیا' یہ دیکھ کر ظلمت کا فرشتہ آیا اور اس جام کو افسردہ غم سے لبریز کر گیا' وہ بدنصیب اسے پی گیا اور مدہوش و بے خبر ہو گیا۔

کہیو! کہ سرود زندگی کو چھیڑنا صرف انہیں لوگوں کا کام ہے' جن کی انگلیوں نے میرے دامن کو چھوا ہے اور جن کی آنکھوں نے میرے تخت کو دیکھا ہے۔ چنانچہ اشعیا نے اپنی حکمت کے موتی میری محبت کے رشتہ میں پروئے ہیں' یوحنا نے اپنا خواب میری زبان سے بیان کیا ہے اور دانتے نے عالم برزخ کی راہیں میری رہنمائی میں طے کی ہیں۔ میں وہ مجاز ہوں جس کے ڈانڈے حقیقت سے ملتے ہیں' وہ حقیقت ہوں' جو روح کی وحدانیت کا اظہار کرتی ہے اور وہ شاہد ہوں' جس سے دیوتاؤں کے اعمال میں حسن و پاکیزگی پیدا ہوتی ہے۔

کہیو! فکر کے لئے اس مادی عالم سے بلند ایک اور عالم ہے' جس کے آسمان کو سرور کے بادل مکدر نہیں کرتے اور تخیلات کے لئے' دیوتاؤں کے آسمان پر بنی ہوئی کچھ تصویریں ہیں' جن کا عکس روح کے آئینہ پر پڑتا ہے' ان عشرتوں کی امید کو عام کرنے کے لئے' جو اسے دنیوی زندگی سے چھٹکارا پانے کے بعد' حاصل ہوں گی۔"

ملکہ خیال نے سحر آفریں نگاہوں سے مجھے اپنی طرف کھینچا اور میرے بھڑکتے ہوئے ہونٹوں کو بوسہ دے کر کہنے لگی:

"کہیو! کہ جو کوئی اپنے شب و روز خیال و خواب کی دنیا میں بسر نہیں کرتا وہ شب و روز کا غلام رہتا ہے۔"

اس وقت دوشیزگان جمال کی آوازیں اونچی ہوئیں عود و لوبان کا دھواں بلند ہوا اور خواب میری نگاہوں سے چھپ گیا۔ زمین میں تناؤ کی سی اور فضا میں لرزش کی سی کیفیت پیدا ہوئی۔ اب میں پھر انہی غم آفریں کھنڈروں میں تھا۔

صبح مسکرا رہی تھی اور میری زبان اور ہونٹوں پر یہ کلمے تھے:

"جو کوئی اپنے شب و روز خیال و خواب کی دنیا میں بسر نہیں کرتا وہ شب و روز کا غلام رہتا ہے!"

(۱) تدمر۔ شام کا ایک قدیم شہر

عورت کی عظمت

میں نے اسے ایک نوجوان دیکھا' جو زندگی کی راہوں میں گم' شباب کے اثرات سے مغلوب اور اپنی خواہشوں کا اصلی سبب معلوم کرنے کے لئے مرا جاتا تھا' ایک نرم و نازک پھول پایا' جسے تند ہوائیں لایعنی تمناؤں کے اتھاہ سمندر کی طرف اڑائے لئے جا رہی تھیں۔

میں نے اسے گاؤں میں ایک شریر لڑکا دیکھا' جو پرندوں کے گھونسلے برباد کر کے ان کے بچوں کو مار ڈالتا تھا' پھولوں کی نازک پنکھڑیوں کو روند کر ان کے حسن و دلکشی کو غارت کر دیتا تھا۔ مدرسہ میں ایک نوجوان پایا' جسے لکھنے پڑھنے سے کوئی سروکار نہ تھا' جو خاموشی کا دشمن اور بدتمیزیوں کی پوٹ تھا' اور شہر میں ایک کڑیل نوجوان دیکھا' جو گھناؤنے بازاروں میں آبائی شرافت کا سودا کرتا پھرتا تھا' ننگ و ذلت کے شبستانوں میں دونوں ہاتھوں سے دولت لٹاتا تھا اور جس نے اپنی عقل' بنت رز' کے حوالے کر دی تھی۔

لیکن ان تمام برائیوں کے باوجود' میں اس سے محبت کرتا تھا۔۔۔۔ ایسی محبت' جس میں افسوس کے ساتھ ہمدردی شامل تھی۔ میں اسے چاہتا تھا اس لئے کہ یہ تمام بری عادتیں طبعی نہیں' اس کی کمزور اور مایوس فطرت کا نتیجہ تھیں۔

لوگو! نفس انسانی بہ جبر و اکراہ عقل و حکمت کی راہوں سے ہٹتا ہے اور خوشی خوشی ان کی طرف لوٹتا ہے۔ جوانی کی آندھیاں گرد و غبار کو اپنے دامن میں لے کر اٹھتی ہیں' جو آنکھوں میں گھس کر انہیں بند کر دیتا ہے۔۔۔۔ اندھا کر دیتا ہے' اور بسا اوقات ایک طویل مدت کے لئے اندھا کر دیتا ہے۔

میں اس نوجوان سے محبت کرتا تھا اور میرے دل میں اس کے لئے خلوص۔۔۔۔ بے انتہا خلوص۔۔۔۔ تھا' کیونکہ میں دیکھتا تھا کہ اس کے ضمیر کا کبوتر اس کی بداعمالیوں کے گدھ پر غالب آنا چاہتا ہے لیکن مغلوب ہو جاتا۔۔۔۔ اپنی بزدلی کی

پر نہیں' اپنے دشمن کی قوت کی وجہ سے!

ضمیر ایک انصاف پسند مگر کمزور قاضی ہے' جس کی کمزوری اس کے حکم جاری کرنے کی راہیں روکے کھڑی ہے۔

میں نے کہا ہے! میں اس سے محبت کرتا تھا اور محبت مختلف بھیس بدل کر آتی ہے۔۔۔۔ کبھی حکمت کے بھیس میں' کبھی انصاف کے بھیس میں اور کبھی امید کے بھیس میں! مجھے اس سے جو محبت تھی' وہ اس آرزو کے بھیس میں تھی کہ اس کے آفتاب فطرت کی روشنی اس کی عارضی بدعنوانیوں کی ظلمت پر غالب آ جائے' لیکن میں اس سے ناآشنائے محض تھا کہ اس کی آلودگی پاکیزگی سے' بداخلاقی خوش اخلاقی سے اور جہالت عقلمندی سے کب اور کیوں کر بدلے گی؟ انسان نہیں جانتا کہ روح مادہ کی قیود بند سے کس طرح آزاد ہوتی ہے؟ جب تک وہ آزاد نہ ہو جائے! اسے معلوم نہیں کہ پھول کیوں کر مسکراتے ہیں؟ جب تک ملکہ سحر اپنے روشن چہرہ سے نقاب نہ الٹ دے!

(۲)

دن' رات کے کندھوں پر سوار ہو کر گزرتے رہے۔ میں اس نوجوان کو رنج و الم کے انتہائی احساس کے ساتھ یاد کرتا تھا اور ان ٹھنڈے سانسوں کے ساتھ اس کا نام لیتا تھا' جو دل میں زخم ڈال ڈال کر اس کا خون کئے دیتے تھے۔ یہاں تک کہ کل مجھے اس کا ایک خط ملا' جس میں لکھا تھا!

"پیارے دوست! میرے پاس ہو جاؤ! میں تمہیں ایک نوجوان سے ملانا چاہتا ہوں' جسے دیکھ کر تمہارا دل خوش ہو گا اور جس سے مل کر تمہاری روح مسرور!"

میں نے کہا: "افسوس! کیا وہ یہ چاہتا ہے کہ اپنی دوستی کی غم آفرینیوں کو اپنی ہی جیسی ایک اور دوستی سے دوگنا کر دے؟ کیا وہ خود ضلالت و گمراہی کے متن کی تشریح و تعریف کے سلسلہ میں کافی مثال نہیں ہے؟ اور کیا اب اس کی خواہش یہ ہے کہ اس مثال پر اپنے دوستوں کے حالات کا حاشیہ چڑھائے تاکہ مادی کی کتاب کا کوئی حرف میری نگاہوں سے اوجھل نہ رہ جائے؟"

میرے خیالات کا رخ بدلا: "لیکن مجھے جانا چاہئے! کہ نفس اپنی حکمت سے کام لے کر' کانٹوں میں سے پھول چن لیتا ہے اور دل اپنی محبت کے بل پر تاریکی کے سینہ سے نور کھینچ لیتا ہے۔"

جب شام ہوئی تو میں اس سے ملنے گیا اور دیکھا کہ وہ اپنے کمرہ میں تنہا بیٹھا کوئی دیوان پڑھ رہا ہے کتاب اس کے ہاتھ میں دیکھ کر مجھے بہت تعجب ہوا' اور میں نے سلام کر کے اس سے پوچھا:

"وہ نئے دوست کہاں ہیں؟"

اس نے جواب دیا:

"میرے دوست! وہ میں ہی ہوں!"

یہ کہہ کر وہ خاموشی سے بیٹھ گیا' جو میرے لئے ایک بالکل نئی چیز تھی' اور میری طرف دیکھا' اس کی آنکھوں میں ایک عجیب نور تھا' جو سینہ کو چیر کر جسم کی ہر رگ اور ہر ریشہ کو اپنے حلقہ میں لے رہا تھا۔ وہ آنکھیں' جنہیں میں نے جب دیکھا' درشتی و سنگدلی کے سوا ان میں کچھ نہ پایا' اب ان سے وہ روشنی پھوٹ رہی تھی جو دل کو لطف و مہربانی سے لبریز کئے دیتی تھی۔ آخرکار اس نے ایک ایسی آواز میں' جسے میں یہ سمجھا کہ اس کے حلق سے نہیں' کسی اور کے حلق سے نکل رہی ہے' کہا:

"وہ شخص' جسے تم بچپن میں جانتے تھے' طالب علمی کے زمانہ میں جس کی تم نے رفاقت کی اور جوانی میں جس کے تم ساتھ ساتھ رہے' اب مر چکا ہے اور اس کی موت سے میں پیدا ہوا ہوں۔ میں تمہارا نیا دوست ہوں' مجھ سے ہاتھ ملاؤ!"

میں نے اس سے ہاتھ ملایا اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اس کے ہاتھ میں ایک لطیف روح ہے' جو خون کے ساتھ گردش کر رہی ہے۔ ——— وہ سخت اور کھردرا ہاتھ اب نرم و نازک ہو گیا تھا' وہ انگلیاں' جو اپنے اعمال کی بناء پر کل تک چیتے کے پنجہ سے مشابہ تھیں آج اپنی رقت و لطافت کی بناء پر دل کو مس کر رہی تھیں۔ کاش! میں اپنی بات کی غرابت کا خیال کر سکتا' جو اس وقت میں نے اس سے پوچھی!

"تم کون ہو؟ یہ تبدیلی تم میں کیسے اور کہاں پیدا ہوئی؟ کیا روح نے تمہارے جسم کو عبادت کدہ بنا کر' تمہیں مقدس کر دیا ہے' یا تم میرے سامنے کسی شاعرانہ دور کی تمثیل پیش کر رہے ہو؟"

اس نے جواب دیا:

"ہاں! میرے دوست! روح نے مجھ میں نزول فرما کر مجھے پاک کر دیا ہے اور عظیم الشان محبت نے میرے دل کو مقدس قربان گاہ بنایا ہے۔ وہ عورت ہے' میرے دوست! ——— وہ عورت' جسے کل تک میں مرد کا کھلونا سمجھتا تھا لیکن آج اس نے مجھے جہنم کی تاریکی سے نکال کر جنت کے دروازے میرے لئے کھول دیئے اور میں اس میں داخل ہو گیا۔

وہ حقیقی عورت' جو مجھے اپنی محبت کے عشرت کدہ میں لے گئی اور میرے لئے سہارا بنی!

وہ عورت' جس کی بہنوں کو میں نے اپنی جہالت سے ذلیل کیا' لیکن اس نے مجھے تخت عظمت پر بٹھا دیا۔

وہ عورت' جس کی ہم چشموں کو میں نے اپنی نادانی سے خراب کیا' لیکن اس نے اپنی محبت سے' مجھے پاک کر دیا۔

وہ عورت' جس کی ہم جنسوں کو میں نے اپنی دولت سے اپنا غلام بنایا' لیکن اس نے اپنے حسن و جمال کا نور مجھ پر برسا کے مجھے آزاد کر دیا۔

وہ عورت جس نے اپنی قوت ارادی اور آدمؑ کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اسے جنت سے نکالا آج اپنی مہربانی اور میری اطاعت کے زیر اثر مجھے اسی جنت میں لے گئی۔"

اس وقت میں نے اس کی طرف دیکھا: آنسو اس کی آنکھوں میں چمک رہے تھے مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر کھیل رہی تھی اور محبت کی شعاعوں کا تاج اس کے سر پر رکھا تھا۔ میں اس کے قریب گیا اور ازراہ برکت طلبی اس کی پیشانی کو بوسہ دیا' جس طرح کاہن قربان گاہ کے صحن کو بوسہ دیتا ہے۔ اس کے بعد میں نے اس سے رخصت چاہی اور اس کا یہ فقرہ دل ہی دل میں دہراتا ہوا واپس آ گیا: وہ عورت' جس نے اپنی قوت ارادی اور آدمؑ کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اسے جنت سے نکالا' آج اپنی مہربانی اور میری اطاعت کے زیر اثر مجھے اسی جنت میں لے گئی۔"

———O———

جسم و روح

بہار کے دن تھے' ایک مرد اور ایک عورت دونوں ایک ساتھ دریچے میں بیٹھے تھے' دریچہ جو باغ میں کھلتا تھا ------ وہ دونوں ایک دوسرے کے بہت ہی قریب بیٹھے تھے! عورت بولی

"مجھے تم سے محبت ہے کیونکہ تم جوان ہو دولت مند ہو اور خوش پوش!"

"میں بھی تم سے محبت کرتا ہوں کیونکہ تم ایک حسین خواب ہو ------- ایک ایسا خیال جو لمس کا متحمل نہیں ہو سکتا' میرے سہانے خوابوں کا ایک رسیلا گیت------!"

مرد جذبات کی رو میں بہہ گیا

عورت جل کر الگ ہو گئی۔

"تم مجھ سے دور ہی رہو تو بڑا کرم ہوگا۔ کیونکہ میں نہ تو کوئی شراب ہوں اور نہ ہی ایسا نازک خیال جس کا سحر تمہارے اولیٰ لمس سے ٹوٹ جائے جو صرف تمہارے خوابوں سے متعلق ہو

میں عورت ہوں۔ اور یہ میری آرزو تھی' کہ تم مجھے اپنی جورو بناتے اپنے نوزائیدہ بچے کی ماں!"

اور وہ دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ مرد اپنے دل میں کہہ رہا تھا

"لو دیکھو' ایک اور حسین خواب' بس خیال ہو کر رہ گیا"

اور عورت کہہ رہی تھی

"اس مرد کا کیا ہے جو مجھے میری آرزوؤں کو صرف خواب و خیال بنا دینا چاہتا ہے!"

رہبانیت

آج سے بہت پہلے۔ یہاں سے بہت دور پہاڑوں میں ایک راہب کا مسکن تھا۔ اس کی روح پاک تھی اور ضمیر روشن------ زمین و آسمان کے تمام جان دار جوق در جوق اس کے حضور میں آتے' اور وہ ان سے باتیں کرتا۔ وہ بڑے انہماک اور شوق سے اس کی باتیں سنتے۔ اور اس کے گرد جمع رہتے۔ یہاں تک کہ سورج چھپے وہ انہیں اپنی دعاؤں کے ساتھ جنگل کی ہوا کے سپرد کر دیتا۔

ایک شام جب وہ محبت کے متعلق بات چیت کر رہا تھا۔ تو ایک شیرنی نے اپنا سر اٹھایا۔ اور راہب سے پوچھا۔

"حضور آپ ہم سے تو محبت کی کہانیاں کہہ رہے ہیں۔ لیکن خود آپ کی اپنی جورو کہاں ہے؟"

راہب بولا۔

"میری کوئی جورو نہیں ہے۔"

اس پر چرندوں' پرندوں' درندوں کے اس انبوہ میں حیرت و استعجاب کی ایک لہر دوڑ گئی' اس کی کوئی نہیں سنتا تھا۔ سب اپنی ہی ہانکتے جاتے تھے---------- قیامت کا شور' بے پناہ شور بپا تھا۔

"یہ ہمیں محبت کرنے کا

گھر بسانے کا' درس کیونکر دے سکتا ہے۔ جب کہ اس نے خود نہ کبھی محبت کی' نہ کبھی گھر بسایا!"

اس نفرت میں وہ اسے اکیلا چھوڑ کر چل دیے

اور اس رات' راہب چٹائی پر اوندھا پڑا روتا رہا اور اپنا سینہ پیٹتا رہا!

مہمان

ٹھہر --- ہاں ذرا ٹھہرو ---- میرے مشتاق دوست --- میں بہت جلد اس فانی
جسم کو تمہارے حوالے کر دوں گا۔
جس کا درد و کرب میرے رگ و ریشہ میں سما کر بیکار ہو چکا ہے اور جسے دیکھ کر
تمہارے صبر کا پیمانہ لبریز ہو رہا ہے۔
میں نہیں چاہتا کہ ان لمحوں میں میں تمہاری بھی خواہش کو منتظر رکھوں'
اگرچہ یہ زنجیر حیات سانس کی بنی ہوئی ہے۔ لیکن مشکل سے توڑی جا سکتی ہے۔
اور مرنے کی تمنا۔
جو تمام مضبوط ترین چیزوں سے مضبوط ہے۔
زندہ رہنے کی تمنا سے قائم رہتی ہے۔ جو تمام کمزور ترین چیزوں سے کمزور ہے مجھے
معاف کرنا میرے رفیق میں بہت پیچھے رہ گیا ہوں۔
یہ میری یاد ہے جو میری روح کو روکے ہوئے ہے۔
میرے گزرے ہوئے دنوں کا ہجوم
خواب میں گذری ہوئی جوانی کی ایک جھلک
ایک چہرہ جو میری پلکوں کو محو خواب ہونے سے روکتا ہے۔
ایک آواز جو میرے کانوں میں مسلسل گونج رہی ہے۔
ایک ہاتھ جو میرے ہاتھ کو چھو رہا ہے۔
مجھے معاف کرنا میرے دوست تمہیں بہت دیر تک انتظار کرنا پڑا۔
اب یہ قصہ پاک ہوا۔ اور تمام چیزیں مجھ سے روپوش ہو چکیں۔
چہرہ --- آواز ---- ہاتھ ---- اور وہ دھند جو انہیں یہاں لائی تھی۔
گرہ کھل گئی ہے۔
اور ڈوری بکھر چکی ہے۔
اور وہ جو نہ غذا ہے اور نہ پانی واپس لی جا چکی ہے۔
آؤ ---- ہاں میرے قریب آؤ میرے بھوکے رفیق کھانا حاضر ہے۔
اور یہ کفایت شعارانہ تقریب' محبت سے دی گئی ہے۔
آؤ ---- اور میرے بائیں پہلو میں ہاں یہاں اپنی چونچ گاڑ دو اس چھوٹے سے
پرندے کو اس کے قفس سے آزاد کر دو!
جس کے پر اب کبھی پھڑ پھڑا نہیں سکتے۔
میری خواہش ہے کہ یہ تمہارے ساتھ آسمان بلند پر اڑ جائے۔
اب آؤ --- ہاں آؤ میرے دوست میں آج کی رات تمہارا میزبان ہوں اور تم
میرے معزز مہمان'

---------○---------

گورکن

رات کا وقت تھا۔ فضا پر خوفناک خاموشی مسلط تھی اور تارے ابر میں روپوش۔ میں تنہا "وادیٔ ظلِ حیات" کی طرف نکل گیا' جو مردوں کی ہڈیوں اور کھوپریوں سے پٹی پڑی تھی۔

وہاں ـــــ جوئے اشک و خوں کے کنارے' جو کوڑیالے سانپ کی طرح لہراتی اور مجرموں کے خواب کی طرح ہچکولے کھاتی' بہہ رہی تھی۔ میں پرچھائیوں کی سرگوشیوں پر کان لگائے اور ایک موہوم نقطہ پر نگاہیں جمائے کھڑا ہو گیا۔

جب رات بھیگی اور روحیں اپنے اپنے مسکن سے گروہ در گروہ نکلیں' تو میں نے بھاری قدموں کی چاپ سنی' جو لحہ بہ لحہ مجھ سے قریب ہو رہی تھی۔ میں نے مڑ کر دیکھا' ایک ہیبت ناک و دیو ہیکل سایہ' میرے سامنے کھڑا تھا۔ ڈرتے ڈرتے میں نے پوچھا۔

"تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

اس نے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں چراغ کی طرح روشن تھیں۔ پر اطمینان لہجہ میں اس نے جواب دیا:

"کچھ نہیں چاہتا اور سب کچھ چاہتا ہوں!"

میں نے کہا:

"مجھے میرے حال پر چھوڑ دو اور اپنی راہ لو!"

مسکراتے ہوئے اس نے جواب دیا:

میری راہ وہی ہے جو تیری راہ ہے۔ وہیں میں جا رہا ہوں جہاں تو جا رہا ہے اور وہی میری منزل ہے جو تیری منزل ہے۔"

میں نے کہا:

"میں تنہائی کی تلاش میں نکلا ہوں' مجھے تنہا چھوڑ دو۔"

اس نے جواب دیا:

"تنہائی تو میں ہی ہوں' پھر تو مجھ سے کیوں ڈر رہا ہے؟"

میں نے کہا:

"میں تو تم سے نہیں ڈر رہا۔"

وہ بولا:

"اگر تو مجھ سے نہیں ڈر رہا' تو پھر میرے سامنے اس طرح کیوں لرز رہا ہے؟ جیسے ہوا کے سامنے شاخ!"

میں نے جواب دیا:

"میں تو نہیں لرز رہا' میرے کپڑے ہوا کے جھونکوں سے ہل رہے ہیں۔"

وہ قہقہہ مار کر ہنسا۔ اس کی آواز آندھی کے شور سے ملتی جلتی تھی۔ اس نے کہا:

"تو بزدل ہے اور مجھ سے ڈر رہا ہے' صرف یہی نہیں بلکہ اپنا خوف ظاہر کرتے ہوئے بھی تیری روح فنا ہو رہی ہے۔ اس لئے تو دوہرے خوف میں مبتلا ہے' لیکن تو اپنی بزدلی پر مکر و فریب کا پردہ ڈالنا چاہتا ہے' جو مکڑی کے جالے سے بھی زیادہ بے حقیقت اور بودا ہے۔ تیری اس حرکت پر مجھے ہنسی بھی آ رہی ہے اور غصہ بھی۔"

وہ ایک چٹان پر بیٹھ گیا' اپنے ارادہ کے خلاف مجھے بھی اس کے پاس بیٹھنا پڑا۔ میری نگاہیں اس کے ڈراؤنے خدوخال پر جمی ہوئی تھیں۔

تھوڑی دیر کے بعد' جو میرے لئے ایک ہزار سال کے برابر تھی' اس نے تضحیک آمیز نگاہوں سے میری طرف دیکھ کر پوچھا:

"تیرا نام کیا ہے؟"

میں نے کہا:

"عبداللہ!"

کہنے لگا:

"کتنے بے شمار ہیں خدا کے بندے اور کیسی کیسی مشکلات پیش آتی ہیں خدا کو اپنے بندوں کی وجہ سے۔ تو خود کو "شیطان اعظم" کیوں نہیں کہتا اور اس طرح شیاطین کی مصیبتوں میں ایک نئی مصیبت کا اضافہ کیوں نہیں کرتا؟"

میں نے کہا:

"میرا نام عبداللہ ہے اور یہ وہ پیارا نام ہے' جو والد نے میری پیدائش کے دن میرے لئے تجویز کیا تھا۔ میں اسے کسی دوسرے نام سے نہیں بدلوں گا!"

اس نے کہا:

"باپ کے عطئے اور بخششیں ہی بیٹے کی تباہی و بربادی کا باعث ہیں۔ اس لئے جو شخص اپنے تئیں باپ دادا کے عطیوں سے محروم نہیں کرتا' مرتے دم تک مردوں کا غلام رہتا ہے۔"

میں نے سر جھکا لیا اور اس کے معنی خیز الفاظ پر غور اور اپنے حافظہ میں ان خیالات کے نقوش تازہ کرنے لگا' جو حقیقت سے مشابہ تھے کہ وہ لوٹا اور مجھ سے پوچھنے لگا:

"تو کرتا کیا ہے؟"

میں نے جواب دیا:

"میں شاعر بھی ہوں اور ناقد بھی۔ زندگی کے متعلق میرے کچھ مخصوص نظریئے ہیں جنہیں دنیا کے سامنے پیش کرنا میرا کام ہے۔"

اس نے کہا:

"یہ ایک قدیم اور متروک خدمت ہے' جو دنیا کے لئے مفید ہے نہ مضر۔"

میں نے سوال کیا:

"تو پھر میں اپنے شب و روز کے لئے کون سا مصرف پیدا کروں؟ جس سے دنیا کو فائدہ پہنچے۔"

اس نے جواب دیا:

"قبر کھودنے کا پیشہ اختیار کر اور زندہ لوگوں کو ان مردہ جسموں سے نجات دلا' جو ان کے مکانوں' عدالتوں اور عبادت گاہوں کے گرد جمع ہیں۔"

میں نے کہا:

"میں نے تو کبھی مردہ جسموں کو مکانوں کے گرد جمع نہیں دیکھا۔"

اس نے جواب دیا:

"تو ظاہری اور سطحی نگاہ سے دیکھتا ہے' لوگ تجھے زندگی کی آندھیوں کے سامنے مرتعش نظر آتے ہیں اور تو سمجھتا ہے کہ وہ زندہ ہیں۔ حالانکہ درحقیقت پیدائشی طور پر مردہ ہیں۔ چونکہ انہیں کوئی دفن کرنے والا نہیں ملتا اس لئے وہ زمین پر پڑے رہتے ہیں اور ان کے کڑ کھائے جسموں سے سڑاند پھوٹتی رہتی ہے۔"

میں نے قدرے بے خوف ہو کر پوچھا:

"ہم زندہ اور مردہ میں کیسے تمیز کر سکتے ہیں؟ جب کہ دونوں آندھی کے سامنے مرتعش ہوتے ہیں۔"

اس نے جواب دیا:

"مردے آندھی کے سامنے لرزتے کانپتے ہیں لیکن ذی حیات اس کے ساتھ ساتھ دوڑتے ہیں اور جب تک وہ خود نہ تھم جائے' نہیں رکتے۔"

وہ اپنے بازوؤں کے سہارے کھڑا ہو گیا' اس کے مضبوط عضلات' سدا بہار بلوط کے درخت کی جڑوں سے مشابہ تھے' جو زندگی اور ارادے سے پر ہوتی ہیں' اس کے بعد اس نے مجھ سے پوچھا:

"کیا تیری شادی ہو چکی؟"

میں نے جواب دیا:

"جی ہاں! میری بیوی حسن و جمال کی دیوی ہے اور میں اسے اپنی جان سے زیادہ چاہتا ہوں۔"

وہ کہنے لگا:

"اف! تیری خطائیں اور کمزوریاں کتنی بے شمار ہیں؟ شادی کیا ہے؟ ایک جاری و دائم قوت کا حلقہ غلامی' جو انسان کے گلے میں ڈال دیا جاتا ہے! اگر تو چاہتا ہے کہ آزاد زندگی بسر کرے' تو اپنی بیوی کو طلاق دے اور سب سے الگ تھلگ رہ!!"

میں نے کہا:

"میرے تین بچے ہیں۔ سب سے بڑا تو گیند کھیلتا پھرتا ہے اور سب سے چھوٹا ابھی اچھی طرح بات بھی نہیں کر سکتا۔ بتاؤ! میں ان کا کیا کروں؟"

اس نے جواب دیا:

"انہیں گورکنی سکھا اور ہر ایک کو ایک ایک پھاوڑا دے کر اپنے اپنے حال پر چھوڑ

دے!"

میں نے کہا:

"مجھ میں عزلت و تنہائی کو برداشت کرنے کی تاب نہیں ہے۔ دوسرے میں اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ زندگی کی مسرتوں سے حصہ گیر ہونے کا عادی ہو چکا ہوں۔ اب اگر میں انہیں چھوڑ دوں' تو اس کے نتیجہ میں میری سعادت و خوش بختی مجھ سے چھن جائے گی۔"

اس نے کہا:

"بیوی بچوں کے درمیان' مرد کی زندگی ایک سیاہ بختی کے سوا کچھ نہیں' جس پر سفید پالش چڑھا ہوا ہے' لیکن اگر شادی تیری زندگی کا جزو لازم ہی ہے' تو کسی "جن" کی لڑکی سے شادی کر لے!"

متعجب ہو کر میں نے کہا:

"جن کی کوئی حقیقت نہیں۔ آخر تم مجھے فریب کیوں دے رہے ہو۔"

اس نے جواب دیا:

"اف! کس قدر جاہل محض ہے تو!!------ "جن" کے سوا کوئی حقیقت ہی نہیں۔ اور وہ شخص جس نے "جنوں" سے کوئی تعلق نہ رکھا' ہمیشہ شک و التباس کی دنیا میں رہا۔"

میں نے پوچھا:

"کیا جنوں کی بیٹیاں حسین و جمیل ہوتی ہیں؟"

اس نے جواب دیا:

"ان کا حسن لازوال اور ان کا جمال غیر فانی ہے!"

میں نے کہا:

"اگر تم مجھے کسی جن کی لڑکی دکھا دو' تو میں مطمئن ہو جاؤں گا!"

اس نے کہا:

"اگر تو جن کی لڑکی کو دیکھ اور چھو سکتا تو میں تجھے اس سے شادی کرنے کا مشورہ ہی کیوں دیتا؟"

میں نے جواب دیا:

"ایسی بیوی سے کیا فائدہ' جسے نہ دیکھا جا سکے' نہ چھوا جا سکے۔"

اس نے کہا:

"وہ ایک نفع ہے مگر دیر حاصل' جس کے نتیجہ میں عام مخلوق اور زندہ لاشوں سے نجات مل جاتی ہے' جو آندھی کے سامنے لرزتی کانپتی تو ہیں لیکن اس کا ساتھ نہیں دے سکتیں۔"

اس نے تھوڑی دیر کے لئے میری طرف سے منہ موڑ لیا۔ اس کے بعد وہ پلٹا اور مجھ سے دریافت کرنے لگا:

"تیرا مذہب کیا ہے؟"

میں نے جواب دیا:

"میں خدا پر ایمان رکھتا ہوں' پیغمبروں کی عزت کرتا ہوں۔ فضیلت و بزرگی کو محبت کے قابل سمجھتا ہوں اور آخرت کا امیدوار ہوں۔"

اس نے کہا:

"یہ وہ الفاظ ہیں' جنہیں غیر قوموں نے گھڑا اور غیر شعوری تقلید نے تیری زبان پر جاری کر دیا۔ لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ تو اپنے نفس کے سوا کسی پر ایمان نہیں رکھتا۔ اس کے سوا کسی کی عزت نہیں کرتا۔ اس کی خواہشوں کے سوا کسی کو محبت کے قابل نہیں سمجھتا' اور اس کی بقائے دوام کے سوا کسی اور چیز کا امیدوار نہیں۔ انسان آغاز تخلیق سے اپنے نفس کو پوج رہا ہے' لیکن اپنے داعیات و میلانات کے اختلاف کی بنا پر اسے مختلف ناموں سے تعبیر کرتا ہے۔ کبھی وہ اسے "بعل" اور "مشتری" کے نام سے پکارتا ہے اور کبھی "خدا" کے نام سے۔"

وہ ہنسا' اس کے خدوخال پر تمسخر اور استہزا کی نقاب پڑی تھی۔ سلسلہ گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے اس نے کہا:

"لیکن کس قدر عجیب ہیں وہ لوگ! جو اپنے نفس کی پرستش کرتے ہیں اور ان کے نفس سڑی ہوئی لاشوں کے سوا کچھ نہیں!!"

میں تھوڑی دیر تک اس کی باتوں پر غور کرتا رہا۔ مجھے ان میں زندگی سے زیادہ عجیب' موت سے زیادہ ڈراؤنے اور حقیقت سے زیادہ گہرے معنی نظر آئے۔ میرا فکر اس کے اقوال کی خوبیوں میں گم اور میرے جذبات ان کے اسرار و رموز کی وضاحت کے لئے برانگیختہ ہو گئے۔ میں نے چلا کر کہا:

"اگر تمہارا کوئی خدا ہے تو میں تمہیں اس کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ مجھے بتاؤ! تم کون ہو؟"

اس نے جواب دیا:

"میں اپنے نفس کا پروردگار ہوں!"

میں نے پوچھا:

"تمہارا نام کیا ہے؟"

جواب ملا:

"خدائے مجنوں!"

میں نے دریافت کیا:

"تم پیدا کہاں ہوئے ہو؟"

جواب دیا:

"ہر جگہ۔"

میں نے سوال کیا:

"اور تم پیدا کب ہوئے؟"

جواباً" کہا:

"ہر زمانہ میں۔"

میں نے پھر پوچھا:

"تم نے فلسفہ کی تعلیم کس سے حاصل کی ہے؟ اور وہ کون ہے؟ جس نے تمہیں زندگی کے اسرار اور ہستی کے بھیدوں کا پتہ دیا۔"

اس نے جواب دیا:

"میں فلسفی نہیں ہوں' اس لئے کہ فلسفہ تو کمزور انسان کی صفات میں سے ایک

صفت ہے بلکہ میں قوی دیوانہ ہوں۔ جب چلتا ہوں' زمین میرے قدموں کے نیچے کانپتی ہے اور جب رکتا ہوں میرے ساتھ ستاروں کی رفتار بھی رک جاتی ہے۔ میں نے انسان کے ساتھ مذاق کرنا' شیطانوں سے سیکھا ہے اور وجود و عدم کے راز میری سمجھ میں اس وقت آئے ہیں جب میں نے "جنوں" کے باوشاہوں اور رات کی پر اسرار اور طاقتور ہستیوں کی رفاقت حاصل کی ہے۔"

میں نے دریافت کیا:

"تم ان دشوار گزار وادیوں میں کیا کرتے ہو؟ اور اپنے شب و روز کس طرح گزارتے ہو؟؟"

اس نے جواب دیا:

"صبح کے وقت میں سورج سے گستاخیاں کرتا ہوں' دوپہر کو انسان پر لعنت بھیجتا ہوں' شام کو فطرت سے ہنسی مذاق کرتا ہوں اور رات کو اپنے نفس کے سامنے جھک کر اس کی پوجا کرتا ہوں۔"

میں نے پوچھا:

"تم کیا کھاتے پیتے اور کہاں سوتے ہو؟"

اس نے جواب دیا:

"میں' زمانہ اور سمندر کبھی نہیں سوتے۔ ہماری بھوک کا سامان انسان کا جسم اور ہماری پیاس کا سامان اس کا خون ہے!"

وہ کھڑا ہو گیا اور میرے چہرے پر نگاہیں جما کے آہستہ سے کہنے لگا:

"اچھا' اب رخصت! پھر ملیں گے!! اب میں وہاں جا رہا ہوں' جہاں بھوت پریت جمع ہوتے ہیں۔"

میں نے آواز دیتے ہوئے کہا:

"ایک منٹ کی مہلت اور چاہتا ہوں! مجھے ایک بات پوچھنی ہے۔"

رات کی تاریکیوں میں گم ہوتے ہوئے اس نے جواب دیا:

"دیوانے خدا کسی کو مہلت نہیں دیتے۔ اچھا رخصت! پھر ملیں گے۔"

وہ مجھے حیرت و خوف کی کشمکش میں مبتلا چھوڑ کر ظلمت کے پردوں میں روپوش ہو

گیا۔ جب میں اپنی جگہ سے چلا' تو اس کی آواز بلند و بالا چٹانوں میں گونج رہی تھی:
"اچھا' رخصت! پھر ملیں گے! اچھا رخصت! پھر ملیں گے!!"

دوسرے دن میں نے اپنی بیوی کو طلاق دے کر' ایک "جن" کی بیٹی سے شادی کر لی اور اپنے تینوں بچوں کو کدال پھاوڑا دے کر تاکید کر دی کہ جہاں کہیں لاش دیکھو' اسے زمین میں دفن کر دو۔

اس دن سے لے کر آج تک میں قبریں کھودتا اور ان میں مردوں کو دفن کرتا ہوں۔ لیکن میں اکیلا ہوں اور لاشیں زیادہ۔ پھر اور کوئی نہیں جو اس مقدس کام میں میرا ہاتھ بٹائے!

زندگی اور عورت

میں نے اپنے دوست سے کہا
"تم آج اسے جس طرح اپنے بازو پر جھکا ہوا دیکھ رہے ہو۔ کل بالکل اسی طرح وہ میرے بازو پر جھکی ہوئی تھی۔"
میرے دوست نے کہا
"اور کل وہ میرے بازو پر جھکی ہوگی!"
میں نے کہا
"ذرا دیکھو تو کس طرح اس کی گود میں پڑی ہے۔ کل اس طرح میری گود میں پڑی تھی!"
میرا دوست بولا
"اور بالکل اسی طرح کل وہ میری گود میں پڑی ہوگی!"
میں نے کہا
"ذرا دیکھو تو' وہ اس کے پیالے سے منہ لگائے ہوئے ہے۔ اور کل بالکل اسی طرح میرے پیالے سے ہونٹ چپکائے ہوئے تھی!"
اس نے کہا
"اور کل میرے پیالے سے پی رہی ہوگی!"
میں نے پھر کہا
"دیکھو تو اس کی طرف کس پیار سے دیکھ رہی ہے۔ آنکھوں میں سپردگی کا اظہار ہے ــــ اور کل بالکل اسی طرح میری طرف دیکھ رہی تھی!"
میرا دوست بولا
"اور کل اسی نظر سے مجھے دیکھے گی!"

میں نے کہا

"کیا تم دیکھ نہیں رہے ہو کہ اس کے کان میں محبت کے گیت گا رہی ہے۔ بالکل وہی گیت جو کل میرے کانوں میں گا رہی تھی!"

میرا دوست بولا

"اور کل یہی گیت میرے کان میں گا رہی ہوگی"

میں چلایا

"مگر دیکھو تو وہ اس سے بغل گیر ہو رہی ہے۔ اور کل بالکل اسی طرح مجھ سے لپٹی ہوئی تھی۔"

میرا دوست بولا

"اور کل مجھ سے لپٹی ہوگی۔"

میں جھلا اٹھا

"یہ کیسی عورت ہے یہ!"

لیکن اس نے کہا

"وہ زندگی ہی کی طرح ہے' جس پر سب کا قبضہ ہے۔ اور موت کی طرح وہ ہر ایک کو مسخر کر لیتی ہے ——— اور ابدیت کی طرح ہر ایک کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے!"

دو عورتیں

میں جس گاؤں میں پیدا ہوا اس میں ایک عورت اور اس کی بیٹی رہتی تھی۔ یہ دونوں مرض کابوس میں مبتلا تھیں۔

ایک رات جب ساری دنیا پر خاموشی طاری تھی۔ مجھے ماں اور بیٹی نیند کی حالت میں چلتی ہوئیں اپنے باغ میں ملیں جس پر کہر چھائی ہوئی تھی۔

ماں نے بیٹی سے کہا ——— "ہوں مجھے پتہ چل گیا۔ میری دشمن تو ہے جس نے میری جوانی برباد کر دی' ہاں تو جس نے میری زندگی کے کھنڈرات پر اپنی زندگی کی عمارت تعمیر کی۔

اے کاش! میں تجھے ہلاک کر سکتی ———"

بیٹی نے کہا ——— "اے قابل نفرت اور خود غرض بڑھیا' تو جو میرے اور میری آزاد فطرت کے درمیان حائل ہے اور جو میری زندگی کو اپنی پژمردہ زندگی کا ہم رنگ بنانا چاہتی ہے ———

اے کاش خدا تجھے موت نصیب کرے ———"

اس وقت ایک مرغ نے اذان دی اور دونوں عورتیں بیدار ہوئیں' بڑھیا نے نہایت شفقت سے کہا ——— "کیا یہ تم ہو میری پیاری بیٹی ———"

اور لڑکی نے بڑے پیار سے جواب دیا ——— "ہاں امی جان ———"

حصہ دوم

غم
دنیا
بھی
غم
یار
میں
شامل
کرلو

اقتباس

اگر زندگی کے شب و روز
میرے ہاتھوں میں دے دیے جائیں
تو میں انہیں
جنگل میں بکھیر دوں گا
لیکن زندگی نے میرے لیے
وہ راستہ بند کر دیا ہے
جو جنگل کی طرف جاتا ہے۔

رات کی تاریکیوں میں

رات کی تاریکیوں میں ہم ایک دوسرے کو پکارتے ہیں۔

رات کی تاریکیوں میں ہم چلاتے ہیں' فریاد کرتے ہیں اور موت کا سایہ ہمارے سامنے ہوتا ہے۔ اس کے سیاہ بازو ہم پر چھائے ہوتے ہیں اور اس کا خوفناک ہاتھ ہماری روحوں کو جہنم کی طرف گھسیٹتا ہے' لیکن اس کی آتشیں نگاہیں' دور افق پر جمی ہوتی ہیں۔

رات کی تاریکیوں میں موت گرم رفتار ہوتی ہے' اور ہم خوف و وحشت سے آہ و زاری کرتے' اس کے پیچھے پیچھے چلتے ہیں' ہم میں کوئی نہیں ہوتا جو ٹھہر سکے' یا جس کے دل میں ٹھہرنے کی آرزو ہو۔

رات کی تاریکیوں میں موت ہمارے آگے آگے ہوتی ہے اور ہم اس کے پیچھے پیچھے' جب کبھی وہ پلٹ کر دیکھتی ہے' ہم میں سے ہزاروں سڑک کے کنارے گر پڑتے ہیں۔ جو گر جاتا ہے وہ ایسا ہوتا ہے کہ پھر کبھی نہیں اٹھتا' اور جو نہیں گرتا وہ اپنے ارادوں کی خلاف چلتا رہتا ہے' یہ جانتے ہوئے کہ وہ گرے گا اور سونے والوں کے ساتھ سوئے گا۔ لیکن موت؟ ------ وہ دور افق پر نگاہیں جمائے چلتی رہتی ہے۔

رات کی تاریکیوں میں بھائی اپنے بھائی کو' باپ اپنے بیٹوں کو' اور ماں اپنے بچوں کو پکارتی ہے اور ہم سب کے سب بھوکے پیاسے اور تھکے ماندے ہوتے ہیں' لیکن موت' نہ بھوکی ہوتی ہے' نہ پیاسی اس لئے کہ اس کی غذا کا سامان ہماری روح اور جسم اور اس کی پیاس کا سامان ہمارے آنسو اور خون ہیں۔ پھر بھی اس کا پیٹ اچھی طرح بھرتا ہے' نہ پیاس بجھتی ہے۔

رات کے ابتدائی حصہ میں بچہ ماں کو پکار کر کہتا ہے:

"اماں مجھے بھوک لگ رہی ہے۔"

اور ماں جواب دیتی ہے:

"بیٹا! تھوڑی دیر صبر کر!!"

آدھی رات کو بچہ پھر ماں کو آواز دیکر کہتا ہے۔

"اماں میں بھوکا ہوں' مجھے روٹی کھلا دو!"

اور وہ جواب میں کہتی ہے۔

"بیٹا! میرے پاس روٹی نہیں ہے!"

پچھلی رات کو موت' ماں اور اس کے بچہ کے پاس سے گذرتی ہے اور اپنے ہاتھوں سے ان کے چپت رسید کرتی ہے' وہ سڑک کے کنارے سو جاتے ہیں' لیکن موت' دور افق پر نگاہیں جمائے چلتی رہتی ہے۔

صبح کو مرد رزق کی تلاش میں کھیت کی طرف جاتا ہے' لیکن وہاں خاک اور پتھر کے سوا کچھ نہیں پاتا۔

دوپہر کو وہ تھکا ماندہ خالی ہاتھ اپنے بیوی بچوں کے پاس آجاتا ہے اور جب شام ہوتی ہے تو موت مرد اور اس کے بیوی بچوں کے پاس سے گذرتی ہے' اور انہیں سوتا ہوا دیکھ کر خوش ہوتی ہے' اور پھر دور افق پر نگاہیں جمائے چلی جاتی ہے۔

صبح کو کسان اپنی جھونپڑی سے نکلتا ہے اور اپنی ماں بہنوں کا گہنا لیکر شہر میں جاتا ہے' کہ اسے فروخت کر کے گیہوں خریدے' لیکن جب سہ پہر کو وہ ایسی حالت میں کہ اس کے پاس سامان خورد و نوش ہوتا ہے نہ گہنا' اپنے گاؤں واپس آتا ہے تو دیکھتا ہے کہ ماں بیٹیاں سو رہی ہیں' مگر ان کی نگاہیں ایک موہوم نقطہ پر جمی ہیں' اس پرندہ کی طرح جسے صیاد کے تیر نے گرا لیا ہو' وہ اپنے بازو کبھی آسمان کی طرف اٹھاتا ہے کبھی زمین کی طرف گراتا ہے' شام کو موت' کسان اور اس کی ماں بہنوں کے پاس سے گذرتی ہے اور انہیں سوتا دیکھ کر مسکراتی ہے پھر دور افق پر نگاہیں جمائے چلی جاتی ہے۔

رات کی تاریکیوں میں ---- اور رات کی تاریکیوں کی کوئی حد و نہایت نہیں ہے ---- اے روشنی میں چلنے پھرنے والو! ہم تمہیں پکارتے ہیں۔ لیکن کیا تم ہماری پکار سنتے ہو۔؟

ہم نے اپنے مردوں کی روحوں کو پیغامبر بنا کر تمہارے پاس بھیجا' لیکن جو کچھ انہوں نے کہا' کیا وہ تمہارے دماغوں میں محفوظ ہے؟

ہم نے مشرقی ہواؤں کو اپنے انفاس سے گراں بار کیا' لیکن کیا وہ ہوائیں تمہارے دور دراز ساحلوں تک پہنچیں اور انہوں نے اپنا بھاری بوجھ تمہارے سامنے رکھا؟

کیا تم نے ہماری مصیبت کا اندازہ کر کے ہمیں اس سے نجات دلانے کی کوشش کی؟

یا خود کو امن و سلامتی میں پاکر کہہ دیا۔

"روشنی کے رہنے والے ظلمت زادوں کے ساتھ اس کے سوا اور کیا سلوک کر سکتے ہیں کہ مردوں کو بلائیں اور ان سے کہیں کہ ان چلتی پھرتی لاشوں کو دفن کر دو' تاکہ مشیت الٰہی کی تکمیل ہو جائے!"

لیکن کیا تم اپنے تئیں موجودہ سطح سے بلند نہیں کر سکتے' تاکہ خدا تم کو اپنی مشیت بنا لے اور تم ہمارے معاون و مددگار ہو جاؤ؟

رات کی تاریکیوں میں ہم ایک دوسرے کو پکارتے ہیں!

رات کی تاریکیوں میں بھائی اپنے بھائی کو' ماں اپنے بیٹے کو' شوہر اپنی بیوی کو اور عاشق اپنی محبوبہ کو پکارتا ہے' اور جب جاری آوازیں آپس میں گھل مل کر فضا کے جگر کی طرف بلند ہوتی ہیں تو موت ایک لحہ کے لئے ٹھہر کر ہم پر ہنستی ہے اور ہمارا مذاق اڑاتی ہے' پھر دور افق پر نگاہیں جمائے چلی جاتی ہے!

رنگے ہوئے لیڈر

1

سلمان آفندی

پینتیس سالہ مرد—— خوش پوشاک' خوش قامت' چڑھی ہوئی مونچھیں' پاؤں میں چمک دار جوتا اور ریشمی جرابیں' منہ میں قیمتی سگریٹ' اور ہاتھ میں حسین و نازک بید' جس کی سنہری موٹھ' اعلیٰ درجہ کے جواہر سے مرصع' عالی شان ہوٹلوں میں کھانا کھاتا ہے' جہاں شہر کے بڑے بڑے لوگ جمع ہوتے ہیں اور شاندار گاڑی میں مشہور تفریحی مقامات کی سیر کو جاتا ہے' جسے دو نہایت نفیس گھوڑے کھینچتے ہیں۔

سلمان آفندی کو اپنے باپ سے ایک کوڑی ورثہ میں نہیں ملی۔ اللہ بخشے اس کا باپ ایک غریب اور مفلس آدمی تھا' جس نے کبھی تجارت کی نہ دولت کمائی' وہ حد درجہ سست اور کاہل تھا' کام سے نفرت کرتا اور اسے اپنے مرتبہ سے گری ہوئی چیز سمجھتا' ہم نے ایک مرتبہ خود اس کی زبان سے سنا ہے کہ

"میرا جسم اور میری فطرت کام سے میل نہیں کھاتی' کام ان لوگوں کے لئے پیدا کیا گیا ہے' جن کی فطرت بے کیف اور جسم کمزور ہیں۔"

تو پھر سلمان آفندی نے اتنی دولت کہاں سے حاصل کی اور وہ کونسا جادوگر تھا جس نے مٹی کو اس کی مٹھیوں میں سونے چاندی سے بدل دیا؟

یہ رنگے ہوئے گیدڑوں کے بے شمار رازوں میں سے ایک راز ہے جو عزرائیل نے ہمیں بتایا اور اب ہم تمہیں بتاتے ہیں:

پانچ برس ہوئے ہیں کہ سلمان آفندی نے سیدہ فہیمہ سے شادی کی سیدہ فہیمہ' مرحوم پطرس نعمان تاجر کی بیوہ ہے' جو اپنی کوشش استقلال اور دیانت کے لئے اپنے تمام ہمسروں میں شہرت رکھتا تھا' اس وقت سیدہ فہیمہ کی عمر پینتالیس سال ہے اور اس

کے جذبات کی عمر سولہ سال' وہ ہرچند اپنے بالوں میں اور آنکھوں میں سرمہ لگاتی ہے' اپنے چہرہ کو کریم اور پاؤڈر سے چمکاتی ہے' لیکن سلمان آفندی آدھی رات سے پہلے کبھی گھر میں نہیں گھستا' شاید ہی کوئی گھڑی ہوتی ہو' جب وہ اپنے شوہر کی تیز تیز نظروں اور نالائم کلمات سے محفوظ رہتی ہو' جس کی وجہ یہ ہے کہ سلمان آفندی نے اس کی طرف سے آنکھیں بند کرلی ہیں اور اس دولت کو دونوں ہاتھوں سے لٹا رہا ہے' جو اس کے پہلے شوہر نے خون پسینہ ایک کر کے جمع کی تھی۔

۲

ادیب آفندی

ستائیس سالہ جوان ـــــ لمبی ناک' چھوٹی چھوٹی آنکھیں' ناپاک چہرہ' ہاتھ روشنائی میں بھرے ہوئے' ناخن میل سے اٹے ہوئے' جسم پر پھٹے پرانے کپڑے جن پر جابجا تیل' چکنائی اور قہوے کے چھلتے۔

اس مکروہ حالت کا سبب' ادیب آفندی کی غربت و محتاجی نہیں' غفلت و بے پروائی ہے' وہ مصروفیت ہے جس نے بلند مسائل' معنوی امور اور الہیاتی مباحث کی تحقیق و تلاش کے سلسلہ میں اس کے دماغ کو گھیر رکھا ہے' چنانچہ ہم نے خود اسے ابن جندی سے کہتے سنا ہے کہ

"طبیعت دو چیزوں کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتی۔"

یعنی ادیب ایک وقت میں انشا پردازی اور پاکیزگی' دونوں کا خیال نہیں رکھ سکتا۔

ادیب آفندی بہت بولتا ہے اور ہر وقت بولتا ہے۔ اس کے نزدیک بولنا دنیا کی ہر چیز سے افضل ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ اس نے بیروت کے کسی مدرسہ میں دو سال تک ایک مشہور استاد سے علم بدیع کا درس لیا ہے اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اس نے بہت سی نظمیں کہی ہیں' مضامین لکھے ہیں اور کتابیں مرتب کی ہیں' جو مختلف اسباب کی بنا پر' جن میں سب سے بڑا سبب عربی صحافت کا انحطاط اور پڑھنے والوں کی جہالت ہے' ہنوز طبع و اشاعت سے محروم ہیں۔

کچھ دنوں سے ادیب آفندی اپنی توجہ قدیم و جدید فلسفہ کی باریکیوں پر صرف کر رہا ہے' وہ ایک ہی وقت میں سقراط کا بھی عقیدت مند ہے اور نٹشے کا بھی۔ وہ اگسٹس کے ملفوظات بھی اسی شوق و دلچسپی کے ساتھ پڑھتا ہے جس شوق و دلچسپی کے ساتھ والٹیر اور ژان ژاک روسو کی کتابیں۔

ہم پہلی مرتبہ اس سے ایک شادی میں ملے تھے' لوگ اس کے چاروں طرف' نغمہ و شراب میں مست تھے اور وہ اپنے مشہور بلیغ انداز میں شکسپیئر کے ڈرامہ ہملٹ پر تبصرہ کر رہا تھا۔

دوسری مرتبہ ہم نے اسے ایک رئیس کے جنازہ میں دیکھا' لوگ اس کے ہم پہلو' غمگین چہرے بنائے' سر جھکائے آہستہ آہستہ چل رہے تھے اور وہ اپنی مخصوص فصیح البیانی کے ساتھ فارض کی غزلوں اور ابو نواس کی خمریات پر بحث کر رہا تھا۔

ان حالات میں ادیب آفندی کیوں جی رہا ہے' پرانی کتابوں اور بوسیدہ اوراق میں اپنے شب و روز برباد کرنے سے اس کا کیا مقصد ہے' وہ ایک گدھا کیوں نہیں خرید لیتا اور اسے کرایہ پر چلا کر دولت مند کرایہ خواروں کی صف میں شامل کیوں نہیں ہو جاتا؟

یہ رنگے ہوئے گیدڑوں کے بے شمار رازوں میں سے ایک راز ہے جو عطر پول نے ہمیں بتایا اور ہم اب تمہیں بتاتے ہیں

تین برس ہوئے کہ ادیب آفندی نے پادری یوحنا شمعون کی شان میں ایک قصیدہ لکھا اور حبیب بک سلوان کے گھر میں اس کے سامنے پڑھا' قصیدہ ختم ہو جانے کے بعد پادری نے اسے بلایا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مسکراتے ہوئے کہا:

"بیٹا! خدا تجھے زندہ و سلامت رکھے! تو بڑا نکتہ رس شاعر اور فطرت شناس ادیب ہے' میں تجھ جیسے باکمالوں پر فخر کرتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ تو ایک دن مشرق کی بڑی شخصیتوں میں شمار کیا جائے گا۔"

اس دن سے لیکر آج تک ادیب آفندی اپنے باپ' چچا اور ماموں کی تحسین و ستائش کا مرکز ہے۔ وہ فخر کے ساتھ اس کا ذکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں:

"کیا پادری یوحنا شمعون نے ارشاد نہیں فرمایا تھا کہ وہ ایک دن مشرق کی بڑی شخصیتوں میں شمار کیا جائے گا؟"

۴۳

فرید دعیس

چالیس سال کا پختہ عُمر انسان۔۔۔۔۔ لمبا قد' چھوٹا سا سر' بڑا دہانہ' تنگ پیشانی' اکڑی ہوئی گردن کے ساتھ' سینہ نکال کر آہستہ آہستہ چلتا ہے' اس کی رفتار اس اونٹ کی رفتار سے متوازن ہے' جس کی پیٹھ پر محمل ہو' جب وہ بلند آواز اور پروقار آواز میں گفتگو کرتا ہے تو انجان آدمی یہ سمجھتا ہے کہ حکومت کا کوئی وزیر لوگوں کے معاملات سدھارنے اور رعایا کی تکلیفیں دور کرنے میں مصروف ہے۔

فرید بک کو اس کے سوا کوئی کام نہیں کہ محفلوں میں صدر مقام پر بیٹھے اور اپنے بزرگ خاندان کے کارنامے گنوائے یا اپنی عالی نسبی کی خصوصیات بیان کرے۔ وہ نپولین اور عنترہ عبسی جیسے بہادروں اور بڑے لوگوں کے حالات اور کارنامے بہت دلچسپی سے سناتا ہے' نفیس اسلحہ جمع کرنے کا اسے خاص شوق ہے وہ اس کے گھر کی دیواروں پر ترتیب سے چنے ہوئے بھی ہیں۔ لیکن وہ ان کو استعمال کرنا نہیں جانتا۔

اس کا قول ہے کہ

"اللہ نے انسان کو دو گروہوں میں تقسیم کیا ہے' ایک گروہ خدمت کرنے کے لئے ہے اور دوسرا گروہ خدمت لینے کے لئے۔"

اس کا دوسرا قول ہے کہ

"خاندان ایک اڑیل ٹٹو ہے' جو اس وقت تک نہیں چلتا' جب تک کوئی اس کی پیٹھ پر سوار نہ ہو جائے۔"

یہ تیسرا قول بھی اسی سے منسوب ہے کہ

"قلم کمزوروں کے لئے ہے اور تلوار قوت والوں کے لئے۔"

اچھا تو وہ اسباب کیا ہیں؟ جن کی بناء پر فرید بک اپنی بڑائی کے لئے شیخیاں مارتا ہے؟ ازراہ غرور اپنی عالی نسبی کا ڈھنڈورا پیٹتا ہے' اور خود بینی و خود پسندی کا اظہار کر کے لوگوں پر اپنی فوقیت جتاتا ہے۔

یہ رینگتے ہوئے گیدڑوں کے بے شمار رازوں میں سے ایک راز ہے جو سلطائیل نے ہمیں بتایا اور ہم اب تمہیں بتاتے ہیں۔

انیسویں صدی کے ثلث اول میں سلطان بشیر شہابی اپنے امیروں کے ساتھ لبنان کی وادیوں میں سیر و تفریح کے لئے آیا' اتفاق کی بات جب وہ اس گاؤں کے قریب سے گذرا جس میں فرید بک دعیس کا دادا منصور بک دعیس رہتا تھا تو دھوپ تیز ہو گئی اور سورج کی باریک باریک کرنیں زمین کا سینہ چھیدنے لگیں۔ سلطان گرمی کی تاب نہ لا کر گھوڑے سے اتر پڑا اور ساتھیوں سے کہا:

"آؤ! تھوڑی دیر اس بلوط کے سائے میں دم لے لیں!!"

جب منصور دعیس کو اس کا علم ہوا تو اس نے اپنے ہمسایہ کسانوں کو بلایا اور انہیں خبر دی کہ سلطان ان کے گاؤں کے قریب رونق افروز ہے' یہ سن کر وہ سب کے سب انجیر اور انگور کے خوان اور دودھ' شراب اور شہد کی ٹھلیاں لئے منصور کے پیچھے بلوط کے درخت کی طرف چلے جہاں سلطان بشیر شہابی قیام فرما تھا' منزل مقصود پر پہنچ کر' منصور دعیس آگے بڑھا اور عبائے شاہی کو بوسہ دیا' پھر اس کے قدموں میں ایک بکرا ذبح کیا اور بلند آواز میں کہا:

"یہ سب جہاں پناہ کے مراحم خسروانہ کا اثر ہے!"

سلطان نے اظہار خوشنودی کے طور پر اسے خلعت عطا فرمایا اور کہا:

"تم آج سے اس گاؤں کے سردار ہو' جسے ہماری خصوصی عنایتیں نوازتی رہیں گی' جاؤ! مابدولت نے تمہارے گاؤں والوں پر اس سال شاہی ٹیکس معاف فرما دیا۔"

امیر کے چلے جانے کے بعد' اس رات کو گاؤں کے تمام آدمی سردار منصور دعیس کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسے اپنے رنج و راحت کا آقا تسلیم کر لیا۔۔۔۔۔ اللہ ان سب پر رحم کرے!

رینگتے ہوئے گیدڑوں کے اور بھی بہت سے راز ہیں جن سے شیطان ہمیں دن رات آگاہ کرتے رہتے ہیں اور ہم اس سے پہلے کہ زمانہ ہمیں فضائے نیلگوں کے اس پار پہنچا دے' تمہیں ان سے آگاہ کریں گے۔ لیکن اس وقت' رات آدھی ہو چکی ہے اور بیداری نے ہماری پلکوں کو تھکا دیا ہے۔ اس لئے ہمیں سونے کی اجازت دو' بہت ممکن ہے خوابوں کی پری ہماری روح کو اس عالم میں لے جائے' جو اس عالم سے کہیں زیادہ پاک و صاف ہے۔

تارک الدنیا

میں جوانی کے عالم میں ایک مرتبہ ایک تارک الدنیا شخص سے ملا۔ جو پہاڑیوں سے پرے ایک خاموش اور پرسکون وادی میں رہتا تھا۔ ہم نیکی کی حقیقت پر گفتگو کر رہے تھے کہ ایک تھکا ماندہ ڈاکو پہاڑی سے لنگڑاتا ہوا آیا۔ جب وہ کنج کے پاس پہنچا تو وہ درویش کے سامنے جھکا اور بولا۔ "سائیں بابا کیا مجھے آرام ملے گا۔ میں گناہوں سے دبا ہوا ہوں۔"

درویش نے جواب دیا ـــــ "میں خود بھی اپنے گناہوں سے دبا ہوا ہوں۔"

ڈاکو نے کہا ـــــ "لیکن میں چور اور لٹیرا ہوں۔"

درویش نے جواب دیا۔ "میں خود بھی ایک چور اور لٹیرا ہوں۔"

ڈاکو نے کہا۔ "لیکن میں خونی ہوں اور لاتعداد انسانوں کا خون میرے کانوں میں چیخ رہا ہے۔"

درویش بولا۔ "میں خود بھی ایک قاتل ہوں۔ اور بے شمار انسانوں کا خون میرے کانوں میں چیخ رہا ہے۔"

ڈاکو نے کہا۔ "میں نے ان گنت جرم کئے ہیں۔"

درویش کہنے لگا۔ "میں نے خود بھی لاتعداد جرم کئے ہیں۔"

تب وہ ڈاکو اٹھ کھڑا ہوا۔ اور درویش کو دیکھا۔ اور اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی تھکاوٹ تھی۔ اور جب وہ ہم سے الگ ہوا۔ تو وہ پہاڑی سے جست لگاتا گیا۔

میں درویش سے مخاطب ہوا اور کہا ـــــ "آپ نے خود کو ناکردہ گناہوں کا مجرم کیوں ٹھہرایا۔ کیا آپ کا یہ خیال نہیں کہ یہ آدمی آپ سے بدظن ہو کر گیا ہے۔"

درویش نے جواب دیا ـــــ "یہ درست ہے۔ کہ اب اسے مجھ پر اعتقاد نہیں رہا۔ لیکن وہ یہاں سے بے حد مطمئن گیا ہے۔"

اس وقت ہم نے ڈاکو کو کچھ فاصلے پر گاتے ہوئے سنا۔ اس کے گیت کی گونج وادی کو مسرت سے لبریز کر رہی تھی۔

بیوہ کی دعا

دن پر غالب آنے کے لئے' جس میں وادی قادیشا(۱) کے آس پاس کے گاؤں میں مسلسل برف باری ہوتی رہی تھی' رات نے نہایت تیزی سے حملہ کر دیا' اور کھیتوں اور پہاڑیوں کو ایک سفید و سادہ صفحہ بنا دیا' جس پر ہوا پہلے کچھ لکھتی اور پھر مٹا دیتی تھی' جس سے آندھیوں کے جھکڑ' غضب ناک فضا کو دہشت انگیز فطرت سے آمیز کرتے ہوئے کھیل رہے تھے۔

انسان مکانوں میں جا چھپے تھے اور مویشی باڑوں میں' ہر ذی حیات حرکت و عمل سے عاجز تھا اور سوائے خلش آفریں سردی' بے پناہ خنکی' خوفناک و سیاہ رات اور ہولناک و طاقت ور موت کے' کچھ باقی نہ رہا تھا۔

گاؤں کی آبادی سے الگ' ایک تنہا مکان میں' ایک عورت' انگیٹھی کے سامنے بیٹھی' اونی چادر بن رہی تھی' پہلو میں اس کا اکلوتا بچہ تھا' جو کبھی آگ کے شعلوں کو دیکھتا تھا اور کبھی اپنی ماں کے پرسکون چہرہ کو۔ یکایک آندھی تیز ہو گئی اور مکان کے در و دیوار لرزنے لگے۔ بچہ ڈر کر اپنی ماں سے اور قریب ہو گیا' تاکہ اس کی آغوش شفقت میں عناصر کی غضبناکی سے محفوظ ہو جائے ماں نے اسے اپنے سینہ سے چمٹا کر پیار کیا اور اپنے گھٹنوں پر بٹھا کر کہنے لگی:

"بیٹا! ڈرو نہیں' فطرت انسان کو اس کی بے بضاعتی کے مقابلہ میں اپنی عظمت اور اس کی کمزوری کے مقابلہ میں اپنی طاقت کا مظاہرہ کر کے نصیحت کرنا چاہتی ہے۔ نہ ڈر! میرے بچے! کہ زمین پر گری ہوئی برف' آسمان پر چھائے ہوئے بادلوں اور فضا کو تلپٹ کر دینے والی آندھی کے جھکڑوں کے پس پردہ ایک عام اور برگزیدہ روح ہے' جو میدانوں اور پہاڑوں کی ضروریات کو جانتی ہے' ہر چیز کے پس پردہ ایک روزن ہے' جس میں سے یہ روح انسان کی بے بضاعتی کو بہ نگاہ رحمت و شفقت دیکھتی ہے۔ خوف نہ کھا! میرے کلیجہ

کے ٹکڑے! کہ فطرت' جو بہار میں مسکراتی' گرمیوں میں قہقہے لگاتی اور خزاں میں آہیں بھرتی ہے' اب رونا چاہتی ہے تاکہ زمین کے انتہائی طبقہ میں پڑی ہوئی زندگی اس کے سرد آنسوؤں سے اپنی پیاس بجھا لے۔ میرے بچے! سو جا! کل جب تو بیدار ہو گا تو آسمان کو صاف اور میدانوں کو برف کی سفید چادر اوڑھے دیکھے گا جس طرح موت سے مقابلہ کے بعد روح پاکیزگی کا لباس پہن لیتی ہے۔ سو جا! میرے اکلوتے بچے! تیرا باپ اس وقت ہمیں ابدیت کی نزہت گاہوں سے دیکھ رہا ہے۔ مبارک ہے وہ آندھی اور وہ برفباری' جو ہمیں ان غیرفانی روحوں کی یاد سے ہم آغوش کر دے! میرے پیارے! سو جا! بہار آنے پر تو انہیں عناصر سے' جو آج نہایت شدت سے آپس میں دست و گریباں ہیں' خوبصورت پھول توڑے گا جس طرح انسان الم ناک دوری حوصلہ فرسا صبر اور ہلاکت خیز مایوسی کے بعد محبت کا پھل پاتا ہے۔ میری آنکھوں کے نور! سو جا! سو جا! کہ شیریں خواب رات کی ہیبت اور سردی کی شدت سے بے خوف ہو کر' تجھ تک آئیں گے۔"

بچہ نے اپنی ماں کی طرف دیکھا' نیند نے اس کی آنکھوں کو سرگیں بنا دیا تھا۔ وہ کہنے لگا!

"اماں! نیند نے میری پلکوں کو بوجھل بنا دیا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہیں میں صبح کی نماز پڑھنے سے پہلے ہی نہ سو جاؤں۔"

مہربان ماں نے اسے اپنے گلے سے لگا لیا اور اشک آلود آنکھوں سے اس کے چہرہ کو دیکھنے لگی' جس پر فرشتوں کی معصومیت کھیل رہی تھی' اس نے کہا:

"میرے بچے! میرے ساتھ دعا مانگ: یارب! فقیروں پر رحم کر! انہیں بے پناہ سردی کی سنگدلی سے بچا! اور ان کے عریاں جسموں کو اپنے ہاتھوں سے ڈھانپ!!!

جھونپڑوں میں سوئے ہوئے یتیموں اور برف کی تیز انگلی کو دیکھ! جو ان کے جسموں کو چھیدے ڈالتی ہے!

یارب! بیواؤں کی فریاد سن! جو سڑکوں پر موت کے چنگل اور سردی کے پنجوں میں گھری کھڑی ہیں۔

یارب! اپنا ہاتھ سرمایہ دار کے دل کی طرف بڑھا' اور ان کی چشم بصیرت کو وا کر! تاکہ وہ کمزوروں اور مظلوموں کی تباہ حالی دیکھ سکیں!

یارب! ان بھوکوں پر مہربانی فرما! جو اس تیرہ و تار رات میں دروازوں کے سامنے کھڑے ہیں اور پردیسیوں کی غریب الوطنی پر رحم کھا کر گرم مسکنوں کی طرف ان کی رہنمائی کر!!

یارب! چھوٹی چھوٹی چڑیوں کی طرف دیکھ! اور اپنے دائیں ہاتھ سے ان درختوں کی حفاظت کر!! جو ہوا کی تندی سے خائف ہیں۔

یارب! ایسا ہی کر' کہ تجھ میں سب قدرت ہے!"

جب نیند بچے سے ہم آغوش ہو گئی تو ماں نے اسے' اس کے بستر پر لٹا دیا اور کانپتے ہونٹوں سے اس کی پیشانی کا بوسہ لیا۔ اس کے بعد اٹھی اور انگیٹھی کے سامنے بیٹھ کر' اس کے لئے اونی چادر بننے لگی۔

---

(1) وادی قادیشا' یعنی مقدس لوگوں کی وادی' اس نام سے اس لئے موسوم ہے کہ زاہدوں کا ملجاء اور ان تجرد پسندوں کا ماوی ہے جو دنیا کی بدبختیوں اور سماج کے ہنگاموں سے اکتا کر بھاگتے ہیں۔ یہاں انہیں ایک عام سناٹا اور وہ غار بہ آسانی مل جاتے ہیں۔ جنہیں دست فطرت زمین کا سینہ چیر کر بناتی ہے۔ یہ وادی اس قدر گہری ہے کہ اگر سورج کی شعاعیں چاہیں بھی تو بیک وقت اس کی پنہائیوں کا احاطہ نہیں کر سکتیں اسے لبنان کے سینہ کا گہرا زخم سمجھنا چاہیے---- وہ گہرا زخم جو نہایت گہری دوستی کے بعد' زمانہ کے ہاتھوں اسے پہنچا۔

قبرستان

کل———— میں شہر کے ہنگاموں سے اُکتا کر' پرسکون سبزہ زاروں میں ٹہلنے کے لئے نکلا' ایک بلند پہاڑی پر پہنچ کر' جسے فطرت نے حسین ترین لباس پہنا رکھا تھا' ٹھہر گیا۔ شہر اپنی ساری بلند عمارتوں اور عالیشان محلوں کے ساتھ' کارخانوں کے دھوئیں کے کثیف بادلوں میں دبا ہوا نظر آ رہا تھا۔

میں بیٹھ گیا اور دور سے انسان کی عملی زندگی کا جائزہ لینے لگا۔ مجھے وہ سرتاپا "مشقت" نظر آئی۔ میں نے اپنے دل میں فیصلہ کر لیا کہ اب انسان کی اس بناوٹی زندگی پر غور نہ کروں گا اور اپنا رخ اس سبزہ زار کی طرف کر لیا؟ جو عظمت خداوندی کی جلوہ گاہ تھی۔ میں نے دیکھا: اس سبزہ زار کے وسط میں ایک قبرستان ہے' جس کی مرمریں قبریں سرو کے درختوں سے گھری ہوئی نظر آ رہی ہیں————

وہاں———— زندوں اور مردوں کی بستی کے درمیان———— میں ایک بستی کی مسلسل کش مکش اور دائمی حرکت اور دوسری بستی پر چھائی ہوئی خاموشی اور مستقل سکون کے متعلق بیٹھا سوچ رہا تھا۔

ایک طرف امیدیں تھیں اور ناامیدیاں' محبت تھی اور نفرت' امیری تھی اور غریبی' اعتقاد تھا اور بے اعتقادی!

اور دوسری طرف مٹی میں مٹی تھی' جس کے باطن کو ظاہر سے بدل کر' فطرت اس سے نباتات' پھر حیوانات پیدا کرتی ہے اور یہ سب کچھ رات کی خاموشی میں ہو جاتا ہے۔

میں اپنے انہی افکار میں گم تھا کہ میری توجہ ایک آہستہ رو' جم غفیر نے اپنی طرف مبذول کر لی۔ آگے آگے بینڈ تھا۔ جس کے غم انگیز نغموں سے فضا پر اداسی چھائی گئی تھی۔

یہ ایک بہت بڑا ہجوم تھا جس میں عظمت و اقتدار کے دیوتا شامل تھے' ایک عظیم المرتبت رئیس کا جنازہ تھا———— ایک مردہ کی ہڈیاں تھیں' جس کے پیچھے پیچھے زندہ

لوگ' روتے' واویلا مچاتے اور فضا کو اپنے نالہ و ماتم سے گراں بار کرتے' چلے آ رہے تھے۔

جنازہ قبرستان پہنچا۔ پادری جمع ہوئے اور عود و لوبان سلگا کر مردہ کے حق میں دعائے مغفرت کی۔ ادھر بینڈ بجانے والوں نے' ایک طرف ہو کر' غم کا بینڈ بجایا۔ اس کے بعد خطیب آگے بڑھے اور نہایت فصیح و بلیغ الفاظ میں مرنے والے پر ماتم کیا' پھر شاعروں نے اپنے اپنے مرثیے پڑھے' جن میں سوز و گداز کے ساتھ ساتھ' معنوی لطافتیں بھی تھیں۔ یہ سب کچھ اُکتا دینے والی طوالت کے بعد ختم ہوا' اور مجمع رفتہ رفتہ اس قبر سے رخصت ہو گیا' جس کے بنانے میں گورکنوں اور انجینئروں نے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کی تھی اور جس پر ہنرمند ہاتھوں کے گوندھے ہوئے ہار پڑے تھے۔

لوگ شہر کی طرف واپس چلے گئے' لیکن میں دور سے یہ سب کچھ دیکھتا اور اس پر غور کرتا رہا۔

سورج ڈھل چکا تھا' چٹانوں اور درختوں کے سائے طویل ہو گئے تھے اور فطرت نے نور کا لباس اتارنا شروع کر دیا تھا۔ میں نے نگاہ اٹھائی اور دیکھا: دو آدمی ایک لکڑی کا تابوت اپنے کندھوں پر لئے چلے آ رہے ہیں۔ ان کے پیچھے ایک عورت ہے' جس کے جسم پر پھٹے پرانے کپڑے' گود میں ایک دودھ پیتا بچہ اور پہلو میں ایک کتا ہے' جو کبھی اس کی طرف دیکھتا ہے اور کبھی تابوت کی طرف۔

یہ ایک مفلس کا جنازہ تھا' جس کے پیچھے ایک اس کی بیوی تھی' جو یاس و نومیدی کے آنسو بہا رہی تھی' ایک اس کا بچہ تھا' جو اپنی ماں کو روتے ہوئے دیکھ کر رو رہا تھا' اور ایک اس کا وفادار کتا' جس کی رفتار سے اس کے رنج و غم کا اظہار ہوتا تھا۔

یہ لوگ قبرستان پہنچے اور تابوت کو ایک قبر میں اتار دیا' جو مرمریں قبروں سے بہت دور ایک گوشہ میں تھی۔ اس کے بعد وہ پراثر خاموشی کے ساتھ واپس ہوئے' کتا بار بار اپنے آقا کی آخری آرام گاہ کو دیکھ رہا تھا' یہاں تک کہ وہ سب درختوں میں روپوش ہو گئے۔

اس وقت میں نے شہر کی طرف دیکھ کر اپنے دل میں کہا:

"یہ دولت اور قوت والوں کے لئے ہے!"

پھر قبرستان کی طرف متوجہ ہو کر کہا:

"اور یہ بھی دولت اور قوت والوں کے لئے ہے!! پھر کمزوروں اور غریبوں کا وطن کہاں ہے؟ میرے معبود!"

یہ کہہ کر میں نے تہ بہ تہ بادلوں کی طرف دیکھا' جن کے کنارے سورج کی حسین شعاعوں سے سنہرے ہو گئے تھے۔ میرے دل سے آواز آئی:

"وہاں-------!"

کامل دنیا

اے گمشدہ روحوں کے خدا! تو جو خود دیوتاؤں میں کھویا ہوا ہے۔ میری آواز سن!

ہاں ہم دیوانی اور آوارہ روحوں کی نگرانی کرنے والی ہستی! میرے الفاظ پر توجہ فرما----!

میں ایک کامل قوم میں رہتا ہوں---- میں جو ایک غیر مکمل ہستی ہوں---- میں انسانیت کے پریشان اور منتشر عناصر کا مجموعہ ہوں۔

میں ایک کامل دنیا میں رہتا ہوں۔ جس کے قوانین اور ضوابط مکمل ہیں اور جن کے تصورات ضبط تحریر میں آ سکتے ہیں۔

اے خدا ان کی نیکیاں گنی ہوئی اور گناہ تلے ہوئے ہیں۔

ان کے علاوہ لاتعداد ایسی چیزیں جو شام کے دھندلکے میں گناہ اور ثواب سے ماورا ہیں شمار اور درج کی جاتی ہیں۔

یہاں دن رات چال چلن کے موسمی تغیرات میں تقسیم کئے جاتے ہیں اور انہیں خوب جانچ تول کر کڑے اصولوں کی زنجیر میں جکڑا جاتا ہے۔

کھانا---- پینا---- سونا اور اپنی عریانی کی پردہ پوشی کرنا---- کام کرنا--- کھیلنا---- گانا---- ناچنا اور گھڑیال بجتے ہی چپ چاپ سو جانا۔

صرف ایک مقررہ شدت کے ساتھ غور و فکر کرنا---- افق کے اس پار ایک خاص ستارہ کے طلوع ہونے پر غور و فکر کا سلسلہ بند کر دینا۔

ایک زیر لب تبسم کے ساتھ اپنے پڑوسی کو لوٹ لینا۔

ہاتھ کو شان سے ہلا کر خیرات کرنا۔

کسی کی جان بوجھ کر تعریف کرنا۔

دوسروں پر انتہائی چالاکی سے الزام عائد کرنا۔

کسی شخص کی زندگی کو ایک ہی لفظ میں تباہ کر دینا ——— اور جب دن بھر کا کام تمام ہو جائے تو نہایت عیاری سے ہاتھ دھو لینا۔

ایک مضبوط ارادے کے ساتھ محبت کرنا ——— ہوشیاری سے کسی کو خوش کرنا ——— بن ٹھن کر خدا کی عبادت کرنا ——— بڑے تپاک سے شیطان کے ساتھ اتحاد کرنا ——— اور پھر سب کچھ بھول جانا۔

سوچ سمجھ کر کسی چیز کی تمنا کرنا۔

خندہ پیشانی سے ملول ہونا۔ اور پیالہ خالی کر دینا ——— تاکہ اسے کل پھر بھر دیا جائے۔

اے خدا! یہ تمام چیزیں پہلے ہی سے سوچی گئی ہیں ——— بڑی احتیاط کے ساتھ پیدا کی جاتی ہیں۔ اور ان کی بڑے اہتمام کے ساتھ نگہداشت کی جاتی ہے۔

حکومت کے قوانین کی آڑ میں ان کا تحفظ کیا جاتا ہے۔ مختلف ذرائع سے پاسبانی کی جاتی ہے اور آخر کار طے شدہ طریقے کے مطابق انہیں ذبح کر کے دفن کر دیا جاتا ہے اور ان کی خاموش قبروں پر بھی جو انسانی دلوں میں جاگزیں ہوتی ہیں۔ نشان لگا دیئے جاتے ہیں۔

یہ ہے ہماری کائنات، ہماری متمدن دنیا، جو عجائبات سے بھری ہوئی ہے۔

یہ ہے قادر مطلق کے باغ کا پختہ ثمر اور اس کی بہترین تمنا!

مگر اے خدا میں یہاں کیوں ہوں؟

میں جو ناکام خواہشوں کا ناقص بیج ہوں۔

ایک آوارہ طوفان ہوں۔

ایک ٹوٹے پھوٹے سیارے کا ٹکڑا جو ہواؤں میں پریشان ہے اور جو نہ مشرق کو تلاش کرتا ہے نہ مغرب کو۔

اے گمشدہ روحوں کے خدا! تو جو دیوتاؤں کے ہجوم میں گم ہے، بتا میں یہاں کیسا ہوں؟

جب میرا غم پیدا ہوا

جب میرا غم پیدا ہوا تو میں نے اسے بڑی محنت سے پالا اور اس کی بڑی احتیاط سے نگہداشت کی۔

میرا غم دوسری چیزوں کی طرح نشوونما پاکر توانا، خوبصورت اور بڑی بڑی عشرتوں سے معمور ہونے لگا۔

میں اور میرا غم ایک دوسرے سے پیار کرتے تھے اور اپنے گرد و پیش کی دنیا سے محبت کرتے تھے کیونکہ غم بہت رحم دل تھا اور میرا دل بھی بہت نرم خو تھا۔

اور جب میں اور میرا غم باتیں کرتے تو ہمارے دن ہوا کے پروں پر اڑے جاتے اور ہماری راتیں خوابوں سے بھرپور ہو جاتیں۔ کیونکہ میرے غم کی زبان فصیح تھی ——— اور میری زبان میرے غم کی ترجمانی میں بہت فصیح تھی اور جب میں اور میرا غم گاتے۔ تو ہمارے پڑوسی کھڑکیوں میں بیٹھ کر سنتے۔ کیونکہ ہمارے گیت سمندر کی طرح گہرے اور ہمارے نغمے عجیب و غریب یادداشتوں سے معمور ہوتے تھے۔

اور جب میں اور میرا غم اکٹھے چلتے تو لوگ ہمیں لطف و کرم کی نظر سے دیکھتے۔ اور آہستہ آہستہ ہمارے متعلق میٹھی میٹھی باتیں کرتے۔

لیکن بعض لوگ ایسے بھی تھے جو ہم پر شک کرتے تھے کیونکہ غم ایک گرانقدر چیز تھا ——— اور میں اس پر فخر کرتا تھا۔ لیکن میرا غم فانی چیزوں کی طرح مر گیا۔ اور میں اس کا ماتم کرنے کے لئے تنہا رہ گیا۔

اب جب میں بولتا ہوں، تو میرے الفاظ میرے کانوں پر گراں گزرتے ہیں۔

اور جب میں گیت گاتا ہوں تو میرے پڑوسی اس پر کان نہیں دھرتے۔

اور جب میں کوچوں میں سرگرداں پھرتا ہوں تو کوئی میری طرف نہیں دیکھتا۔

اب مجھے صرف نیند کے عالم میں یہ رحم سے بھری ہوئی آوازیں سنائی دیتی ہیں کہ "دیکھو یہ وہ شخص ہے جس کا غم فوت ہو چکا ہے۔"

———O———

جب میری مسرت پیدا ہوئی

جب میری مسرت پیدا ہوئی تو میں نے اسے اپنی گود میں اٹھالیا۔ اور چھت پر کھڑا ہو کر پکارنے لگا۔ "آؤ ــــ میرے پڑوسیو آؤ ــــ اور دیکھو آج میرے گھر مسرت پیدا ہوئی ہے ــــ آؤ اور اس مسرت انگیز چیز کو دیکھو' جو سورج کی روشنی میں ہنس رہی ہے۔"

لیکن جب میرا کوئی پڑوسی بھی میری مسرت کو دیکھنے کے لئے نہ آیا تو مجھے بے حد حیرت ہوئی۔ سات چند واڑوں تک میں ہر روز اپنی مسرت کا اظہار چھت پر کھڑے ہو کر بلند آواز سے کرتا رہا لیکن کسی نے میری آواز نہ سنی۔

اس طرح میں اور میری مسرت اکیلے رہ گئے نہ کسی نے اس کی تلاش کی اور نہ اسے کوئی دیکھنے کے لئے آیا۔ اس وجہ سے میری مسرت پژمردہ اور نڈھال ہو گئی۔ کیونکہ میرے سوا نہ کسی اور دل نے اس کی دلجوئی کی اور نہ کسی دوسرے کے ہونٹوں نے اس کے ہونٹوں کو چوما۔

آخرکار میری مسرت تنہائی کے باعث فنا ہو گئی۔

اور اب میں اپنے مرحوم غم کی یاد میں اپنی گزری ہوئی مسرت کو یاد کرتا ہوں لیکن یہ یاد ایک خزاں رسیدہ پتے کی طرح ہے جو ہوا میں زیر لب کچھ کہتا ہے اور پھر ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جاتا ہے۔

ــــــــ O ــــــــ

دو عالم

ایک شہر میں دو عالم رہتے تھے جو آپس میں شدید اختلافات رکھتے تھے اور ایک دوسرے کی قابلیت کا مضحکہ اڑاتے تھے' ان میں سے ایک دہریہ تھا اور دوسرا خدا پرست۔

ایک دن دونوں بازار میں ملے اور اپنے اپنے معتقدوں کی موجودگی میں خدا کے وجود اور عدم وجود پر بحث کرنے لگے۔ گھنٹوں مناظرہ کرنے کے بعد وہ ایک دوسرے سے جدا ہوئے۔

اسی شام دہریہ مسجد میں گیا اور اپنے سابقہ گناہوں کی معافی کے لئے خدا سے التجا کی۔

دوسرے عالم نے فوراً اپنی کتابیں جلا دیں۔ کیونکہ اب وہ ایک دہریہ بن چکا تھا۔

ــــــــ O ــــــــ

مصلوب

میں نے لوگوں سے چلا کر کہا۔ "میں سولی پر چڑھوں گا۔۔۔"

انہوں نے کہا۔۔۔۔ "ہم تمہارا خون اپنی گردن پر کیوں لیں۔۔۔"

میں نے جواب دیا۔۔۔۔ "تم دیوانوں کو مصلوب کئے بغیر کیسے ترقی کر سکتے ہو۔۔۔؟"

انہوں نے میری بات مان لی۔ اور مجھے مصلوب کر دیا۔۔۔ اور مصلوبیت نے مجھے مطمئن کر دیا۔

اور جب میں سولی پر لٹک رہا تھا تو انہوں نے مجھے دیکھنے کے لئے اپنے سر اوپر اٹھائے۔ اس طرح وہ سربلند ہو گئے۔ کیونکہ اس سے پہلے ان کا سر کبھی اوپر نہ اٹھا تھا۔

لیکن جب وہ میری طرف سر اٹھا کر دیکھ رہے تھے۔ تو ایک نے پوچھا۔۔۔ "تم کس چیز کا کفارہ ادا کر رہے ہو؟"

دوسرا چلایا۔۔۔۔ "تم نے کس مقصد کے لئے اپنی جان قربان کی۔۔۔۔؟"

تیسرے نے کہا۔۔۔۔ "کیا تو خیال کرتا ہے کہ تو اس قیمت پر حیات جاوداں حاصل کر لے گا؟"

چوتھے نے کہا۔۔۔۔ "دیکھو وہ کیسے مسکرا رہا ہے۔ کیا کوئی شخص اس قدر ایذا کو معاف کر سکتا ہے۔۔۔؟"

میں نے ان سب کو جواب دیتے ہوئے کہا۔

"تم صرف اتنا ہی یاد رکھو۔۔۔ کہ میں مسکراتا تھا' میں نے کفارہ ادا نہیں کیا' قربانی نہیں دی' اور نہ میں شہرت چاہتا ہوں تم نے کوئی ایسا قصور نہیں کیا۔ جسے میں معاف کروں' میں پیاسا تھا اور میں نے تم سے التجا کی کہ تم میرا خون مجھے پلا دو' کیونکہ ایک دیوانے کی پیاس اس کے خون کے سوا اور کسی چیز سے نہیں بجھ سکتی۔ میں گونگا تھا اور

دہان زخم پیدا کرنے کے لئے گھاؤ چاہتا تھا میں تمہارے لیل و نہار میں مقید تھا۔ اور میں نے بہتر دنوں اور راتوں کے لئے دروازہ تلاش کیا' اب میں جاتا ہوں جس طرح دوسرے مصلوب جا چکے ہیں۔ اور یہ نہ سمجھنا کہ ہم دار پر چڑھنے سے اکتا چکے ہیں کیونکہ ہم اس سے بڑی زمینوں اور بڑے آسمانوں کے درمیان اس سے زیادہ ہجوم کے ہاتھوں بار بار سولی چڑھائے جائیں گے۔"

بڑا سمندر

میں اور میری روح بڑے سمندر پر نہانے کے لئے گئے۔ تو ہم ایک پوشیدہ اور تنہا مقام تلاش کرنے لگے۔ لیکن جونہی ہم روانہ ہوئے۔ ہم نے ایک چٹان پر ایک آدمی کو بیٹھے دیکھا۔ جو اپنے تھیلے میں سے چٹکی چٹکی نمک نکال کر سمندر میں پھینک رہا تھا میری روح نے کہا۔

"یہ شخص قنوطی ہے۔ آؤ یہ جگہ چھوڑ دیں۔۔۔۔ ہم یہاں نہیں نہا سکتے۔۔۔"

ہم آگے بڑھتے گئے۔ حتیٰ کہ ہم ایک ٹاپو کے پاس پہنچے وہاں ہم نے ایک آدمی کو سفید چٹان پر کھڑے دیکھا اس کے ہاتھ میں ایک جڑاؤ ڈبہ تھا۔ جس میں سے وہ کھانڈ نکال کر سمندر میں پھینک رہا تھا۔

میری روح نے کہا۔ "یہ ایک رجائی ہے۔ اس لئے یہ بھی ہمارے برہنہ جسم کو نہ دیکھے۔۔۔۔"

ہم اور آگے بڑھے' تو ہم نے ساحل پر ایک آدمی کو دیکھا جو مری ہوئی مچھلیاں چن چن کر بڑی نرم دلی سے انہیں دوبارہ پانی میں پھینک رہا تھا۔

میری روح نے کہا۔۔۔۔ "ہم اس کے سامنے نہیں نہا سکتے کیونکہ یہ ایک مخیر ہے۔۔۔"

ہم اور آگے بڑھے۔ اور وہاں پہنچے۔ جہاں ایک آدمی ریت پر اپنے سائے کا نقش اتار رہا تھا۔ سمندر کی بے پناہ لہریں آتیں اور اس نقش کو مٹا دیتیں۔ لیکن وہ برابر نقش بنانے میں مصروف تھا'

میری روح نے کہا۔ "یہ شخص صوفی ہے' آؤ اسے چھوڑ دیں۔"

ہم آگے بڑھے اور سمندر کے کنارے ایک آدمی کو دیکھا۔ جو جھاگ کو اکٹھا کر کے ایک سیاہ برتن میں ڈال رہا تھا۔

میری روح نے کہا۔۔۔ "یہ ایک حقیقت پرست ہے اور اسے ہماری برہنگی کا نظارہ نہیں کرنا چاہئے۔"

ہم اور آگے بڑھے۔ دفعتاً" ہم نے ایک آواز سنی۔۔۔۔ یہ سمندر ہے گہرا' وسیع اور پرشوکت" اور جب ہم اس آواز کے قریب پہنچے تو ہم نے دیکھا کہ ایک آدمی سمندر کی طرف پیٹھ کئے کھڑا ہے اور ایک سیپ کو کان سے لگائے اس کی آواز سن رہا ہے۔

میری روح نے کہا۔۔۔۔ "چلو یہاں سے چلیں۔ یہ ایک ظاہر پرست ہے جو کسی بات کی پوری حقیقت نہ سمجھنے پر اپنی توجہ اس کے کسی جزو پر مرتکز کر دیتا ہے۔"

اس طرح ہم آگے بڑھتے گئے۔ حتیٰ کہ ہم نے ایک آدمی کو ریت میں سر دبائے دیکھا۔ میں نے اپنی روح سے کہا۔۔۔ "ہم یہاں نہا سکتے ہیں۔ کیونکہ یہ شخص ہمیں نہیں دیکھ سکتا۔"

میری روح نے کہا۔۔۔۔ "نہیں یہ تو ان سب سے زیادہ خطرناک ہے کیونکہ یہ ایک یوگی ہے۔۔۔۔"

تب میری روح کے چہرے پر گہری اداسی چھا گئی' اور اس نے غمناک آواز میں کہا۔ "آؤ ہم یہاں سے چلیں' کیونکہ یہاں کوئی علیحدہ اور پوشیدہ جگہ نہیں ہے۔ جہاں ہم نہا سکیں۔ میں نہیں چاہتی۔ کہ ہوا میرے سنہری کاکلوں کے ساتھ کھیلے یا میں اپنا سینہ اس ہوا میں برہنہ کروں یا روشنی کو اجازت دوں' کہ وہ میرے پوتر جوبن کو عریاں کرے"

تب ہم اس سمندر کو چھوڑ کر ایک بڑے سمندر کی تلاش میں نکلے۔

---o---

دو سادھو

ایک پہاڑ پر دو سادھو رہتے تھے۔ ان کا کام خدا کی عبادت اور آپس میں پیار و محبت کے ساتھ رہنے کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ ان کے پاس مٹی کا ایک پیالہ تھا—— اور یہی ان دونوں کی کائنات تھی۔

ایک دن بڑے سادھو کے دل میں بدی کی روح داخل ہوئی وہ چھوٹے سادھو کے پاس آیا اور اس نے کہا۔ "ہم دونوں کو اکٹھے رہتے ہوئے ایک عرصہ گزر چکا ہے اور اب جدا ہونے کا وقت آ پہنچا ہے اس لئے آؤ ہم اپنی جائیداد تقسیم کر لیں۔"

چھوٹے سادھو نے مغموم ہو کر کہا۔

"بھائی تمہاری جدائی کا خیال میرے دل پر شاق گزر رہا ہے۔ لیکن اگر تم جانا ہی چاہتے ہو' تو خیر یونہی سہی——"

یہ کہہ کر اس نے وہ پیالہ بڑے سادھو کے سامنے لا کر رکھ دیا' اور کہا۔

"ہم اسے آپس میں بانٹ نہیں سکتے اس لئے یہ پیالہ آپ ہی لے لیں——"

بڑے سادھو نے کہا۔ "نہیں میں خیرات نہیں مانگنا چاہتا۔ میں اپنے حصے کے سوا اور کچھ نہ لوں گا—— ہمیں یہ پیالہ آپس میں تقسیم کرنا پڑے گا۔"

چھوٹے سادھو نے کہا—— "اگر یہ پیالہ ٹوٹ گیا' تو یہ ہمارے کس کام آئے گا؟ اگر تم پسند کرو تو آؤ ہم قرعہ ڈال کر اس کا فیصلہ کر لیں——"

لیکن بڑے سادھو نے دوبارہ کہا۔ "میں صرف وہی چیز لوں گا جسے انصاف میری ملکیت قرار دے اور میں یہ پسند نہیں کرتا کہ انصاف کو قسمت پر چھوڑ دیا جائے۔ ہمیں یہ پیالہ ضرور تقسیم کرنا پڑے گا——"

اس پر چھوٹے سادھو سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ اور اس نے کہا—— "اگر تمہاری یہی مرضی ہے تو لاؤ اسے توڑ ڈالیں۔"

یہ سن کر بڑے سادھو کا چہرہ غصے سے لال ہو گیا۔ اور وہ چلا کر بولا۔

"او بزدل انسان' کیا تو اس پیالے کے لئے میرے ساتھ لڑے گا بھی نہیں——"

شکست

شکست—— میری شکست—— میری تنہائی اور علیحدگی۔

تو مجھے ہزاروں فتوحات سے زیادہ عزیز ہے۔

ہاں تو مجھے دنیا کی تمام شوکتوں سے زیادہ عزیز ہے۔

شکست—— میری شکست—— میرے شعور ذات اور میری جرأتِ مقابلہ۔

تو نے مجھے سمجھایا کہ میں ابھی نوجوان اور تیز گام ہوں اور کامیابی کے مرجھائے ہوئے پھولوں کے فریب میں نہیں آ سکتا۔

میں نے تجھی سے تنہائی کا مزہ پایا ہے۔

اور لوگوں کے مجھ سے اجتناب کرنے اور نفرت کی نظر سے دیکھنے کی مسرت حاصل کی ہے۔

شکست—— میری شکست—— میری چمکتی ہوئی تلوار اور ڈھال۔

میں نے تیری آنکھوں میں یہ پڑھا ہے

کہ تاج شاہی دراصل غلامی کا نشان ہے

دوسروں سے پہچانے جانا خاک میں مل جانے کے مترادف ہے۔

اور کسی کی سمجھ میں آ جانا پھلنے پھولنے کی آخری حد ہے۔

اور اس کے بعد پکے ہوئے پھل کی طرح نیچے گر کر گل سڑ جانا ہے۔

شکست—— میری شکست—— میری بیباک مددگار'

تو میرے گیت' میری فریادیں اور میرے سکوت کی آواز سنے گی

صرف تو میرے ساتھ پروں کی پھڑپھڑاہٹ۔
سمندروں کے ہیجان۔
اور ان پہاڑوں کے شور کا ذکر کرے گی جو رات کو جلتے ہیں۔
صرف تو ہی میری روح کی بلند اور عمودوار گھاٹی پر چڑھے گی۔
شکست ———— میری شکست ———— میری نہ مٹنے والی جرات'
ہم دونوں طوفان کے ساتھ قہقہے لگائیں گے۔
اور ہم اپنے دل میں مرنے والے جذبات کے لئے قبریں کھودیں گے۔
ہم دھوپ میں پکے ارادے کے ساتھ کھڑے ہوں گے۔
اور ہمارا وجود دنیا کے لئے خطرناک ثابت ہوگا۔

متبرک شہر

میں اپنی جوانی کے زمانے میں سنا کرتا تھا۔ کہ ایک ایسا شہر ہے جس کے باشندے آسمانی صحیفوں کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں۔

میں نے کہا۔ "میں اس شہر کو ضرور تلاش کروں گا اور اس سے برکت حاصل کروں گا۔"

یہ شہر بہت دور تھا۔ میں نے اپنے سفر کے لئے خوب سامان جمع کیا۔ چالیس دن کے بعد میں نے اس شہر کو دیکھا اور اکتالیسویں دن اس کے اندر داخل ہوا۔

مجھے یہ دیکھ کر بہت حیرت ہوئی کہ اس شہر کے تمام باشندوں کا صرف ایک ہاتھ اور ایک آنکھ ہے۔ میں نے حیران ہو کر اپنے دل میں کہا۔ "کہ اتنے متبرک شہر کے باشندوں کا صرف ایک ہاتھ اور ایک آنکھ!"

میں نے دیکھا کہ وہ خود بھی اس بات پر حیران ہیں' میرے دو ہاتھوں اور دو آنکھوں نے انہیں محو حیرت کر دیا۔ اس لئے جب وہ میرے متعلق آپس میں گفتگو کر رہے تھے تو میں نے ان سے پوچھا۔

"کیا یہ وہی متبرک شہر ہے جس کا ہر باشندہ مقدس صحیفوں کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے؟"

انہوں نے جواب دیا۔

"ہاں یہ وہی شہر ہے۔"

میں نے کہا۔ "تمہاری یہ حالت کیونکر ہوئی؟ تمہاری داہنی آنکھیں اور داہنے ہاتھ کیا ہوئے؟

وہ سب میری بات سے بہت متاثر ہوئے اور مجھ سے کہا

"آ' اور دیکھ————"

وہ مجھے شہر کے ایک معبد میں لے گئے۔ جو اس کے وسط میں واقع تھا۔ میں نے اس معبد کے صحن میں ہاتھوں اور آنکھوں کا ایک انبار لگا ہوا دیکھا۔ وہ سب گل سڑ رہے تھے۔ پھر میں نے کہا۔

"افسوس کس سنگ دل فاتح نے تمہارے ساتھ یہ سلوک کیا ہے؟"

اس پر انہوں نے زیر لب گفتگو شروع کی اور ایک بوڑھے آدمی نے آگے بڑھ کر مجھ سے کہا۔۔۔۔ "یہ ہمارا اپنا کام ہے۔ خدا نے ہمیں اپنی برائیوں پر فتح دی ہے۔۔۔۔"

یہ کہہ کر وہ مجھے ایک اونچے منبر پر لے گیا۔ باقی تمام لوگ ہمارے پیچھے تھے۔ پھر اس نے منبر کے اوپر ایک تحریر دکھائی جس کے الفاظ یہ تھے۔

"اگر تمہاری داہنی آنکھ تمہیں ٹھوکر کھلائے تو اسے باہر نکال پھینکو' کیونکہ سارے جسم کے دوزخ میں پڑنے سے ایک عضو کا ضائع ہونا بہتر ہے۔ اور اگر تمہارا داہنا ہاتھ تمہیں برائی پر مجبور کرے تو اسے کاٹ کر پھینک دو تاکہ تمہارا صرف ایک عضو ضائع ہو جائے اور سارا جسم دوزخ میں نہ پڑے۔ (انجیل)

یہ عبارت پڑھ کر مجھے ساری حقیقت معلوم ہو گئی میں نے منہ موڑ کر تمام لوگوں کو مخاطب کیا اور کہا۔ "کیا تم میں کوئی آدمی یا عورت نہیں جس کے دو ہاتھ اور دو آنکھیں ہوں۔"

ان سب نے جواب دیا "نہیں کوئی نہیں' یہاں ان بچوں کے سوا جو کمسن ہونے کی وجہ سے اس کتبہ کو پڑھنے اور اس کے احکام پر عمل کرنے سے قاصر ہیں۔ کوئی شخص صحیح و سالم نہیں۔"

جب ہم معبد سے باہر آئے تو میں فوراً اس متبرک شہر سے بھاگ نکلا کیونکہ میں کمسن نہ تھا اور اس کتبے کو بخوبی پڑھ سکتا تھا۔

جنگ

ایک رات قصر شاہی میں ایک دعوت ہوئی۔ اس موقع پر ایک آدمی آیا اور اپنے آپ کو شہزادے کے حضور میں پیش کیا۔ تمام مہمان اس کی طرف دیکھنے لگے۔ انہوں نے دیکھا کہ اس کی ایک آنکھ باہر نکل آئی ہے۔ اور خالی جگہ سے خون بہہ رہا ہے۔

شہزادے نے اس سے پوچھا "تم پر کیا واردات گزری؟"

اس نے جواب دیا۔

"عالی جاہ میں ایک پیشہ ور چور ہوں اور آج شب جب کہ چاند ابھی طلوع نہیں ہوا تھا۔ میں ساہوکار کی دوکان لوٹنے کے لئے گیا۔ لیکن غلطی سے جلاہے کے گھر میں داخل ہو گیا۔ جوں ہی میں کھڑکی سے کودا میرا سر جلاہے کے کرگھے کے ساتھ ٹکرایا۔ اور میری آنکھ پھوٹ گئی۔ اے شہزادے اب میں اس جلاہے کے معاملے میں انصاف چاہتا ہوں۔۔۔۔"

یہ سن کر شہزادے نے جلاہے کو طلب کیا۔ اور یہ فیصلہ صادر فرمایا کہ اس کی ایک آنکھ نکال دی جائے۔

جلاہا بولا۔

"ظل سبحانی آپ کا یہ فیصلہ درست ہے کہ میری ایک آنکھ نکالی جانی چاہئے۔ لیکن میرے کام میں دونوں آنکھوں کی ضرورت ہے تاکہ میں اس کپڑے کی دونوں اطراف دیکھ سکوں جسے میں بنتا ہوں۔۔۔۔ میرے پڑوس میں ایک موچی ہے جس کی دونوں آنکھیں سلامت ہیں اس کے پیشے میں ان دونوں کی کوئی ضرورت نہیں۔۔۔۔"

یہ سن کر شہزادے نے موچی کو طلب کیا۔ وہ آیا اور اس کی دو آنکھوں میں سے ایک آنکھ نکال دی گئی۔

اس طرح انصاف کا تقاضا پورا ہو گیا۔

خدا

زمانہ قدیم میں جب میرے ہونٹ پہلی بار گفتگو کے لئے جنبش میں آئے تو میں نے مقدس پہاڑ پر چڑھ کر خدا سے کہا۔

"اے میرے مالک! میں تیرا غلام ہوں۔ تیری مشیت میرے لئے ایک قانون کا حکم رکھتی ہے اور میں تیرے احکام پر ہمیشہ کاربند رہوں گا۔"

لیکن خدا نے کوئی جواب نہ دیا۔ اور ایک تند طوفان کی مانند تیزی سے گزر گیا۔

ایک ہزار سال کے بعد میں پھر مقدس پہاڑ پر چڑھ کر خدا سے ان الفاظ میں گویا ہوا۔

"اے میرے خالق میں تیری مخلوق ہوں۔ تو نے مجھے مٹی سے پیدا کیا اور میں نے اپنا سب کچھ تجھ ہی سے حاصل کیا ہے اور میرا سب کچھ تیرے ہی لئے ہے۔"

لیکن خدا نے کوئی جواب نہ دیا اور ہزارہا تیز پروں کی طرح سن سے گزر گیا۔

ہزار سال کے بعد میں پھر مقدس پہاڑ پر چڑھا۔ اور خدا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"اے باپ — میں تیرا بیٹا ہوں۔ تو نے مجھے شفقت اور محبت سے پیدا کیا اور میں محبت اور عبادت ہی سے تیری بادشاہت حاصل کروں گا —"

لیکن خدا نے کوئی جواب نہ دیا اور ایک ایسی کہر کی مانند جو دور دراز پہاڑیوں پر چھائی رہتی ہے۔ استغنا سے گزر گیا۔

ایک ہزار سال بعد میں پھر مقدس پہاڑ پر چڑھا اور ایک بار پھر خدا سے گفتگو کرتے ہوئے کہا۔

"میرے خدا — میرے مقصود اور میرے منتہائے تکمیل' میں تیرا ماضی ہوں اور تو میرا مستقبل' میں زمین پر تیری اصل ہوں۔ اور تو آسمان پر میرا پھول — ہم دونوں سورج کے سامنے نمو پاتے ہیں —"

تب خدا مجھ پر جھکا اور میرے کانوں میں آہستہ سے چند میٹھی باتیں کیں۔ پھر جس طرح سمندر ایک ندی کو اپنی آغوش میں لپٹا لیتا ہے اسی طرح خدا نے مجھے اپنی آغوش میں لے لیا۔

اور جب میں وادیوں اور میدانوں میں اترا تو میں نے خدا کو وہاں بھی موجود پایا۔

———O———

نصیحت

میرے نفس نے مجھے نصیحت کی اور بتایا کہ میں اس سے محبت کروں' جس سے لوگ نفرت کرتے ہیں۔ اور اس سے خلوص برتوں' جس سے لوگ بغض و کینہ رکھتے ہیں۔ اس نے مجھ پر واضح کیا کہ محبت چاہنے والے کا نہیں' چاہے جانے والے کا امتیاز ہے۔

اور اپنے نفس کے نصیحت کرنے سے پہلے محبت میرے لئے ایک باریک دھاگا تھی' جو پاس پاس گڑی ہوئی دو میخوں کے درمیان کسا ہوا تھا۔ لیکن اب اس نے ایک ہالے کی صورت اختیار کرلی ہے' جس کا اوّل' آخر ہے اور آخر اول۔ جو ہر موجود کو محیط ہے اور آہستہ آہستہ پھیل رہا ہے۔ تاکہ آئندہ جو بھی عرصۂ وجود پر قدم رکھنے والا ہو' اسے اپنی آغوش میں سمیٹ لے۔

○ ○ ○

میرے نفس نے مجھے نصیحت کی اور بتایا کہ میں اس حسن پر نگاہ کروں' جو صورت' رنگ اور جلد کے پیچھے چھپا ہوا ہے۔ جسے لوگ گھناؤنا سمجھتے ہیں۔ اسے بصیرت کی آنکھ سے دیکھوں' اور اس وقت تک دیکھتا رہوں' جب تک اس کا حسن مجھ پر ظاہر نہ ہو جائے۔

اور اپنے نفس کے نصیحت کرنے سے پہلے' میں حسن کو ان مرتعش شعلوں کی صورت میں دیکھا کرتا تھا' جو دھوئیں کے بادلوں میں چھپے ہوئے ہوں۔ لیکن اب دھواں چھٹ کر فنا ہو گیا ہے' اور میں صرف روشن چیزوں ہی کو دیکھنے لگا ہوں۔

○ ○ ○

میرے نفس نے مجھے نصیحت کی اور مجھے ان آوازوں پر کان لگانا سکھایا' جو کسی زبان سے ادا نہیں ہوئیں' کسی حلقوم سے نہیں نکلیں۔

اور اپنے نفس کے نصیحت کرنے سے پہلے' میں گراں گوشی کا مریض تھا' جسے شور و

غل اور چیخ و پکار کے سوا کچھ نہ سنائی دیتا تھا۔ لیکن اب مجھے خاموشی پر کان لگانا آگیا ہے۔

اب میں خاموشی کے جھلڑوں کو' زمانوں کے گیت گاتے' فضا کی تسبیحیں پڑھتے اور غیب کے اسرار کا اعلان کرتے سنتا ہوں۔

○ ○ ○

میرے نفس نے مجھے نصیحت کی اور بتایا کہ میں وہ شراب ہوں' جو کشید کی گئی ہے نہ پیالوں میں انڈیلی گئی ہے۔ ہاتھوں میں اٹھائی گئی ہے نہ ہونٹوں سے لگائی گئی ہے۔

اور اپنے نفس کے نصیحت کرنے سے پہلے' میری پیاس راکھ کے ڈھیر میں ایک معمولی سی چنگاری تھی' جسے میں کنوئیں کے تھوڑے سے پانی یا مٹی کے مٹکے کے ایک گھونٹ سے بجھا لیا کرتا تھا۔ لیکن اب میرا شوق میرا پیالہ' میری تونس میری شراب اور میری تنہائی میرا نشہ ہو گئی ہے۔ اس کے باوجود میں سیراب نہیں ہوتا۔ نہ کبھی سیراب ہو سکوں گا۔ لیکن اس کبھی نہ بجھنے والی تپش میں میرے لئے ایک لازوال مسرت ہے۔

○ ○ ○

میرے نفس نے مجھے نصیحت کی اور اس چیز کو چھونا سکھایا' جس نے ابھی تک کوئی جسم اختیار نہیں کیا۔ اس نے مجھے سمجھایا کہ محسوس' نصف معقول اور ہمارے مقبوضات ہمارے مرغوبات کا ایک حصہ ہیں۔

اور اپنے نفس کے نصیحت کرنے سے پہلے' میں مسرور ہوتا تھا تو گرم پر' گرم ہوتا تھا' تو سرد پر اور معتدل ہوتا تھا' تو ان دونوں میں سے کسی ایک پر اکتفا کرتا تھا۔ لیکن اب میری سکڑی ہوئی جلد بکھر کے ایک باریک کہر بن گئی ہے' جو ہستی کے ہر مظہر میں نفوذ کر جاتی ہے تاکہ اس کے ان حصوں سے مکمل مل جائے' جو نظر نہیں آتے۔

○ ○ ○

میرے نفس نے مجھے نصیحت کی اور اس خوشبو کو سونگھنا سکھایا' جو پھولوں سے پھوٹتی ہے نہ آتش دانوں سے بلند ہوتی ہے۔

اور اپنے نفس کے نصیحت کرنے سے پہلے' میں اس خوشبو کا متوالا تھا' جسے میں باغوں' شیشوں اور عطردانوں میں تلاش کرتا تھا' لیکن اب میں وہ خوشبو سونگھنے لگا ہوں' جو سلگائی جاتی ہے نہ انڈیلی جاتی ہے۔ اور اپنے سینے کو ان پاکیزہ انفاس سے بھرنے لگا

ہوں، جو اس دنیا کے کسی باغ سے نہیں گزرے، اور جنہیں اس فضا کی کسی ہوا نے اپنے دوش پر نہیں اٹھایا۔

○ ○ ○

میرے نفس نے مجھے نصیحت کی اور بتایا کہ جب کوئی نامعلوم آواز پکارے، کوئی خطرہ آواز دے، تو میں لبیک کہوں۔

اور اپنے نفس کے نصیحت کرنے سے پہلے میں اسی بلانے والے کی آواز پر اٹھتا تھا، جسے میں جانتا تھا۔ اور انہی رستوں پر چلتا تھا، جن کے متعلق مجھے معلوم تھا کہ وہ آسان ہیں۔ لیکن اب "معلوم" میرے لئے ایک گاڑی بن گیا ہے، جس پر سوار ہو کر میں "نامعلوم" کی طرف جاتا ہوں اور آسانی میرے لئے ایک زینہ ہو گئی ہے۔ جس پر چڑھ کر میں خطرے تک پہنچتا ہوں۔

○ ○ ○

میرے نفس نے مجھے نصیحت کی اور بتایا کہ میں زمانے کا قیاس اپنے اس قول سے نہ کروں کہ "کل تھا اور کل ہو گا۔"

اور اپنے نفس کے نصیحت کرنے سے پہلے، میں ماضی کو ایک ایسا عہد سمجھتا تھا، جو کبھی واپس نہیں آتا۔ اور مستقبل کو ایک ایسا عصر، جس تک میں کبھی نہیں پہنچوں گا۔ لیکن اب میں نے جان لیا ہے کہ موجودہ لمحہ ہی کل زمانہ ہے، اور اسی میں زمانے کی وہ سب چیزیں پائی جاتی ہیں، جن کی امید کی جاتی ہے، جنہیں حاصل کیا جاتا ہے اور جن کی تحقیق و تصدیق کی جاتی ہے۔

○ ○ ○

میرے نفس نے مجھے نصیحت کی اور بتایا کہ میں مکان کی تحدید یہ کہہ کر نہ کروں کہ "یہاں اور وہاں"۔

اور اپنے نفس کے نصیحت کرنے سے پہلے، جب میں زمین کے کسی مقام پر ہوتا تھا، تو اپنے تئیں دوسرے تمام مقاموں سے دور سمجھتا تھا لیکن اب میں جان گیا ہوں کہ جس جگہ میں ہوتا ہوں، وہی کل جگہ ہے۔ اور جو فاصلہ میرے زیر قدم ہوتا ہے، وہی کل مسافت۔

○ ○ ○

میرے نفس نے مجھے نصیحت کی اور بتایا کہ جب بستی والے سو رہے ہوں، تو میں جاگوں، اور جب وہ جاگ رہے ہوں، تو میں سوؤں۔

اور اپنے نفس کے نصیحت کرنے سے پہلے، نہ میں اپنی نیند میں ان کے خواب دیکھتا تھا، نہ وہ اپنی بے خبری میں میرے خوابوں کی نگرانی کرتے تھے۔ لیکن اب جب بھی میں، اپنی نیند میں بازو پھیلا کر اڑتا ہوں، وہ میرے نگران ہوتے ہیں، اور جب بھی وہ اپنے خوابوں میں پرواز کرتے ہیں، میں ان کی آزادی پر خوشی سے تالیاں بجاتا ہوں۔

○ ○ ○

میرے نفس نے مجھے نصیحت کی اور بتایا کہ میں تعریف سے خوش ہوں نہ مذمت سے دل گیر۔

اور اپنے نفس کے نصیحت کرنے سے پہلے، جب تک کوئی میرے کاموں کی تعریف نہ کرے، یا ان میں کوئی عیب نہ نکالے میں اپنے کاموں کی قدر و قیمت کے بارے میں مشکوک و متذبذب رہتا تھا۔ لیکن اب میں جان گیا ہوں کہ درخت، بہار میں پھول اور گرمیوں میں پھل لاتے ہیں اور انہیں تعریف و تحسین کا کوئی لالچ نہیں ہوتا۔ خزاں میں ان کے پتے جھڑ جاتے ہیں اور جاڑوں میں ننگے بوچے ہو جاتے ہیں اور انہیں ملامت و مذمت کا کوئی خوف نہیں ہوتا۔

○ ○ ○

میرے نفس نے مجھے نصیحت کی۔ اس نے مجھے بتایا اور مجھ پر ثابت کیا کہ میں شکستہ حالوں سے بلند ہوں نہ طاقت وروں سے پست۔

اور اپنے نفس کے نصیحت کرنے سے پہلے، میں انسان کو دو مردوں میں منقسم سمجھتا تھا۔ کمزور مرد، جس پر میں ترس کھاتا ہوں، یا اس سے نفرت کرتا ہوں۔ اور طاقتور مرد، جس کے آگے میں جھکتا ہوں یا جس کے خلاف میں بغاوت کرتا ہوں۔ لیکن اب مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ اسی چیز سے میں انفرادی طور پر، پیدا ہوا ہوں، جس چیز سے دوسرے انسان، اجتماعی طور پر پیدا ہوئے ہیں۔ اس اعتبار سے میرے عناصر ان کے عناصر ہیں اور میرا ضمیر ان کا ضمیر۔ میرے مسائل ان کے مسائل ہیں اور میری منزل مقصود ان کی

منزل مقصود۔ اب اگر وہ گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں' تو گنہ گار میں ہوں۔ اور اگر وہ نیکی کرتے ہیں' تو اس پر فخر مجھے ہوتا ہے۔ اگر وہ اٹھتے ہیں' تو ان کے ساتھ میں بھی اٹھتا ہوں۔ اگر وہ بیٹھتے ہیں' تو ان کے ساتھ میں بھی بیٹھتا ہوں۔

○ ○ ○

میرے نفس نے مجھے نصیحت کی۔ اس نے مجھے بتایا اور سمجھایا کہ جو چراغ میرے ہاتھ میں ہے' وہ میرا نہیں ہے۔ اور جو گیت میں گا رہا ہوں وہ میرے بطون سے پیدا نہیں ہوئے۔

پس ہرچند میں روشنی میں چل رہا ہوں۔ لیکن خود روشنی نہیں ہوں اور ہرچند میں کسے ہوئے تاروں کی سارنگی ہوں۔ لیکن سارنگی نواز نہیں ہوں۔

○ ○ ○

میرے نفس نے مجھے نصیحت کی' میرے بھائی! اور مجھے سکھایا پڑھایا۔

اور تیرے نفس نے بھی تجھے نصیحت کی اور تجھے سکھایا پڑھایا۔

پس تو اور میں ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں۔ اور ہم دونوں میں اس کے سوا کوئی فرق نہیں ہے کہ میں اپنے دل کی بات کہہ رہا ہوں اور میرے کلام میں بے ربطی ہے۔ اور تو اپنے دل لی بات چھپا رہا ہے اور تیرے اخفاء و تحمل میں فضیلت کا ایک پہلو ہے۔

نیند اور بیداری کے درمیان

چار غلام' کھڑے ایک بوڑھی ملکہ کو مورچھل کر رہے تھے' جو اپنے تخت پر بے خبر پڑی' بڑے بڑے خراٹے لے رہی تھی۔ ملکہ کی گود میں ایک بلی بیٹھی میاؤں میاؤں کر رہی تھی' اور غلاموں کو ذلت و حقارت کی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

پہلے غلام نے اپنے ساتھیوں سے کہا:

"سوتے میں' یہ بڑھیا کتنی بدصورت معلوم ہو رہی ہے۔ ذرا دیکھنا' اس کے ہونٹ کیسے لٹک گئے ہیں' اور یہ اس طرح سانس لے رہی ہے' جیسے شیطان اس کا گلا گھونٹ رہا ہو۔"

بلی نے میاؤں میاؤں کرتے ہوئے کہا:

"سوتے میں اس کی بدصورتی' تمہاری بیدار غلامی کی بدصورتی کا کوئی جزو نہیں ہے۔"

دوسرا غلام بولا:

"تعجب ہے! کہ نیند نے بھی اس کے چہرے میں کوئی ملائمت پیدا نہیں کی۔ بلکہ اس کی شکنیں اور ابھر آئی ہیں۔ یقیناً یہ کوئی بھیانک خواب دیکھ رہی ہے۔"

بلی نے میاؤں میاؤں کی زبان میں کہا:

"کیا ہی اچھا ہوتا! اگر تم سوتے اور اپنی آزادی کا خواب دیکھتے۔"

اب تیسرا غلام اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوا:

"میرا خیال ہے' یہ خواب میں ان کشتگان ستم کا جلوس دیکھ رہی ہے' جنہیں اس نے از راہ ظلم و زیادتی' قتل کرایا ہے۔"

بلی نے اپنی میاؤں میاؤں میں جواب دیا:

"ہاں! یہ تمہارے اجداد اور تمہاری اولاد کے جلوس دیکھ رہی ہے۔"

چوتھے غلام نے کہا:

"کتنے بے وقوف ہو تم! اس ملکہ کی باتیں کر رہے ہو' اور وہ سو رہی ہے۔ بھلا! اس سے تمہیں یا مجھے کیا فائدہ؟ کاش! اس سے میری اس تکان اور اذیت میں کمی ہوتی' جو مجھے کھڑے ہونے اور اسے مورچھل کرنے میں ہو رہی ہے۔"

بلی نے اپنی زبان میں کہا:

"ہاں! تم یونہی ابدالاباد تک مورچھل کرتے رہو گے۔ کیونکہ جو تم زمین پر ہو' وہی آسمان پر بھی رہو گے۔"

اس وقت ملکہ نے سوتے میں کروٹ لی اور اس کا تاج زمین پر گر پڑا۔ ایک غلام بولا:

"یہ اس کے لئے برا شگون ہے۔"

بلی نے میاؤں میاؤں کی اور کہا:

"ایک قوم کے مصائب' دوسری قوم کے لئے فوائد ہوتے ہیں۔"

دوسرا غلام کہنے لگا:

"اگر یہ اس وقت بیدار ہو جائے' اور اپنا تاج زمین پر پڑا دیکھے تو ہمارا کیا حال ہوگا؟ خدا کی قسم! یہ ہم سب کو ذبح کرا دے گی۔"

بلی نے میاؤں میاؤں کرتے ہوئے کہا:

"تم تو اپنی پیدائش ہی کے دن سے ذبح کئے جا رہے ہو' بیوقوفو! مگر جانتے نہیں۔"

تیسرا غلام بولا:

"یقیناً یہ ہمیں ذبح کرا دے گی۔ اور سمجھے گی کہ اس طرح اس نے اپنے دیوتاؤں کا قرب حاصل کر لیا۔"

بلی نے اپنی زبان میں کہا:

"دیوتاؤں پر کمزور ہی بھینٹ چڑھائے جاتے ہیں۔"

چوتھے غلام نے اپنے ساتھیوں کو خاموش کیا اور کراہتے ہوئے زمین سے تاج اٹھا کر' ملکہ کے سر پر اس طرح رکھ دیا کہ اس کی نیند میں خلل نہ پڑے۔

بلی نے زور سے میاؤں میاؤں کرتے ہوئے کہا:

"میں تم سے سچ کہتی ہوں کہ لڑھکے ہوئے تاجوں کو غلاموں کے سوا کوئی نہیں اٹھاتا۔"

تھوڑی دیر کے بعد ملکہ بیدار ہو گئی۔ اس نے جماہی لیتے ہوئے اپنے چاروں طرف دیکھا' اور غلاموں سے کہنے لگی:

"میرا خیال ہے' میں خواب دیکھ رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ ایک بچھوتنہ آور شاہ بلوط کے تنے کے گرد' چار کیڑے مکوڑوں کا تعاقب کر رہا ہے۔ پریشان کن خوابوں سے اللہ بچائے۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنی آنکھیں موند لیں اور پھر سو گئی۔ کمرہ اس کے خراٹوں سے گونجنے لگا اور غلام اپنے معمول کے مطابق' اسے مورچھل کرنے لگے۔

بلی نے میاؤں میاؤں کرتے ہوئے ان سے کہا:

"کئے جاؤ مورچھل' کئے جاؤ! اے احمقو اور بے وقوفو! تم اس آگ کو ہوا دے رہے ہو' جو تمہارے وجود کو چاٹتی ہے۔"

چودھویں کا چاند

چودھویں کا چاند اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ نمودار ہوا۔ شہر کے تمام کتوں نے چاند پر بھونکنا شروع کر دیا۔

صرف ایک کتا خاموش رہا۔ اس نے بڑی سنجیدگی سے دوسروں سے کہا۔۔۔۔۔۔

"سکوت کو اس کی نیند سے نہ جگاؤ۔ اور چاند کو اپنی للکار سے زمین پر نہ بلاؤ۔"

دوسرے کتوں نے بھونکنا بند کر دیا۔ ہولناک خاموشی چھا گئی۔ لیکن وہ کتا جس نے دوسروں کو چپ رہنے کو کہا تھا۔ ساری رات خاموشی کی تلقین میں بھونکتا رہا!

شاہ فرزانہ

کہتے ہیں کسی دور دراز شہر میں ایک بادشاہ تھا۔ اس کے رعب و جلال کی وجہ سے لوگ اس سے خوف زدہ رہتے اور اس کی دانش و حکمت کے سبب اس سے محبت کرتے تھے۔

اس شہر کے عین وسط میں شفاف اور میٹھے پانی کا ایک کنواں تھا۔ بادشاہ اور اس کے امراء' وزراء سمیت سارا شہر اسی کنوئیں کا پانی پیتا تھا۔ اس لئے کہ سارے شہر میں صرف ایک ہی کنواں تھا!

ایک رات کا ذکر ہے سارا شہر نیند کی آغوش میں دبکا پڑا تھا کہ ایک ساحرہ چپکے سے اس شہر میں وارد ہوئی اور ایک عجیب و غریب سیال کے سات قطرے کنوئیں میں ڈال کر بولی:

"اب جو کوئی اس کنوئیں سے پانی پئے گا' دیوانہ ہو جائے گا!"

دوسرے روز اہل شہر نے اس کنوئیں کا پانی پیا تو ساحرہ کی پیش گوئی کے مطابق سبھی دیوانے ہو گئے۔

لیکن بادشاہ اور اس کے وزیر نے پانی نہ پیا اور دیوانگی سے بچے رہے۔

فوراً یہ خبر گھر گھر پہنچ گئی کہ بادشاہ اور وزیر نے پانی نہیں پیا اور وہ دونوں دیوانے ہو گئے ہیں۔

لوگوں نے یک زبان ہو کے کہنا شروع کیا۔

"بادشاہ اور وزیر دونوں پاگل ہو گئے ہیں' دونوں ہوش و خرد سے بیگانے ہو گئے ہیں۔۔۔۔ لہٰذا ہمیں دیوانہ بادشاہ چاہئے نہ دیوانہ وزیر! ہم ان دونوں سے اقتدار چھین لیں گے۔۔۔۔۔"

شام کو یہ ساری روداد بادشاہ اور وزیر کے کانوں تک بھی جا پہنچی۔ بادشاہ نے فوراً

حکم دیا کہ سونے کے پیالے میں ---- جو اسے اپنے آباؤ اجداد سے وراثت میں ملا تھا ---- کنوئیں کا پانی بھر لائیں ---- حکم کی تعمیل کی گئی اور پانی سے لب ریز پیالہ بادشاہ کے حضور پیش کیا گیا۔ بادشاہ نے پیالہ ہونٹوں سے لگایا اور دو تین گھونٹ لے کر وزیر کے ہاتھ میں دے دیا وزیر نے اس کا آخری قطرہ تک پی لیا۔

جب اہل شہر تک یہ خبر پہنچی کہ بادشاہ اور وزیر نے کنوئیں کا پانی پی لیا ہے تو وہ وفورِ مسرت سے ناچنے لگے۔ گھر گھر خوشی کے شادیانے بجائے گئے کہ بادشاہ اور اس کے وزیر' دونوں کو ان کی گم شدہ عقل واپس مل گئی ہے!

سودائی

اس سے پہلے کہ زندگی ہمیں ان جسمانی پنجروں میں اسیر کرے۔ ہم کہاں تھے؟ اور کیا تھا؟

اس سے پہلے کہ ہمارے جسموں میں بے چین اور بے قرار' یہ صاحب ادراک و احساس روحیں' ان کال کوٹھڑیوں میں بند ہوں' کہاں تھیں؟ اور کیا تھیں؟

اس سے پہلے کہ دن ہمیں ایک ایسے کلام کی شکل میں ادا کریں' جس کے الفاظ صاف' لیکن معنی مبہم ہوں۔ ہم کس فضائے سکوت میں پرافشاں تھے؟

اور اس سے پہلے کہ راتیں ہمارے نفوس کے ہیکل تیار کریں' ہمارے نفوس' ہستی کے کس مرتبہ میں تھے؟

یہ خوابوں کی پٹی باندھے ہوئے بیداری ---- یہ خیال کی نقاب اوڑھے ہوئے فکر ---- یہ فرحت والم اور محبت و شیفتگی کے تاروں سے بنی ہوئی امیدیں' شکم مادر میں پیدا ہوئی ہیں' یا بطن اثیر میں؟

کیا اس سے پہلے کہ شوق حیات' ہمیں آغوش حیات کے سپرد کر دے' ہم کوئی حقیقت نہ رکھتے تھے؟

جب سے میں نے ہوش سنبھالا یہی سوالات میں اپنے نفس سے کیا کرتا اور میرا نفس ایسے مبہم و مشکوک الفاظ میں ان کا جواب دیتا' جو میری عقل کے کانوں میں پہنچتے' تو میری عقل انہیں ایک گہرے سکوت میں تبدیل کر دیتی' جس طرح برف کے ٹکڑے پانی میں گرتے ہیں' تو پانی میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

لیکن کل ایک ایسا حادثہ پیش آیا جو قریب تھا کہ مجھے غیب کے اسرار دکھا دے اور مجھ پر ہستی کے رموز منکشف کر دے۔ کل میں ایک ایسی بات سے آشنا ہوا' جس نے میرے حافظہ کو اس عالم کی طرف تقریباً لوٹا ہی دیا تھا' جہاں میں اس جسم کا لباس پہننے سے

پہلے تھا۔ میں نے ایک شخص کو اپنی ذات کے متعلق کلام کرتے سنا' جس کے الفاظ میری محدود فکر اور عقل عام کے درمیان ایک باریک باریک رشتہ تانتے تانتے رہ گئے!

ہاں! کل میں نے سلیم رمال کو اس کی ذات اور ماضی بعید کی ان یادوں کا ذکر کرتے سنا' جو اس کے ذہن میں محفوظ تھیں اور مجھے یقین ہو گیا کہ میں ایک ایسے انسان کے حضور میں ہوں' جو اور انسانوں سے مختلف ہے' وہ کچھ محسوس کرتا ہے' جو وہ محسوس نہیں کرتے اور ان باتوں کو یاد رکھتا ہے' جنہیں وہ بھلا چکے ہیں۔

میں سلیم رمال کو دس برس سے جانتا ہوں۔ میں اور میرے دوست اسے "سودائی" کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ اس لئے کہ اگر وہ ہم میں سے کسی کو دیکھتا' تو ایسی حیرت ناک نگاہوں سے دیکھتا' گویا اس سے کبھی ملا ہی نہیں ہے۔ اور جب کبھی ہم اسے 'اس کا نام لے کر پکارتے' تو اس وقت تک ہماری طرف متوجہ نہ ہوتا' جب تک تین یا چار بار اس کا نام دہرا نہ لیا جاتا۔ اگر ہم اس سے کوئی ایسی بات پوچھتے' جو اس کے علم میں ہوتی' تو وہ ہماری طرف ایسی پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتا' گویا ہم کسی ایسی زبان میں اس سے بات کر رہے ہیں' جس کا ایک لفظ بھی اس نے اپنی زندگی میں نہیں سنا۔

بعض اوقات وہ ہلکی سے ہلکی آواز اور معمولی سے معمولی حرکت سے چونک پڑتا' جیسے سونے والا بندوق چلنے کی آواز سن کر چونک پڑتا ہے۔ چنانچہ اگر بیٹھا ہوتا' تو کھڑا ہو جاتا اور کھڑا ہوتا تو گھبرا کر چلنے لگتا۔ لیکن اس نفسی گمشدگی کے باوجود' وہ بلا کا ذہین' وہبی صلاحیتوں کا مالک اور بعض امور میں نہایت بعید الفکر تھا۔ خصوصاً علم موسیقی اور علم ہیئت میں اس کا درجہ بہت بلند تھا۔ جب کبھی میں نے اسے عربی نغمات اور ان کے اوزان و معانی پر گفتگو کرتے دیکھا' اس کی وقت نظر اور رقت شعور پر متعجب ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اور جب کبھی میں نے ہیئتی مسائل ——— مثلاً یہ کہ عالم کرہ سے پیدا کر کے فضا میں منتشر کر دیئے گئے ہیں ——— پر اس کی آراء سنیں' تو یہ محسوس کرنے پر مجبور ہو گیا کہ میں کسی بہت بڑے عالم ہیئت کی مجلس میں بیٹھا ہوں اور اپنے دل میں کہا کہ اس "مرد گم شدہ" کی روح میں وہ کچھ ہے' جو "مدعیان خرد" کی روح میں نہیں ہے۔ اور اس کے نشہ کی تہ میں ایک ایسی لگن ہے۔ جس کو ہوشیار اور باخبر لوگ نہیں جانتے!

سلیم رمال کی سب سے بڑی خوبی ——— جو مجھے معلوم ہوئی ——— یہ ہے کہ وہ گھنٹوں سورج کو جامد نگاہوں سے تکتا رہتا ہے۔ گویا وہ شیشہ کی ہیں۔ نہ اس کی پلکیں جھپکتی ہیں' نہ آنکھوں میں چکا چوند پیدا ہوتی ہے میں نے کئی بار چاہا کہ اس عجیب عادت سے اسے روکوں اور ڈرایا کہ اگر وہ اپنی اس حرکت سے باز نہ آیا' تو بصارت سے ہاتھ دھو بیٹھے گا' لیکن اس نے ہر بار یہی جواب دیا:

"چھچھوندر زمین کی تاریکیوں میں اپنے دن گزارتی ہے اور عقاب آفتاب سے آنکھیں لڑا کر اپنی زندگی بسر کرتا ہے۔ لیکن کیا تم نے اپنی عمر میں کسی عقاب کو اندھا دیکھا ہے؟"

تین برس گزر گئے اور سلیم مجھے نظر نہ آیا۔ مجھ میں اور میرے دوستوں میں اکثر اس کا ذکر رہتا۔ ہم کبھی ازراہ تفنن اس کی عجیب و غریب حرکات پر ہنستے اور کبھی اس کی فطری صلاحیتوں اور غیر معمولی علم پر اظہار تعجب کرتے ہم نے بہت معلوم کرنا چاہا کہ اس پر کیا بیتی؟ لیکن ہمیں کوئی ایسا شخص نہ ملا' جو اس کے متعلق کچھ جانتا ہو۔

ایک ہفتہ کی بات ہے میں تنہا بیٹھا تھا۔ میرے کان رات کی آوازوں پر لگے تھے اور ذہن اسرار شب کی پردہ کشائی میں مصروف تھا۔ اتنے میں کسی نے کنڈی کھٹکھٹائی۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا' تو سلیم میرے سامنے کھڑا تھا۔ کپڑے پھٹے ہوئے' بال الجھے ہوئے اور چہرہ پر ہوائیاں اڑی ہوئیں۔ خوشی خوشی میں اسے گھر میں لے گیا' لیکن اس کی یہ وحشت زدہ حالت دیکھ کر مجھے سخت حیرانی تھی۔ بہرحال میں نے اسے سامنے بٹھایا' پہلے مزاج پوچھا۔ اس کے بعد ان دنوں کے واقعات دریافت کرنے لگا۔ جو اس نے اپنے عزیزوں اور دوستوں سے دور رہ کر بسر کئے تھے۔ وہ کبھی میری آواز سے چونک پڑتا اور کبھی مجھے اس طرح دیکھنے لگتا' گویا میری بات اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی۔

میں نے اسے شراب کا ایک جام پلایا اور یہ ظاہر کرنے کے بعد کہ مجھے اس سے کتنی محبت ہے' میں اس کی موجودگی میں اپنے لئے کتنی راحت پاتا ہوں' اس سے پوچھا:

"سلیم! تم پر کیا بیتی؟ کہیں تم وہ سارا مال اور وہ ساری جائیداد تو نہیں گنوا بیٹھے' جو تمہیں اپنے باپ سے ورثہ میں ملی تھی؟"

اس برقی قمقمے پر نگاہیں جمائے ہوئے' جو اس کی کرسی کے قریب آویزاں تھا' اس

نے جواب دیا:

"میری سمجھ میں نہیں آتا' اس قسم کا مہمل سوال تم مجھ سے کیوں کر رہے ہو؟ میں نے نہ کوئی مال گنوایا' نہ جائیداد کھوئی' جو کچھ میرے باپ نے چھوڑا تھا وہ جوں کا توں موجود ہے۔"

اس کے بعد مسکرا کر کہنے لگا:

"بلکہ کل ہی وکیلوں اور بنک والوں کی طرف سے مجھے اطلاع ملی ہے کہ والد نے مرتے وقت جو دولت میرے لئے چھوڑی تھی' وہ اب دوگنی ہو گئی ہے!"

اس کے کپڑوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے' میں نے طنزیہ لہجہ میں کہا:

"اچھا! تو جبھی تم ان کپڑوں میں لپٹے ہوئے ہو کہ اگر کوئی تمہیں دیکھے' تو ان بھک منگے فقیروں میں سے کوئی فقیر سمجھے' جو ہاتھوں میں چوبی کشکول لئے لمبے عصا کے سہارے' زمین کا گز بنے پھرتے ہیں۔"

اس نے جواب دیا:

"کوئی انسان نہیں ہے' جو کسی نہ کسی چادر میں لپٹا نہ ہو اور کوئی انسان نہیں ہے' جو کسی نہ کسی چیز کی بھیک نہ مانگتا ہو!"

اس کے ان فقروں پر متعجب ہوتے ہوئے میں نے کہا:

"بہت خوب! لیکن تم ایک مشہور خاندان کے چشم و چراغ ہو۔ اور تمہارا فرض ہے کہ اپنے خاندان کے وقار کی حفاظت کرو۔ تمہاری ظاہری حالت اپنی خاندانی عظمت کے شایان شان ہی ہونی چاہئے!"

پرسکون لہجہ میں اس نے جواب دیا:

"میں مصروف تھا' میرے بھائی! میں مصروف تھا اور میرے پاس اتنا وقت ہی نہ تھا کہ میں اس قسم کی باتوں پر غور کرتا۔ میں ایک ایسے کام میں مصروف تھا' جو کھانے پینے اور پہننے اوڑھنے کے مسائل سے کہیں زیادہ اہم ہے!"

اس کے چہرہ پر گہری فکر کے آثار نمایاں ہو گئے۔ لیکن اس کی آنکھیں برقی قمقمے پر جمی رہیں۔ آخر میں نے اس سے پوچھا:

"تم کس کام میں مشغول تھے؟ سلیم! وہ ایسی کون سی مصروفیت تھی' جس نے تمہیں

اور تمام کاموں سے بے خبر کر رکھا تھا؟"

میری طرف متوجہ ہو کر اس نے جواب دیا:

"میں اس پردہ کو چاک کرنے میں مصروف تھا' جو میرے حافظہ پر پڑا ہوا تھا۔ میں اپنے حافظہ کی کانیں کھودنے میں مصروف تھا۔ میں زمانہ کی اس کتاب کی ورق گردانی میں مصروف تھا' جسے ہم حافظہ کہتے ہیں۔"

یہ الفاظ اس کی زبان سے اس طرح ادا ہوئے' جیسے دور ——— بہت دور خالی وادیوں میں گھنٹیاں بج رہی ہوں۔ اس کے بعد اس نے میری طرف سے نگاہیں پھیر لیں اور پھر اسی برقی قمقمے کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا۔ پہلی بار ——— اپنے اور اس کے زمانہ تعارف میں پہلی بار' میں نے محسوس کیا کہ اس کی روح کے کسے ہوئے تار ذرا ڈھیلے پڑے ہیں۔ اس کے باطن کی کشمکش اور بے چینی نے قدرے سکون و اطمینان کی صورت اختیار کی ہے۔ اس کے پیالے میں دوبارہ شراب انڈیلتے ہوئے میں نے سوال کیا:

"حافظہ کی کانوں اور زمانہ کی اس کتاب سے' جسے ہم حافظہ کہتے ہیں' تمہاری کیا مراد ہے؟ یہ نئی اور انوکھی فکر کیا ہے؟"

اس نے جواب دیا:

"میں نہیں جانتا' تم مجھے کتنا سمجھ سکتے ہو' یا کتنا سمجھنا چاہتے ہو؟ میں خواہ مخواہ ان لوگوں کے سامنے اپنی روح کو پیش کرنے لگتا ہوں' جو روحانیت سے بیگانہ ہیں۔ فضول ان لوگوں کے سامنے اپنی ذات کی تہیں کھولنے لگتا ہوں' جو خود اپنی ہی ذات سے ناآشنا ہیں۔"

میں نے کہا:

"سلیم! میں تمہیں سمجھنا چاہتا ہوں اور اگر مجھے اپنے اس ارادے میں کامیابی نہ ہوئی' تو یقین رکھو! میں اپنے عجز کا اعتراف کر لوں گا۔"

وہ تھوڑی دیر تک خاموش رہا۔ اس کے بعد شراب کا ایک گھونٹ پیا اور کہنے لگا:

"اچھا' تو سنو! اپنے کانوں سے پہلے اپنے دل سے سنو! کبھی تم نے یہ بھی سوچا ہے کہ اپنی پیدائش سے پہلے بھی تم ایک صاحب ادراک ہستی کی حیثیت سے موجود تھے؟"

میری روح اس کے اس سوال سے لرز اٹھی اور میں نے جواب دیا:

"ہاں! میں نے بارہا اس کے متعلق سوچا ہے۔ لیکن ہربار میری مثال اس شخص کی سی ہوئی ہے' جو کسی پرانے شاہ بلوط کے درخت کی جڑ کو اکھاڑنے کے لئے' اس سے چمٹا ہو۔"

اس نے اپنا سلسلہ کلام جاری رکھا:

"کبھی تم نے مرئیات کی طرف سے اپنی آنکھیں اور آوازوں کی طرف سے اپنے کان بند کئے ہیں؟ کبھی تم نے اپنے حواس کو زندگی کے سطحی پہلوؤں پر عمل کرنے سے روکا ہے؟ تاکہ تم حافظہ کی مدد سے اس حالت کی طرف لوٹ سکو' جس میں تم انسان بننے سے پہلے تھے؟"

میں نے کہا:

"نہیں! میں نے ایسا کبھی نہیں کیا!"

وہ بولا:

"لیکن میں نے ایسا کیا ہے! میں اپنی ذات کی گہرائیوں کا کھوج لگانے کے لئے انسانی راہوں سے ہٹا ہوں۔ میں نے اپنی بصیرت کے سامنے وہ خاکے پھیلائے ہیں' جو میرے حافظہ نے اس حالت سے اخذ کر کے اپنی تہوں میں رکھ لئے تھے' جس حالت میں' اس زمین پر نازل ہونے سے پہلے' میں تھا۔"

میں نے پوچھا:

"پھر تم اپنے مقصد کو پہنچ گئے؟ کیا تم نے وجود قبل از وجود کے خاکے اپنے حافظہ کے جیب و دامن میں پالئے؟"

اس نے جواب دیا:

"ہاں! میں اپنے مقصد کو پہنچ گیا۔ حافظہ زمانوں کی امانت گاہ ہے اور ہم میں سے ہر شخص اس امانت گاہ میں داخل ہو کر وہ سب کچھ دیکھ سکتا ہے' جو زمانوں نے اس خزانہ کے گوشوں اور خلاؤں میں جمع کر رکھا ہے حافظہ ایک بے شمار پتیوں والا پھول ہے۔ ہم اگر چاہیں تو مسلسل فکر اور نفس سپردگی کے پردوں سے ان پتیوں کا طواف کر سکتے ہیں تا آں کہ وہ ہماری سوجھ بوجھ کی گرمی سے شگفتہ ہو جائیں۔ جس طرح سورج کی کرنیں گلاب کی پتیوں کو چومتی ہیں اور وہ ان کی حرارت سے کھل جاتی ہیں۔"

وہ تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو گیا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک تبسم نمودار ہوا' جو مسرت سے زیادہ الم سے قریب تھا۔

اس نے کہا:

"برسوں سے تم مجھے "سودائی" کہہ رہے ہو! بلاشبہ تم نے میری حقیقت کو پالیا ہے اور تم میری حالت کو صحیح سمجھتے ہو۔ میں آج بھی ان تصویروں اور پرچھائیوں کے درمیان' جنہیں ہم زندگی کہتے ہیں' کھویا ہوا ہوں۔ اور وہ کون سا انسان ہے' جو یہ دیکھ کر گم نہ ہو جائے کہ اس کی حیات معنوی دو حصوں میں بٹی ہوئی ہے۔ ایک حصہ وہ عالم غیب میں بسر کر رہا ہے اور دوسرا حصہ اس قیاس و مقدار کی دنیا میں گزار رہا ہے۔ وہ کون سا انسان ہے' جو یہ محسوس کر کے آہیں نہ بھرنے لگے کہ اس کی روح دو جذبوں کی کھینچا تانی میں ہے۔ ایک چھپا ہوا جذبہ اور ایک کھلا ہوا جذبہ ——————! وہ کون سا انسان ہے' جو دو مختلف لے کے نغموں کو اپنے کانوں میں سمو سکے' ایک ایتھر کی گہرائیوں سے اترتا ہوا نغمہ اور دوسرا زمین کی گہرائیوں سے ابھرتا ہوا نغمہ!!

ہاں! میں گم گشتہ تھا اور گم گشتہ ہوں۔ لیکن آج میں وہ کچھ جانتا ہوں' جو اپنی جوانی میں نہیں جانتا تھا۔ میں نے تین برس اپنے حافظہ کے سبزہ زاروں کا طواف کیا ہے اور جان لیا ہے کہ ہونے سے پہلے میں کیا تھا؟ وجود میں آنے سے پہلے میں کیسا تھا؟ اس سے پہلے کہ میری ماں مجھے جنم دے' میری نفسی حالت کیا تھی؟ اور اس سے پہلے کہ میری روح اس جسم کو اپنا غلاف بنائے' اس کی کیفیت کیا تھی؟ میں نے اپنا سرچشمہ معلوم کر لیا' اور میں مطمئن ہوں کہ میرے حافظہ میں وہ چیز ہے' جو میرے مرکز کو ثابت کرتی ہے۔"

اس نے اپنا سر' سینہ کی طرف جھکا لیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ اس کا اترا ہوا چہرہ ہاتھی دانت کی ایک مورتی معلوم ہو رہا تھا' جو کسی ماہر سنگ تراش نے کسی نصرانی شہید کی یادگار کے طور پر بنائی ہو۔ میں اس کی کرسی سے ذرا اور قریب ہو گیا اور اس ڈر سے کہ میری بلند آواز اس کے خیالات کا سلسلہ منتشر نہ کر دے' سرگوشی کے لہجہ میں کہا:

"مجھے بتاؤ' سلیم! وہ سب کچھ مجھے بتاؤ! جو تم نے اپنے حافظہ سے حاصل کیا ہے۔ میرے کان سماعت کی پوری قوتوں کے ساتھ تمہاری طرف لگے ہیں۔"

اس نے اپنا سر اٹھایا اور آنکھیں کھولے بغیر جواب دیا:

"مجھے یاد ہے کہ میں فضا میں تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں خلاء میں منڈلاتا پھر رہا تھا۔ کبھی اڑ جاتا' کبھی اتر آتا ---------- میں ہوا کے ساتھ دوڑ رہا تھا۔ جب وہ ٹھہرتی' تو میں بھی ٹھہر جاتا۔ لیکن مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میں ایک ہی وقت میں ہر جگہ ہوں اور ایک ہی جگہ ہر وقت میں۔ میں سورج کی کرنوں میں تھا۔ نہیں ----! بلکہ میں خود ہی کرنیں تھا۔ میں نہیں جانتا کہ میں ایتھر کا ایک ذرہ تھا' یا پورا ایتھر ---- مجھے معلوم نہیں کہ میں زندگی کی خواہشوں اور کشمکش کا ایک جزو تھا' یا خود ہی زندگی کی ہر خواہش اور ہر کشمکش! ---------- میں اپنے آپ سے کہتا تھا: "میں' میں ہوں!" لیکن اس "میں" سے اس وقت وہ چیز مراد نہ تھی' جو لکیروں' رنگوں اور ذاتی و انفرادی خصوصیات میں محدود ہوتی ہے ---------- نہیں! میں ایک فرد نہ تھا' میں ایک ذرہ نہ تھا' میں ایک جزو نہ تھا' میں ایک عنصر نہ تھا' جو اپنی وحدانیت کی بنا پر' ان عناصر سے الگ ہوتا ہے' جن کی اپنی اپنی وحدانیت انہیں ایک دوسرے سے منفرد رکھتی ہے۔ بلکہ میں تمام عناصر کا مجموعہ تھا' جو آپس میں مل کر ایک ہو گئے تھے۔ یہ عناصر ایک مقناطیسی قوت سے چپٹے ہوئے تھے' جس کی تعریف میں اپنے اس قول کے سوا کہ "میں' میں ہوں۔" اور کچھ نہیں کر سکتا ---------- میں ماضی میں یہ کچھ تھا ---------- میں نے ماضی کہا ہے اور یہ' وہ مبہم کلمہ ہے' جس کے معنی میں پورے طور پر نہیں جانتا۔ کبھی ماضی' حال اور مستقبل بن جاتا ہے اور کبھی وہاں ماضی' حال اور مستقبل سرے سے ہوتے ہی نہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ جسے ہم "زمانہ" کے نام سے پکارتے ہیں' میں اسے نہیں جانتا' جس طرح میں "مکان" کے معنی نہیں سمجھتا۔ میں جب کبھی ان دو لفظوں ---------- زمان و مکان ---------- کے متعلق سوچتا ہوں' تو بڑی مشکل میں پڑ جاتا ہوں۔ میری ذات خود اپنے متعلق شبہ میں مبتلا ہو جاتی ہے اور میری فکر دل بادل دھند کی شکل اختیار کر لیتی ہے' جو ٹیلوں اور گھاٹیوں میں رواں دواں ہو ---------- لیکن جو بات مجھے اچھی طرح یاد ہے' وہ یہ ہے کہ پہلے میں ایک حالت میں تھا اور بعد کو دوسری حالت میں آ گیا۔ میں بڑا تھا' چھوٹا ہو گیا۔ فراخ تھا' تنگ ہو گیا۔ بے آغاز و بے انجام تھا۔ ابتدا و انتہا میں محدود ہو گیا۔ میں ایک قوت تھا' جو اپنے نفس کا عرفان رکھتی تھی اور ایک کمزوری ہو گیا' جو اپنے نفس کی معرفت کو ترستی ہے۔ میں ایک روح تھا' جو ہر سطح پر منڈلاتی اور ہر چیز میں در آتی تھی اور جسم ہو گیا' جو آہستہ آہستہ رینگتا ہے اور اپنے ہاتھ پاؤں کو اس طرح گھسیٹتا ہے' گویا بھاری زنجیریں ہیں ---------- "میں تھا اور ہو گیا ---- میں تھا اور ہو گیا ---- میں تھا اور ہو گیا" ---------- یہ الفاظ میں دہراتا رہا۔ یہاں تک کہ میرا اپنے وجدان سے وہی رشتہ ہو گیا' جو رشتہ ڈوری سے اس کے دونوں سروں کا ہوتا ہے۔

بیس برس سے میں لگاتار اپنی عقلی قوتیں صرف کر رہا ہوں۔ اس امید میں کہ شاید اس ہستی کے اس ہستی میں تبدیل ہونے کی کیفیت معلوم کر لوں لیکن ابھی تک میں پوری طرح کامیاب نہیں ہوا اور میرا خیال ہے' آئندہ بھی کامیاب نہیں ہو سکوں گا۔ تاہم ایک چیز ---------- جو بیک وقت واضح بھی ہے اور مبہم بھی ---------- مجھے یاد ہے اور وہ یہ کہ جب میں ایتھر تھا' تو کسی ایک زمانہ میں مجھے ایک ہولناک حادثہ پیش آیا۔ میرے باطن میں ---------- میرے محیط میں ---------- اس عالم میں' جسے میں "میں' میں ہوں" کہہ کر پکارتا تھا' ایک گولا سا پھٹا اور وہ سارا عالم ایک جوش کھاتی' ایک ابلتی ہنڈیا میں تبدیل ہو گیا۔ اس کے بعد اس میں ایک ہنگامہ برپا ہوا' ایک تہ و بالا کر دینے والی بھیانک آندھی اٹھی' جس کے جھکڑوں نے میری ہستی کے ہر سکون کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا۔ چنانچہ وہ اطمینان' جو میرا مالک تھا اور جس کا میں مالک تھا' دفعتاً" ایک خوفناک گرج سے بدل گیا اور وہ سلامتی' جو مجھ سے ہمکنار تھی اور جس سے میں ہمکنار تھا' چمکتی بجلی بن گئی۔ وہ معرفت ---------- وہ ہمہ گیر معرفت' جو ہر چیز کو سینہ سے لگاتی ہے ---------- وہ غیر محدود معرفت' جو ہر چیز کے بھیدوں اور باریکیوں کو واضح کرتی ہے' دوہری پریشانی میں گھر گئی ---- ایک پریشانی پر دوسری پریشانی۔ اور وہ سماوی راز ---------- وہ راز' جو میری گہرائیوں میں جولاں کار تھا' بے شمار درد کی ماری عورتوں کی طرح چیخنے' لاتعداد بھوکے شیروں کی طرح دہاڑنے اور ان گنت تانبے کی گھنٹیوں کی طرح شور مچانے لگا ---------- یہ طوفان نہ معلوم کتنی دیر تک رہا۔ ہو سکتا ہے! ایک منٹ رہا ہو' اور ہو سکتا ہے' پورا زمانہ اس میں صرف ہو گیا ہو ---------- اس کے بعد ہر حرکت ٹھہر گئی۔ ہر آواز خاموش اور ہر پریشانی جامد ہو گئی۔ اب میں ساکن تھا۔ لیکن میرا یہ سکون' اس شخص کا سا سکون تھا' جسے چاروں طرف سے بھینچ لیا گیا ہو۔ زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ میں نے اس

حالت کے تمام تر دباؤ اور تنگی کے باوجود اپنے تئیں اس کے حوالے کر دیا ——— اس کے بعد میں نے ایک بوجھل اور زبردست اونگھ محسوس کی اور پھر گہری تاریکی میں گہری نیند سو گیا۔"

یہ کہہ کر سلیم خاموش ہو گیا۔ اس کے چہرے پر ماندگی اور تکان کے آثار نمایاں تھے۔ ہانپتے ہوئے اس نے اپنا سر کرسی کی پشت سے لگا لیا' جیسے کوئی گھوڑا' دوڑ کے بعد ہانپتا ہے۔ اس کے بعد اس نے میری طرف ان نگاہوں سے دیکھا جن سے لطیف شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔

"اس کے بعد ——— اس طوفان اور اس سکوت کے بعد ———

بوجھل اونگھ اور گہری نیند کے بعد ——— میں بیدار ہوا۔ لیکن میری بیداری اس مخمور کی بیداری تھی' جس کے وجدان پر ہوش میں آنے کے بعد بھی بے ہوشی کا پردہ پڑا ہو۔ میں نے خود کو ایک ناتواں بچہ پایا' جو ایک عورت کی گود میں تھا۔ وہ عورت آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مجھے دیکھ رہی تھی۔ اور ایک مہربان و شیریں مسکراہٹ اس کے لبوں پر کھیل رہی تھی۔"

میں نے محسوس کیا کہ اس کے فضائی سفر نے اس کی روح اور جسم کو نڈھال کر دیا ہے اور کہا:

"بس کرو! بھائی' بس کرو!! تم نے میرے سامنے وہ باتیں بیان کی ہیں' جو آج تک کوئی انسان نہیں کر سکا۔ بس اب کچھ نہ کہو! تمہیں اس وقت آرام و سکون کی ضرورت ہے۔"

اس نے کہا:

"میرے پاس کہنے کے لئے اب رہ بھی کیا گیا ہے۔ جو کچھ مجھے یاد تھا' جو کچھ میں نے جانا تھا' وہ سب تمہارے سامنے رکھ دیا۔ لیکن اب بھی میں اپنے علم اور اپنی یاد کے درمیان کھویا ہوا ہوں ——— ہاں! میں اب بھی کھویا ہوا ہوں' میں ابھی بھی کھویا ہوا ہوں۔"

ایک گھنٹہ گزر گیا اور ہم دونوں میں سے کسی نے کوئی بات نہ کی۔ وہ وقت اور اس کی تاثیر' میں جیتے جی نہیں بھول سکتا۔ اس لئے کہ اس نے میری روح میں ایک نیا احساس جگایا' میرے دل میں پرانی شراب انڈیلی اور میرے افکار کو سنہری لباس پہنایا۔

آدھی رات ہونے پر سلیم کھڑا ہوا اور کہنے لگا:

"ہم بہت دیر جاگے۔ اب میں چلتا ہوں!"

میں نے کہا:

"میرے بھائی! اب نہ جاؤ! آج کی رات میرے مہمان رہو۔"

اس نے جواب دیا:

"نہیں! نہیں!! میں ایسے گھر میں نہیں ٹھہر سکتا' جس کی فضا میں آوازیں کانپ رہی ہوں اور گوشوں میں سائے رینگ رہے ہوں۔"

وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا دروازہ کی طرف چلا اور اتنی تیزی سے نکل گیا' جیسے کوئی جلتے مکان سے بھاگ کر نکلتا ہے۔

اس وقت سے لے کر آج تک' جب بھی مجھے سلیم کا خیال آتا ہے' میری فکر ہر اس پیمانہ کو ریزہ ریزہ کر دیتی ہے' جو زمانہ کو شب و روز میں تقسیم کرتا ہے' جب بھی اس کی باتیں یاد کرتا ہوں' ہر اس امتیاز سے کنارہ کش ہو جاتا ہوں' جو مقام کو دائیں اور بائیں سمتوں میں دور کرتا ہے۔ جب بھی اس کا چہرہ اور اس کی آواز کا ترنم یاد آتا ہے' میری عقل ہستی کے ظاہری اور باطنی پہلوؤں میں گم ہو جاتی ہے۔

نہیں! میں نے سلیم سا آدمی دیکھا ہے نہ کبھی دیکھوں گا۔ وہ لوگوں میں ہے' لیکن لوگوں میں سے نہیں ہے۔ دنیا میں ہے' لیکن دنیا والوں میں سے نہیں ہے۔ میں نے بارہا اپنے آپ سے پوچھا ہے کہ میں سلیم کے ساتھ چند گھنٹے اس کمرہ میں جاگا ہوں یا میں نے اس کے ہمراہ فضائی طبقات میں ایک صدی بسر کی ہے؟ میں نے بارہا اپنے حافظہ سے وضاحت چاہی ہے کہ میں اس سے بیداری میں ملا تھا' یا خواب میں؟

مگر ہاں! انوکھی حقیقتیں ہم پر بیداری ہی میں ظاہر ہوتی ہیں اور سلیم بلاشبہ ایک انوکھی حقیقت ہے!

———○———

درویش بادشاہ

لوگوں نے مجھے بتایا کہ پہاڑوں کے درمیان ایک کنج میں ایک نوجوان تنہا رہتا ہے۔ جو کبھی ان دو دریاؤں کے پار ایک وسیع ملک کا تاجدار تھا۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ وہ اپنی مرضی سے تاج و تخت اور اپنے پر عظمت ملک کو خیرباد کہہ کر اس جنگل میں آ بسا ہے۔

اور میں نے کہا میں اس شخص کو تلاش کروں گا اور اس کے دل کا راز معلوم کروں گا۔ کیونکہ وہ شخص جس نے تاج و تخت چھوڑا ہو یقیناً ایک سلطنت سے زیادہ حیثیت کا مالک ہے۔

اسی دن میں نے اس جنگل کی راہ لی۔ جہاں وہ رہتا تھا۔ اور میں نے اس کا کھوج پا لیا۔ وہ سرو کے ایک درخت کی چھاؤں میں بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھڑی تھی۔ عصائے شاہی کی طرح۔ میں یوں آداب بجا لایا۔ جیسے میں کسی بادشاہ کا آداب بجا لاتا۔ اس نے میری طرف رخ پھیرا اور نرم لہجے میں کہا۔ "تم اس پرسکون جنگل میں کیوں آئے ہو۔ کیا تم ان ہرے بھرے درختوں کی چھاؤں میں اپنے آپ کو ڈھونڈ رہے ہو۔ یا اس دھندلکے میں گھر واپس جا رہے ہو؟"

میں نے جواب دیا۔ "میں صرف تمہیں دیکھنے آیا ہوں۔ کیونکہ میں یہ معلوم کرنے کا تمنائی ہوں۔ کہ تم نے جنگل کے لئے حکومت کیوں چھوڑی؟"

اس نے کہا۔ "میری کہانی مختصر ہے۔ کیونکہ یہ بلبلا بہت جلد ٹوٹ گیا۔ یہ واقعہ یوں ہوا۔

ایک دن میں اپنے محل کے دریچے میں بیٹھا تھا۔ میرا وزیر اور ایک غیر ملک کا سفیر میرے باغ میں ٹہل رہے تھے۔ جب وہ میرے دریچے کے قریب پہنچے تو وزیر اپنے متعلق کہہ رہا تھا۔ "میں بادشاہ کی طرح ہوں۔۔۔۔ مجھے بھی تیز شراب کی پیاس ہے۔۔۔۔ مجھے بھی وقت اور تقدیر کے کھیلوں کا شوق ہے۔۔۔۔ میں بھی اپنے آقا کی طرح پرجوش مزاج رکھتا

ہوں۔"

یہ کہہ کر وزیر اور سفیر درختوں میں غائب ہو گئے۔ لیکن چند منٹوں میں وہ واپس آ گئے۔ اب کی بار وزیر میرے متعلق باتیں کر رہا تھا۔ "میرا آقا ------- بادشاہ سلامت میری طرح ایک اچھا نشانچی ہے۔۔۔۔ وہ بھی میری طرح موسیقی کا رسیا ہے۔۔۔۔ اور دن میں تین بار غسل کرتا ہے۔"

تھوڑی دیر بعد اس نے سلسلہ کلام جاری رکھا۔

"اسی دن شام کو میں ایک لبادہ پہن کر محل سے نکل آیا۔ کیونکہ ان لوگوں کا حکمران بننا مجھے گوارہ نہ تھا۔ جو میرے عیوب اختیار کریں۔ اور میری نیکیوں کو اپنی طرف منسوب کریں۔"

اور میں نے کہا۔ "واقعی یہ ایک انوکھی اور حیران کن بات ہے۔"

اور اس نے کہا۔ "نہیں میرے دوست۔ تم نے میری خاموشیوں کے دروازے کو کھٹکھٹایا۔ اور تمہیں کیا ملا بہت ہی کم' آخر کون ہے۔ جو حکومت کو اس جنگل کی خاطر نہ چھوڑ دے۔ جہاں کے موسم ایک نہ ختم ہونے والے رقص و نغمے میں سرمست رہتے ہیں۔ بہت سے لوگ ہو گزرے ہیں۔ جنہوں نے تنہائی اور اکیلے میں اپنی صحبت کا خود لطف اٹھانے سے کم تر چیز کے لئے اپنی حکومت چھوڑ دی۔ بے شمار عقاب ہیں جو عالم بالا کو چھوڑ کر چھچھوندروں کے ساتھ آ کر رہتے ہیں کہ وہ زمین کی تہ کا راز پا سکیں۔ ایسے لوگ بھی ہیں۔ جو سپنوں کی بادشاہت کو خیرباد کہہ دیتے ہیں۔ تاکہ وہ بے خواب کی دنیا سے دور نظر نہ آئیں۔ اور پھر ایسے بھی ہیں۔ جو عریانی کی دنیا کو ترک کر دیتے ہیں۔ اور اپنی روحوں کو ڈھانپ لیتے ہیں۔ تاکہ دوسرے لوگ عریاں صداقت اور بے نقاب حقیقت کو دیکھ کر شرما نہ جائیں۔ اور ان سب سے بلند مرتبہ وہ ہے جس نے غم و الم کی دنیا کو خیرباد کہا۔ کہ وہ مغرور اور خودپسند نظر نہ آئے۔"

پھر وہ اپنی چھڑی کا سہارا لیتے ہوئے اٹھا اور کہا۔ "اب تم اپنے شہر میں جاؤ' اور اس کے دروازے پر بیٹھو اور ان لوگوں پر نگاہ رکھو جو وہاں آتے ہیں اور وہاں سے مڑ جاتے ہیں۔ اور اس شخص کی تلاش کرو۔ جو پیدائشی بادشاہ ہے۔ لیکن مملکت کے بغیر ہے۔ اور اسے دیکھو جو جسمانی طور پر دوسروں کا محکوم ہے۔ لیکن روحوں پر حکومت کرتا ہے۔ مگر

نہ تو خود اسے اس بات کا احساس ہے اور نہ اس کی رعایا ہی یہ جانتی ہے۔ اور اس پر بھی نگاہ رکھو' جو بظاہر حکومت کرتا ہے لیکن دراصل وہ اپنے ہی غلاموں کا غلام ہے۔"

یہ باتیں کہہ چکنے کے بعد وہ مجھ پر مسکرا دیا۔ اور اس کے ہونٹوں پر ہزار تبسم تھیں۔ پھر اس نے رخ پھیرا اور جنگل کی گہرائیوں میں چلا گیا۔

میں شہر کو لوٹا۔ اور اس کے حسب منشا شہر کے دروازے پر بیٹھ کر آنے جانے والوں کو دیکھتا رہا۔ اس دن سے لے کر آج تک بے شمار ہوئے ہیں۔ جن کے سائے مجھ پر سے گزرے ہیں۔ اور بہت کم ایسے لوگ ہیں۔ جن پر سے میرا سایہ گزرا ہے۔

آخری پہرہ

بہت رات گزرے۔ جب صبح کی پہلی کرن نے ہوا پر سانس لیا۔

پیش رو'

جو اپنے آپ کو ایک ان سنی آواز کی صدائے بازگشت کہتا ہے۔ اپنی خواب گاہ سے نکل کر اپنے مکان کی چھت پر چلا گیا۔ وہ چھت پر کافی دیر تک ساکت کھڑا رہا اور سوئے ہوئے شہر کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے اپنا سر اٹھایا۔ گویا سونے والوں کی بیدار روحیں اس کے گرد جمع ہو گئی ہوں۔ اور اس نے اپنے لب کھولے اور بولا۔

میرے دوستو اور میرے ہمسایو اور تم جو روزانہ میرے دروازے سے گزرتے ہو۔

میں تم سے سوتے میں مخاطب ہونا چاہتا ہوں۔

میں تمہارے خوابوں کی وادی میں بے کھٹکے اور تنہا پھروں گا۔ کیونکہ تم بیداری کے عالم میں غافل ہو۔ اور تمہارے' صداؤں سے گراں بار کان بہرے ہیں۔

میں نے مدتوں تم سے محبت کی اور خوب کی۔

میں نے تم میں سے ایک ایک کے ساتھ اس طرح محبت کی گویا وہ ایک سب کچھ ہے۔ اور سب سے اس طرح محبت کی گویا وہ سب ایک ہیں۔ اور میں اپنے دل کی فصل بہار میں تمہارے باغوں میں گایا کیا۔ اور جب دل کا موسم گرما آیا —— تو میں تمہارے خرمنوں کو دیکھا کیا۔

مجھے تم سب سے محبت تھی ہاں مجھے تم سب سے محبت ہے۔

قوی ہیکل —— بالشتیے —— کوڑھی —— مقدس پیشوا ——

اور اس سے بھی جو پہاڑوں پر ناچ کر اپنے دن گزار دیتا ہے۔

تم توانا ؤ —— !

میں نے تم سے محبت کی۔ گو تمہارے آہنی سموں کے نشان میری جلد پر بدستور نقش

ہیں۔

اور تم ناتوانو ------------ !

میں نے تم سے بھی محبت کی۔ گو تم نے میرا عقیدہ مجھ سے چھین لیا۔ اور میرا صبرو تحمل اکارت گیا۔

اور تم مالدارو ------------ !

میں نے تم سے پیار کیا۔ گو تمہارے شہد کا ذائقہ میرے منہ میں تلخ ہو گیا۔

اور تم نادارو ------------ !

میں نے تم سے بھی محبت کی۔ گو تم میرے خالی ہاتھ کی شرم جانتے تھے۔

تم شاعرو ------------ !

بھدی بانسری اور اندھی انگلیوں والے شاعرو ------------ !!

میں نے اپنی نفس پرستی کی خاطر تم سے بھی محبت کی۔

اور تم عالمو ------------ !

میں نے تم سے بھی پیار کیا۔ جو ہمیشہ ان میدانوں میں جہاں سے کوزہ گر مٹی لاتے ہیں۔ بوسیدہ کفن جمع کرتے رہے ہو۔

تم مذہبی پیشواؤ ------------ !

میں نے تم سے محبت کی۔ جو دیروز کی خاموشیوں میں بیٹھ کر فردا کی قسمت کا جائزہ لیتے رہتے ہو۔

اور تم دیوتاؤں کے پوجنے والو! یہ دیوتا خود تمہاری اپنی خواہشیں ہیں۔ میں نے تم سے بھی محبت کی۔

اور اے پیاسی عورت ------------ !

جس کا جام ہمیشہ لبریز رہا۔ میں نے تمہاری فطرت کو پہچانا اور تم سے پیار کیا۔

اور اے بے چین راتوں والی عورت!

میں نے تم پر رحم کھا کر تم سے محبت کی!

تم باتونیو ------------ !

میں نے تم سے یہ کہتے ہوئے محبت کی۔ کہ زندگی کو اپنے متعلق بہت کچھ کہنا ہے۔

اور تم گونگو ------------ !

میں نے تم سے اپنی دبی زبان میں یہ کہتے ہوئے محبت کی۔ کہ اس خاموشی میں وہ کچھ نہیں کہتا' جو میں لفظوں میں سننا چاہتا ہوں۔

اور اے منصفو اور نقادو۔

میں نے تم سے بھی محبت کی۔ حالانکہ جب تم نے مجھے سولی پر چڑھتے دیکھا۔ تو تم نے کہا۔ دیکھو اس کا خون کتنے ترنم سے بہہ رہا ہے۔ اور اس کی سفید جلد پر خون کا نشان کتنا بھلا معلوم ہوتا ہے۔

اے جوانو اور بوڑھو!

بید مجنوں اور شاہ بلوط کے درختو۔

میں نے تم سے محبت کی ------------ لیکن واحسرتا تم نے میرے دل میں محبت کی فراوانی دیکھ کر مجھ سے منہ پھیر لیا۔

تم ایک پیالے میں سے محبت کے گھونٹ پینا چاہتے ہو۔ لیکن ایک متلاطم دریا سے سیر ہونا نہیں چاہتے۔

تم محبت کی خفیف صدا سننے کے خواہشمند ہو۔

لیکن جب محبت نعرہ لگاتی ہے۔ تو تم اپنے کانوں میں روئی ٹھونس لیتے ہو۔

اور چونکہ مجھے تم سے محبت تھی' تم نے کہا۔ اس کا دل بہت ہی نرم اور درد آشنا ہے۔ اور یہ شخص دیکھ بھال کر رستے پر نہیں چلتا۔

یہ ایک محتاج کی محبت ہے۔ جو شاہانہ ضیافتوں میں شریک ہوتا ہوا بھی روٹی کے ٹکڑے چنتا ہے۔

یہ ایک کمزور کی محبت ہے۔ کیونکہ طاقتور ہمیشہ طاقتوروں سے محبت کرتا ہے۔

اور چونکہ تم سے مجھے بے پایاں محبت تھی' یہ ایک اندھے شخص کی محبت ہے جسے نہ تو کسی کے حسن کا علم ہے اور نہ کسی کی بدصورتی کا احساس ہے۔

اور یہ ایسے بدذوق کی محبت ہے جو سرکے کو شراب کی طرح پی جاتا ہے۔

اور یہ ایک گستاخ اور خودپسند کی محبت ہے۔

آخر ایک اجنبی سے ماں اور باپ ------------ بہن اور بھائی کا رشتہ کیونکر ہو سکتا ہے۔

تم نے یہ اور بہت سی دوسری باتیں بھی کہیں۔ منڈی میں بارہا تمہاری انگلیاں میری جانب اٹھیں اور تم نے طنزیہ پیرائے میں کہا۔ دیکھو وہ جاتا ہے سدا جوان اور بے رتا انسان' جو عین دوپہر کے وقت ہمارے بچوں سے کھیل کھیلتا ہے۔ اور شام کو ہمارے بزرگوں کی صحبت میں بیٹھ کر دانشمندی اور فہم و ذکاوت کا روپ دھار لیتا ہے۔

اور میں نے کہا۔ میں انہیں سب سے زیادہ پیار کروں گا۔ ہاں بہت زیادہ۔

میں اپنی محبت کو ظاہری نفرت میں چھپا لوں گا۔ اور اپنے نرم جذبات پر تلخی کا پردہ ڈال لوں گا۔

میں آہنی نقاب پہن لوں گا اور ان سے مسلح ہو کر اور زرہ بکتر لگا کر ملوں گا۔

پھر میں نے تمہارے زخموں پر اپنا بھاری ہاتھ رکھ دیا اور رات کے طوفان کی مانند میں تمہارے کانوں میں گرجا۔

مکان کی چھت پر سے میں نے اعلان کیا۔ کہ تم گندم نما جو فروش ہو۔

غلط منطقی ——— فریب کار ——— جھوٹے اور خالی زمین کے بلبلے ہو۔

تم میں سے جو کوتاہ اندیش ہیں میں نے انہیں اندھے چمگادڑ کہہ کر بددعا دی۔

اور جو دنیاوی مفاد سے زیادہ گھرے ہوئے ہیں۔ انہیں بے روح چھچھوندر کہا۔

اور تم میں جو فصیح باتیں کرتے تھے۔ انہیں کانٹے دار زبانیں کہا———

اور جو پتھریلے لبوں والے سادہ لوح اور بے سلیقہ لوگ ہیں۔ میں نے کہا یہ مردہ ہیں۔ اور یہ بار بار مرنے سے کبھی نہیں تھکتے۔

اور جو دنیوی علم کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ میں نے انہیں مقدس روح کا باغی قرار دیا۔

اور وہ جو روح سے ہمکنار ہونا چاہتے ہیں۔ انہیں سائے کے شکاری کہا۔

اور وہ جو اپنے جال پایاب پانیوں میں ڈالتے ہیں۔ اپنے سائے کے سوا کچھ نہیں شکار کرتے۔

اس طرح میرے ہونٹوں نے بظاہر تمہیں مطعون کیا۔ لیکن میرا دل خون کے آنسو روتا تھا۔ اور اس نے تمہیں محبت آمیز ناموں سے پکارا۔

یہ محبت ہی تو تھی'۔ جو اپنے ہی عنصر سے ضربیں کھا کر بول رہی تھی۔

یہ غرور تھا۔ جو نیم بسمل ہو کر خاک میں تڑپ رہا تھا۔

یہ تمہاری محبت کے لئے میری بھوک ہی تو تھی۔ جو چھت پر جوش میں تھی۔ جبکہ میری اپنی محبت خاموشی میں دوزانو ہو کر تم سے معافیاں مانگ رہی تھی۔

لیکن وہ دیکھو معجزہ!

یہ میرا بہروپ تھا۔ جس نے تمہاری آنکھیں کھول دیں اور بظاہر میری نفرت نے تمہارے دلوں کے دروازے وا کر دئے۔

اور اب تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔

تم ان تلواروں کو پوجتے ہو' جو تمہیں کاٹتی ہیں۔

اور ان تیروں کو چومتے ہو' جو تمہارے سینوں میں پیوست ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ زخمی ہو کر تم مطمئن ہو جاتے ہو اور جب تم نے اپنا ہی لہو پیا ہو تو تمہیں نشہ ہو جاتا ہے۔

ان پروانوں کی طرح جو شعلے پر مرمٹنے کے لئے بیتاب ہوتے ہیں۔ تم میرے باغ میں ہر روز جمع ہوتے ہو۔ اور اپنی قسمت کے جالے کو تار تار ہوتے دیکھ کر اپنے متحیر چہرے اٹھا کر اور سحرزدہ آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہو' اور دبی زبان سے ایک دوسرے کو کہتے ہو۔

اس میں خدائی نور دکھائی پڑتا ہے اور اس کے کلام میں ازمنہ قدیم کے پیغامبروں ایسی تاثیر ہے۔ اس نے ہماری روحوں کو بے نقاب کر دیا ہے' اور ہمارے دلوں کے قفل توڑ ڈالے ہیں۔ اور اس عقاب کی طرح جو لومڑوں کے طور طریقوں سے خوب واقف ہوتا ہے۔ اس کو ہمارے سب ڈھنگ معلوم ہیں۔

ہاں سچ تو یہ ہے' میں تمہارے طور طریق جانتا ہوں۔ لیکن ایسے ہی جیسے عقاب اپنے بچوں کی حرکات کو بخوبی سمجھتا ہے۔ اور میں اپنے راز کھول دینا چاہتا ہوں۔ لیکن میں اپنی ضرورت میں تمہارے نزدیک رہنا چاہتا ہوں۔ مجھے تمہاری قربت مرغوب ہے۔ مگر میں دور دور رہنے کا بہانہ کرتا ہوں۔

میں تمہاری محبت کے مدوجزر سے واقف ہوں۔ پھر بھی میں اپنی محبت کے طوفان کی نگہبانی کرتا ہوں۔

یہ کہہ چکنے کے بعد پیش رونے اپنے چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا۔ اور زار زار رو دیا۔ کیونکہ وہ اپنے دل میں جانتا تھا۔ کہ جو محبت عریاں ہو کر رسوا ہو جائے۔ اس کا مرتبہ اس محبت سے بہت بلند ہوتا ہے۔ جو چھپ چھپا کر کامرانی سے ہمکنار ہونا چاہتی ہے اور وہ شرمسار ہو گیا۔

لیکن یکایک اس نے اپنا سر اٹھایا۔ اور جیسے کوئی خواب سے بیدار ہو گیا ہو۔ اس نے اپنے بازو پھیلائے اور کہا۔

رات ختم ہوئی ——— ہم رات کے بچے مرجائیں گے۔

جب صبح صادق کی روشنی پہاڑیوں پر اچھلتی ہوئی آئے گی تو ہماری ہی راکھ میں سے ایک عظیم تر محبت پیدا ہو گی وہ محبت سورج پر قہقہہ زن ہونے والی محبت ہو گی ——— اور لافانی۔

———○———

ناقد

ایک رات کا ذکر ہے کہ ایک آدمی گھوڑے پر سوار سمندر کی طرف سفر کرتا ہوا سڑک کے کنارے ایک سرائے میں پہنچا۔ وہ اترا۔ اور سمندر کی جانب سفر کرنے والے سواروں کی طرح رات اور انسانیت پر اعتماد رکھتے ہوئے اپنے گھوڑے کو سرائے کے دروازے کے قریب درخت سے باندھا اور سرائے میں چلا گیا۔

آدھی رات کے وقت جب تمام لوگ سو رہے تھے۔ ایک چور آیا۔ اور مسافر کا گھوڑا چرا لے گیا۔

صبح وہ آدمی اٹھا۔ اور دیکھا۔ کہ اس کا گھوڑا چوری ہو گیا ہے۔ وہ گھوڑا چرائے جانے پر بے حد غمگین ہوا' اور نیز اس بات پر اسے بے حد افسوس ہوا کہ ایک انسان نے اپنے دل کو گھوڑا چرانے کے خیال سے ملوث کیا۔

تب سرائے کے دوسرے مسافر آئے اور اس کے گرد کھڑے ہو کر باتیں کرنے لگے۔

پہلے آدمی نے کہا۔ "کیا یہ تمہاری حماقت نہیں۔ کہ تم نے گھوڑے کو اصطبل سے باہر باندھا۔"

دوسرے نے کہا۔ "اور یہ اس سے بڑھ کر حماقت ہے کہ گھوڑے کو چھنال نہیں لگائی۔"

تیسرے نے کہا۔ "اور یہ حماقت کی انتہا ہے کہ سمندر کی طرف گھوڑے پر سفر کیا جائے۔"

چوتھے نے کہا۔ "صرف ست اور کاہل لوگ ہی گھوڑے رکھتے ہیں۔"

تب مسافر بے حد حیران ہوا۔ آخر کار چلایا۔ "میرے دوستو کیا تم اس لئے میری غلطیوں اور کوتاہیوں کو گنوا رہے ہو۔ کہ میرا گھوڑا چوری ہو گیا۔ لیکن عجوبہ یہ ہے۔ کہ تم نے ایک لفظ بھی اس شخص کے متعلق نہیں کہا۔ جس نے میرا گھوڑا چرایا!

———○———

قانون

آدم کے تین بیٹے کل زندگی کی شاخوں پر جھول رہے تھے۔ لیکن آج وہ موت کی آغوش میں ہیں۔

تینوں نے انسانوں کو ناموس سے روشناس کرنے کی غلطی کی۔ اندھے قانون نے ہاتھ لمبا کیا۔ اور انہیں بے رحمی سے کچل کر رکھ دیا۔

تینوں کو جہالت نے مجرم گردانا۔ کیونکہ وہ کمزور تھے۔ قانون نے انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا۔ کیونکہ وہ طاقت ور ہے۔

ایک شخص نے ایک اور شخص کو قتل کر دیا۔ لوگوں نے کہا۔ "یہ قاتل ہے خونی ہے۔"

قاضی نے اسے موت کی سزا دیدی۔

تو لوگوں نے کہا "انصاف پسند قاضی۔"

ایک شخص نے روپیہ حاصل کرنے کی کوشش کی۔ لوگوں نے کہا۔ "یہ چور ہے۔"

قاضی نے اسے قید کی سزا دی۔

لوگوں نے کہا۔ "نیک کردار قاضی۔"

ایک عورت نے خاوند کی خیانت کی

لوگوں نے کہا۔ "یہ بدبخت زانیہ ہے۔"

قاضی نے اسے سب کے سامنے برہنہ کر کے پتھر برسوائے'

لوگوں نے کہا۔ "شرافت کا پتلا قاضی۔"

خونریزی حرام ہے' لیکن قاضی کے لئے کس نے حلال کر دی

مال لینا جرم ہے لیکن آزادی چھین لینے کو بزرگی کس نے کہا

عورت کے لئے زنا برا ہے۔ لیکن جسم کو پتھر مارنا کس نے نیکی کہا ہے'

برائی کا مقابلہ اس سے زیادہ برائی کے ساتھ کرتے ہو۔ اور کہتے ہو کہ یہ قانون ہے۔

بدی کے ساتھ اس سے زیادہ بدی سے لڑتے ہو۔ اور اسے ناموس کا نام دیتے ہو۔

جرم کو اس سے بڑے جرم کے ساتھ مغلوب کرنے کی کوشش کرتے ہو۔ اور اسے انصاف بتاتے ہو۔

کیا قاضی نے اپنی زندگی میں کسی سے دشمنی نہیں کی؟

کیا اس نے اپنے کمزور پیروؤں سے کبھی پیسہ نہیں چھینا؟

کیا اس نے ایک حسین عورت سے اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل نہیں چاہی؟

کیا وہ ان خطاؤں سے پاک تھا۔ کہ اس کے لئے قاتل کو پھانسی دینا۔ چور کو سزا دینا۔ اور زانیہ پر پتھر برسوانا جائز ہو گیا۔

کون ہیں وہ جنہوں نے اس قاتل کو سولی پر لٹکایا؟

کیا وہ فرشتے تھے۔ جو آسمانوں سے اتر کر آئے؟ یا وہ انسان تھے جو ہر ہاتھ آنے والی چیز کو غصب کرتے اور چراتے۔

اس قاتل کا سر کس نے قلم کیا؟ کیا فرشتے ملاء اعلیٰ سے اتر آئے تھے یا وہ سپاہی تھے۔ جو ہر اچھی چیز کے لئے خون کی ندیاں بہاتے ہیں۔

اس زانیہ کو سنگسار کس نے کیا۔ کیا وہ راہب تھے؟ جو عبادت خانوں سے نکل کر آئے یا وہ انسان جن کی بزرگی کے پردوں میں تمام کمینہ حرکتیں چھپی ہوتی ہیں۔

قانون ——؟ قانون کیا چیز ہے۔؟

کس نے اسے سورج کی روشنی کے ساتھ آسمان سے نیچے اترتے دیکھا۔ تاکہ انسان کے متعلق اس کی مشیت کو معلوم کرے۔

کس آواز میں فرشتے لوگوں میں پکارتے پھرے کہ کمزوروں پر زندگی کا نور حرام کر دو' گرتوں کو تلوار کے واروں سے فنا کر دو اور خطا کاروں کو لوہے کی تیز دھاروں سے تہس نہس کر کے رکھ دو۔

دو بچے

شاہی محل کے سامنے ہزاروں آدمی جمع تھے۔ ان کی نگاہیں محل کی بالکنی کی طرف متوجہ تھیں۔ چہروں سے غیر معمولی مسرت ظاہر ہو رہی تھی۔

نقارے پر چوب پڑی۔ مجمع میں ہلچل مچ گئی۔ ہر شخص اچانک اچک کر بالکنی کی طرف دیکھنے لگا۔

پھر چوب داروں کی گرجدار آوازیں سنائی دینے لگیں۔ وہ بادشاہ ظل اللہ عالم پناہ کے جلوہ نما ہونے کا اعلان کر رہے تھے۔ ہر شخص اپنی اپنی جگہ جم کر کھڑا ہو گیا۔ بالکل ساکت۔

بالکنی کے نصف حصہ میں جو پردہ پڑا ہوا تھا اسے حرکت ہوئی پھر دو چوبدار آگے بڑھے۔ انہوں نے پردہ اٹھایا۔

بادشاہ سلامت زندہ باد کے نعرے بلند ہوئے۔ بادشاہ سلامت مسکراتے ہوئے آگے بڑھے۔ بالکنی کے اوپر آکر انہوں نے مسکراتے ہوئے عوام کے اس ہجوم پر نظر ڈالی۔ پھر ہاتھ کے اشارے سے سب کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ سب لوگ اپنی اپنی جگہ ساکت و جامد حالت میں کھڑے ہو گئے۔

بادشاہ سلامت مجمع سے مخاطب تھے۔

میری عزیز رعایا۔

ولیعہد کی پیدائش کے مبارک موقع پر میں آپ کو اور اس خوش نصیب ملک کو مبارک باد دیتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ میرا بچہ میرے عظیم خاندان کا نام روشن کرے گا۔ میرا خاندان ایک عظیم خاندان ہے۔ میرے خاندان نے ماضی میں متعدد ذی قدر اور عالی مرتبت حکمران پیدا کئے ہیں۔ میرا بچہ ماضی کی عظیم روایات کا علمبردار ہوگا۔ اور اپنے بزرگوں کے نقش قدم پر چل کر خاندان کی صدیوں پرانی روایات کی آبیاری کرے گا۔ اس بچہ سے اب اس ملک کا مستقبل وابستہ ہے۔ اس لئے اے میری عزیز رعایا جاؤ۔ اور مسرت بھرے گیت گاؤ۔

بادشاہ سلامت واپس چلے گئے اور عوام خوشی کے نعرے بلند کرتے اور مسرت بھرے گیت گاتے ہوئے واپس ہوئے۔ بڑی دیر تک محل والوں کے کانوں میں ان کے مسرت بھرے گیتوں کی آواز آتی رہی۔ وہ اس نئے آمر کا استقبال کر رہے تھے۔ جو آگے چل کر ان کی گردن پر رکھے ہوئے جوئے کی نگرانی کرے گا۔ جو اس کے بوجھ کو اور زیادہ کر دے گا۔ کیونکہ وہ شاندار ماضی کی شاندار روایات کا علمبردار ہوگا۔ وہ کمزوروں پر زیادہ سختی کرے گا۔ ان کی کمزوری سے ناجائز فائدہ اٹھائے گا۔ ان کی روح کو کچل دے گا۔ اپنے اس شاندار ماضی کا استقبال کرنے کے لئے وہ لوگ مسرت بھرے گیت گا رہے تھے اور نئے حکمران کی صحت کے جام پر جام نوش کر رہے تھے۔

ٹھیک اسی وقت اس شہر میں ایک اور بچہ عالم وجود میں آیا اس وقت جب کہ لوگ ولیعہد کی پیدائش کی خوشی میں گیت گا رہے تھے اور آسمان پر فرشتے ان کی کم عقلی کا ماتم کر رہے تھے۔ ایک پرانے ویران کھنڈر میں ایک بیمار اور نحیف و نزار عورت انتہائی مایوسی کے عالم میں اپنے ننھے منے بچہ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جس نے اس دنیا میں ابھی چند ہی سانسیں لی تھیں۔ یہ عورت سخت بیمار تھی اور کئی دن سے بھوکی تھی۔

دنیا اسے نظرانداز کر چکی تھی۔ سب اسے بھول گئے تھے۔ بادشاہ نے ابھی کچھ دن پہلے کسی ملک پر حملہ کیا تھا۔ اس عورت کے شوہر کو بھی جنگ میں شریک کیا گیا تھا اور ایک اجنبی دشمن کی تلوار نے اس کا پیارا شوہر ہمیشہ کے لئے اس سے جدا کر دیا۔۔۔۔۔ اب وہ تنہا تھی۔ دنیا اسے بھول چکی تھی۔ اس لئے قدرت نے اسے ایک ننھا منا سا ساتھی دے دیا تھا۔ تاکہ یہ بچہ اسے روٹی کے لئے کام کرنے سے بھی چند دن کے لئے روک دے۔

جب ہجوم کے گانے کی آوازیں آنی بند ہو گئیں۔ بدنصیب عورت نے بچہ کو اپنے کمزور بازوؤں پر اٹھا لیا۔ اس کے چہرہ کو دیکھنے لگی۔ پھر ایک دم رونے لگی۔ جیسے وہ اپنے آنسوؤں سے دھو کر بچہ کو پاک صاف کرنا چاہتی ہو۔ پھر بھوک کی وجہ سے مردہ آواز میں وہ بچے سے مخاطب ہوئی۔

"تو اپنا آسمانی گھر چھوڑ کر میری بد نصیبی میں شریک ہونے کے لئے کیوں آگیا۔ تو نے مقدس ماحول کو ترک کر دیا۔ تو فرشتوں کا ساتھ چھوڑ کر انسانوں کی ایک مصیبت زدہ زمین پر کیوں آگیا۔ اس زمین پر جہاں تکلیف ہے مصیبت ہے درد ہے ظلم ہے۔ جہاں کوئی کسی پر رحم نہیں کرتا۔ جہاں سب لوگ خود غرض اور بے رحم ہیں۔ میں آنسوؤں کے سوا تجھے کچھ نہیں دے سکتی۔ کیا دودھ کی بجائے آنسوؤں سے تیری پرورش ہو سکے گی۔ میرے پاس تجھے پہنانے کے لئے کپڑے نہیں۔ کیا میرے ننگے اور سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے بازو تجھے گرمی پہنچا سکیں گے؟

ننھے ننھے جانور دن بھر میدانوں میں چرتے ہیں اور رات کو اپنے تھان پر مزے کی نیند سو جاتے ہیں۔ ننھی ننھی چڑیاں دن بھر دانے چگتی ہیں۔ اور رات کو درختوں کی شاخوں میں اطمینان سے بسیرا لیتی ہیں۔ لیکن میرے لال میرے جگر کے ٹکڑے بتا۔ میرے پاس تیرے لئے کیا ہے۔ اس ننگے سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے بیمار اور کمزور جسم کے سوا۔"

پھر اچانک اس نے اپنے بچے کو اپنے خشک اور پچکے ہوئے سینہ سے چمٹا لیا۔ اور اس طرح بھینچنے لگی۔ جیسے کہ وہ اپنے اور اس کے جسم کو بالکل اس طرح ایک کر دینا چاہتی ہو۔ جس طرح وہ اب سے تھوڑی دیر پہلے تھے۔

پھر اس نے اپنی بخار سے جلتی ہوئی آنکھیں کھولیں آسمان کی طرف دیکھا اور بڑبڑائی۔

"میرے مالک میرے بدنصیب ملک پر رحم کرو۔"

فوراً ہی گہرے سیاہ بادل چاند کے چہرہ سے ہٹ گئے۔ چاند کی کرنیں اس کھنڈر پر بھی پڑنے لگیں۔ جہاں دو لاشیں ایک دوسرے سے چمٹی پڑی تھیں۔

علم و عقل

جب عقل تمہیں اپنی طرف پکارے تو اس کی بات دھیان سے سنو۔ اس کی باتیں سن کر اپنے آپ کو پوری طرح مسلح کر لو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے عقل سے بڑھ کر کوئی رہنما پیدا نہیں کیا اور نہ عقل سے بڑھ کر کوئی زیادہ موثر ہتھیار ہے جس وقت عقل تمہارے دل کی گہرائیوں سے ہمکلام ہوتی ہے تو وہ تمہیں حرص و آز سے بچا لیتی ہے۔ عقل ایک نہایت ہی خوش فکر واعظ ہے ایک باوفا رہبر ہے اور ایک دانشور وکیل ہے عقل تاریکی میں قندیل بن کر نور افشاں ہوتی ہے۔ غم و غصہ تاریکی پھیلاتا ہے۔ اس لئے ہوش سے کام لو اور جذبات کی بجائے ہمیشہ عقل کو چراغ راہ بناؤ۔

لیکن ایک بات نہایت ضروری ہے۔ عقل کے ساتھ علم کا ہونا لازمی امر ہے کیونکہ عقل علم کی مدد کے بغیر کچھ نہیں کر سکتی۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ عقل، علم کے بغیر بالکل ویسی ہے جیسے کوئی مفلس بے گھر پھر رہا ہو اور اسی طرح علم، عقل کے بغیر ایسا ہے جیسے ایک مکان ہو لیکن اس کا کوئی محافظ نہ ہو۔ یہاں تک کہ اگر عقل دستگیری کے لئے مستعد نہ ہو تو محبت انصاف اور نیکی جیسی ارفع اور برتر چیزیں بھی بیکار ہو کر رہ جاتی ہیں۔

عقل کے بغیر ایک عالم و فاضل کی حیثیت بالکل اس سپاہی کی سی ہے جو ہتھیاروں کے بغیر میدان جنگ کی طرف چل کھڑا ہو۔ ایسا سپاہی میدان جنگ میں کچھ نہ کر سکے گا اور اس کا غم و غصہ قوم و ملت کی زندگی کو اس طرح تلخ کر دے گا جس طرح ایلوے کا ایک دانہ صاف و پاکیزہ پانی کے گھڑے کو کڑوا بنا دیتا ہے۔

عقل اور علم جسم اور جان کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جسم کے بغیر روح ایک بے جان ہوا ہے اور روح کے بغیر جسم مٹی کے پتلے کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

عقل، علم کے بغیر ناقابل کاشت کھیت کی مانند ہے اور اس انسانی جسم کی طرح ہے

جسے نشوونما کی ضرورت ہو۔

عقل مال تجارت کی طرح منڈی میں خرید و فروخت نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ مال تجارت کا تو یہ حشر ہو گا کہ جتنی اس کی فراوانی ہو گی اسی لحاظ سے اس کی قیمت گھٹتی جائے گی۔ لیکن اس کے برعکس عقل جتنی وافر ہو گی اتنی ہی اس کی قدرو قیمت بڑھتی جائے گی۔ لیکن عقل مال تجارت کی طرح بکنا شروع ہو بھی جائے تو پھر سوائے دانشوروں اور معاملہ فہم لوگوں کے اور کوئی اس کا خریدار نہ ہو گا۔

ایک بیوقوف اور کم فہم آدمی کو اپنے اردگرد سوائے حماقت کے اور کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ اسی طرح ایک پاگل سوائے پاگل پن کے اور کچھ نہیں دیکھ سکتا۔ کل کا واقعہ ہے میں نے ایک بے وقوف کو کہا کہ اپنے گردوپیش بیوقوفوں کا شمار کرو۔ وہ ہنس کر کہنے لگا۔

"یہ کام بہت دشوار سا ہے۔ بیوقوفوں کے شمار میں بہت وقت لگے گا۔ اس سے کہیں بہتر ہو گا کہ عقلمندوں کو گن لیا جائے۔"

اگر تم اپنی قدرو قیمت کو سمجھ سکو تو تم کبھی فنا نہ ہو گے۔ عقل تمہاری روشنی ہے یہ تمہارے لئے سچائی کے بلند اور محکم مینار کی حیثیت رکھتی ہے۔ عقل تمہاری زندگی کا منبع ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمہیں عقل و خرد بخشی ہے تاکہ اس عظیم انعام کی وجہ سے تشکر و امتنان کے اظہار کے لیے نہ صرف تم اس ذات بے ہمتا کے حضور میں اپنا سر جھکاؤ بلکہ اس روشنی میں اپنی کمزوریوں اور لامحدود قوتوں کا ادراک بھی کر سکو۔

اگر اپنی آنکھوں میں تم تنکا دیکھنا پسند نہیں کرتے تو ایسے ہی جذبات کا اظہار اپنے ہمسائے کے لیے بھی ہونا چاہیے۔

اپنے اعمال و کردار پر اپنے حریف کے نقطہ نظر سے نکتہ چینی کرو۔ کیونکہ جب تک تم اپنی آرزوؤں' خواہشوں اور اپنے ضمیر کی آوازوں پر محتسب بن کر نہ بیٹھو گے تم اپنے آپ کو صحیح حدود میں پابند نہ رکھ سکو گے۔

ایک دفعہ ایک دانشور سے میں نے ایک پرحکمت بات سنی تھی۔ اس نے کہا تھا۔

"دنیا میں سوائے حماقت کے ہر روگ قابل علاج ہے کسی بے وقوف کو نصیحت کرنا اور کسی احمق کو وعظ کہنا اتنا ہی بیکار اور بے فائدہ ہے جتنا سطح آب پر کچھ رقم کرنے کی کوشش کرنا۔ حضرت عیسیٰ اندھوں' زخمیوں اور جذامیوں کا علاج کرتے تھے۔ لیکن بے

وقوفی اور حماقت کا علاج ان کے پاس کوئی نہ تھا۔"

جب کوئی مسئلہ حل طلب ہو تو اس معاملے کے ہر پہلو پر غور کر لیا کرو۔ پھر تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ اس میں کون سی غلطی ہے اور وہ غلطی کب اور کہاں سے شروع ہوتی ہے۔

جب گھر کا شاندار پھاٹک کشادہ ہو تو اس امر کا خیال بھی رکھو کہ اس کے بغلی دروازے بھی تنگ نہ ہوں۔

جس وقت زندگی میں کوئی مفید اور کارآمد موقع آئے تو اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرو۔ کیونکہ جو شخص ایسے موقع سے فائدہ نہیں اٹھاتا اس کی مثال ایسی ہے کہ وہ موقع کو اپنے سامنے ضرور دیکھتا ہے لیکن اس کے استقبال کے لئے آگے قدم نہیں بڑھاتا۔

اللہ تعالیٰ کی طرف کوئی برائی منسوب نہیں ہو سکتی۔ اس نے ہمیں عقل و خرد اور علم و فضل سے مسلح کر دیا ہے تاکہ ہم زندگی کی راہوں میں غلط کاریوں اور تباہیوں کے گڑھوں سے بچ کر چلیں۔

یقیناً وہ لوگ خوش نصیب ہیں جن پر اس ذات باری تعالیٰ نے علم و فضل کی بارشیں کی ہیں۔

امید اور جوانی

جوانی نے مجھے آواز دے کر اپنی طرف بلایا اور میں اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ چلتے چلتے ہم دور ایک کھیت میں پہنچ گئے۔ وہاں آ کر وہ رک گئی۔ اور دور افق پر بھیڑوں کے گلے کی طرح پھیلے ہوئے سفید بادلوں کی طرف تکنے لگی۔ پھر اس نے برہنہ درختوں کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا جو آسمان کی طرف ہاتھ پھیلائے اپنی چھنی ہوئی پوشاکوں کے لئے دعا مانگ رہے تھے۔

"اے جوانی ہم کہاں جا رہے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

جوانی نے جواب دیا۔ "ذرا ہوش سے قدم اٹھاؤ۔ ہم اس وقت حیرت کی وادی میں ہیں۔"

میں نے کہا۔ "چلو واپس لوٹ چلیں۔ مجھے اس ویرانے سے ڈر لگتا ہے بادلوں اور برہنہ درختوں کا منظر مجھے افسردہ کئے جاتا ہے۔"

اور اس نے کہا۔ "ذرا صبر سے کام لو۔ علم کی ابتدا ہمیشہ حیرت سے ہی ہوتی ہے۔"

پھر میں نے اردگرد نظر دوڑائی تو مجھے ایک خوبصورت چیز اپنی طرف بڑھتی ہوئی دکھائی دی۔ میں نے پوچھا۔ "یہ عورت کون ہے؟"

جوانی نے کہا۔ "یہ تمہیں زمین اور اس کے رنج و غم سے روشناس کرانے آئی ہے۔ کیونکہ جس شخص نے رنج و غم کی تلخیوں کو چکھ کر نہیں دیکھا وہ جام مسرت کی سرشاری سے کیا لطف اٹھا سکے گا؟"

پھر اس عورت نے میری آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیا اور جب اس نے ہاتھ اٹھایا تو جوانی وہاں سے رخصت ہو چکی تھی۔ میں وہاں اکیلا کھڑا تھا۔ میں مادی لباس سے محروم ہو چکا تھا۔ میں چلانے لگا۔ "اے زمیں کی دختر جوانی کہاں چلی گئی؟"

فلپامین نے کوئی جواب نہ دیا۔ لیکن اپنے پروں پر بٹھا کر وہ مجھے ایک اونچے پہاڑ کی

چوٹی پر لے گئے۔ میں نے وہاں بیٹھ کر دنیا اور اس کے سارے سامان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا۔ دنیا کی ساری کائنات کتاب کے صفحات کی طرح میرے سامنے پھیلی ہوئی تھی۔ اس کتاب میں جملہ اسرار لکھے ہوئے تھے۔ میں اس دوشیزہ کے پاس حیرت زدہ کھڑا تھا اور انسان اور اس کی زندگی کے رموز کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

میں نے نہایت رنج دہ واقعات کا مشاہدہ کیا۔ میں نے دیکھا کہ خوشی و مسرت کے فرشتے مصیبتوں اور صعوبتوں کے شیطانوں سے جنگ آزما ہیں اور انسان بیم و رجا کے عالم میں ان دونوں قوتوں کے درمیان حیرت زدہ کھڑا ہے۔

پھر میں نے محبت اور نفرت کو انسان سے دل لگی کرتے بھی دیکھا۔ محبت آدمی کی ہوس گناہ کو چھپانے کی کوشش کر رہی تھی اور اسے اطاعت اور مدح اور چاپلوسی کی شراب پلا رہی تھی۔ ادھر نفرت' سچائی اور حقیقت کے خلاف آنکھیں اور کان بند کرنے کے لئے ابھار رہی تھی۔

پھر میں نے دیکھا کہ شہر ابن آدم کے کپڑے پھاڑ کر اس کو برہنہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس اثناء میں میں نے دو خوبصورت کھیتوں کو دیکھا جو انسان کے رنج و محن پر آنسو بہا رہے تھے۔

میں نے مذہبی پیشواؤں کو چالاک گیدڑوں کی طرح منہ پر جھاگ پھیلائے دیکھا اور جھوٹے لیڈروں کو انسانی مسرتوں کے خلاف سازشیں کرتے دیکھا۔

پھر میں نے دیکھا کہ انسان گلا پھاڑ پھاڑ کر دانائی کو آوازیں دے رہا ہے کہ وہ آ کر ان بلاؤں سے اسے نجات دلائے۔ لیکن دانائی نے اس کی پکار سنی ان سنی کر دی۔ اس نے کوئی دھیان نہ دیا۔ کیونکہ اس سے پہلے جب دانائی نے شہر کی گلیوں میں اسے آواز دی تھی اور اس کے ساتھ ہمکلامی کی کوشش کی تھی تو اس نے ذرا توجہ نہ کی تھی۔

پھر میں نے حرص و آز میں مبتلا ان واعظین کو بھی دیکھا جو کمال عجز و انکسار سے آسمان کی طرف رحمتوں کے لئے ہاتھ پھیلا رہے تھے۔

پھر میں نے ایک نوجوان کو دیکھا جو خوش کلامی سے ایک دوشیزہ کا دل جیتنے میں مصروف تھا۔ لیکن ان دونوں کے جذبات محو خواب تھے۔ ان کے دل الوہیت سے کوسوں دور تھے۔

پھر میں نے قانون سازوں کو لمبی لمبی بیکار تقریریں کرتے سنا یہ سب اپنی مصنوعات کو دھوکا اور تملق کی منڈیوں میں فروخت کرنے کے آرزو مند تھے۔

اسی اجتماع میں میں نے ان معالجوں کو دیکھا جو سادہ لوح لوگوں کے جسم و جان سے کھیل رہے تھے پھر میں نے داناؤں کی محفل میں احمقوں کو بھی دیکھا۔ جو ماضی کی عظمتوں کے گیت گاتے تھے اور عیش و آرام کی خلعتیں پہنے مستقبل کی عافیت کوشیوں میں مصروف تھے۔

پھر میں نے دیکھا کہ ایک غریب کسان نے فصل بوئی لیکن ایک ظالم شخص اس فصل کو کاٹ کر لے گیا۔ اور تمہارا نام نہاد قانون ہمہ وقت پہرہ دینے میں مصروف رہا۔

میں نے جہالت کے ان چوروں کو بھی دیکھا جو علم کے خزانوں کو تباہ و برباد کرتے تھے۔ لیکن علم و حکمت کے سنتری بے عملی کے نشہ میں بے ہوش پڑے تھے۔

پھر میں نے دو محبت کرنے والوں کو دیکھا۔ عورت مرد کے ہاتھ میں ایسی بنسری ہے جس سے وہ نغمات پیدا کرنے سے قاصر ہے وہ صرف سخت اور درشت آوازیں ہی پیدا کر سکتا ہے۔

پھر میں نے دیکھا کہ علم و دانش کی قوتیں نسلی وقار کے شہر کا محاصرہ کر رہی ہیں لیکن ان قوتوں کی تعداد تھوڑی تھی۔ چنانچہ بہت جلد پسپا ہو گئیں۔

میں نے آزادی کو تن تنہا پھرتے اور پناہ کے لئے دروازوں پر دستک دیتے دیکھا کسی نے اس کی طرف توجہ نہ کی۔ پھر میں نے عیش و عشرت کو بڑی شان و شوکت کے ساتھ ٹہلتے دیکھا۔ عام لوگ اسے آزادی کے نام سے یاد کرتے تھے۔

پھر میں نے یہ بھی دیکھا کہ انسان اپنی بزدلی کو چھپانے کے لئے کئی قسم کی حیلہ جوئیاں کر رہا ہے۔ بزدلی کو صبر کہتا ہے۔ کاہلی کو بردباری اور تحمل کے نام سے یاد کرتا ہے اور خوف و ہراس کو خوش خلقی سے تعبیر کرتا ہے۔

میں نے ناخواندہ مہمانوں کو علم و حکمت کے ساتھ ایک میز پر دیکھا اور گفتگو کے دوران بے پناہ جہالت کا اظہار کرتے دیکھا۔ لیکن علم و حکمت خاموش تھے۔

میں نے فضول خرچوں کے ہاتھ میں سونا دیکھا جس سے وہ بدکاریاں کرتے تھے۔ کنجوس اور بخیل اسی سونے کی بدولت نفرت کا جال پھیلاتے تھے۔ لیکن داناؤں کے ہاتھ

سونے سے خالی تھے۔

جب میں یہ سب کچھ دیکھ چکا تو درد و کرب سے چلا اٹھا میں نے زلیس کی دختر کو آواز دی اور کہا۔

"کیا یہی زمین ہے؟ اور کیا یہی انسانیت کا نمونہ ہے؟"

اس نے آہستہ سے رنج و الم سے معمور آواز میں جواب دیا۔ "جو کچھ تم نے دیکھا ہے وہ روح کا راستہ ہے۔ جو نکیلے پتھروں اور کانٹوں سے پٹا پڑا ہے یہ صرف انسان کا پرتو ہے۔ یہ رات ہے۔ ذرا صبر سے کام لو۔ ابھی سورج طلوع ہو گا۔ صبح ہوا ہی چاہتی ہے۔"

پھر اس نے اپنا نرم و نازک ہاتھ میری آنکھوں پر رکھا اور جب اس نے ہاتھ اٹھا لیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ جوانی آہستہ آہستہ میرے ساتھ محو خرام ہے ہمارے آگے آگے "امید" ہے جو ہمیں راستہ دکھا رہی ہے۔